ارکانِ اسلام

حقیقتِ توحید

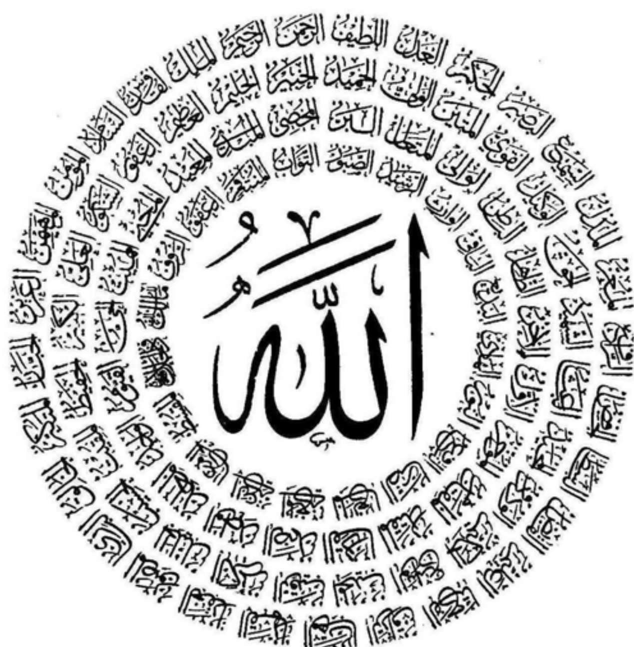
حقیقتِ صلوٰۃ

حقیقتِ صیام

حقیقتِ زکوٰۃ

حقیقتِ حج

مولانا ابوالکلام آزاد


الله

ارکانِ اسلام

مولانا ابو الکلام آزادؒ

مرتبہ: میاں مختار احمد کھٹانہ

مکتبۂ جمال

تیسری منزل، حسن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

E-mail.maktaba_jamal@email.com

نام کتاب : ارکان اسلام
مصنف : مولانا ابوالکلام آزادؒ
مرتب : میاں مختار احمد کھٹانہ
ناشر : مکتبہ جمال، لاہور
اہتمام : میاں شبیر احمد
مطبع : تایا سنز پرنٹرز، لاہور
سن اشاعت : 2006
قیمت : -/200 روپے

ملنے کا پتہ
مکتبہ جمال
تیسری منزل، حسن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور
فون: 7232731
Email maktaba_jamal@email.com
maktabajamal@yahoo.co.uk

عقیدہ توحید

اسلام کی اولین اصل "عقیدہ توحید" ہے۔ اس عقیدہ کے اندر مسلمانوں کی تمام روح حیات مضمر تھی اور اسی روح نے ان کو دائمی زندگی کی خوشخبری سنائی تھی لیکن مسلمانوں نے سب سے زیادہ اسی عقیدہ سے انحراف کیا

نماز

دنیا کے تمام مذاہب میں اسلام کی ایک مابہ الامتیاز خصوصیت یہ ہے کہ اس نے تمام عبادات واعمال کا ایک مقصد متعین کیا اور اس مقصد کو نہایت صراحت کے ساتھ ظاہر کر دیا۔

نماز کے متعلق تصریح کی:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡھٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡکَرِ. (۲۹:۴۵)

"نماز ہر قسم کی بداخلاقیوں سے انسان کو روکتی ہے۔"

روزہ

روزے کے متعلق فرمایا:

لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ. (۲:۱۸۳)

"روزے کے ذریعہ تم پرہیزگار بن جاؤ گے۔"

زکوٰۃ

زکوٰۃ کی نسبت بیان کیا:

خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِھِمۡ صَدَقَۃً تُطَھِّرُ ھُمۡ وَتُزَکِّیۡھِمۡ بِھَا. (۹:۱۰۳)

"ان کے مال و دولت میں سے ایک حصہ بطور صدقہ کے لے لو، کیونکہ تم اس کے ذریعہ ان کو بخل اور حرص وطمع کی بداخلاقیوں سے پاک وصاف کر سکو گے۔"

حج

اسی طرح خداوند تعالیٰ نے حج کے فوائد ومنافع کو بھی نہایت وضاحت کے ساتھ بیان فرمادیا:

لِیَّشۡھَدُوۡا مَنَافِعَ لَھُمۡ وَیَذۡکُرُوا اسۡمَ اللّٰہِ فِیۡۤ اَیَّامٍ مَّعۡلُوۡمَاتٍ. (۲۲:۲۸)

عرض مرتب

مولانا ابوالکلام آزاد کی ذات گرامی آیت من آیات اللہ تھی ۔ اللہ نے آپ کو فہم دین کا وہ ملکہ عطا کیا تھا جو آپ کے معاصرین میں باید و شاید ہو۔ مولانا غلام رسول مہر کے بقول دور حاضر میں وہ اولین داعیٔ حق اور اولین ترجمان قرآن تھے جنہوں نے اپنی بدیع الاسلوب تحریروں اور ایمان افروز تقریروں کے ذریعے سے اس وسیع سرزمین کے کروڑوں سینوں میں حُبِ دین اور عشقِ سلیم کی حرارت بھر دی ۔ جہاں جہاں ان کی دل آویز صدائے حق پہنچی، کتاب وسنت کے لیے ایک ایسی بے پناہ تڑپ پیدا ہوگئی جس کی کوئی مثال اس سے پیشتر کے ماضیٔ قریب میں مل سکتی ہے نہ گذشتہ صدی کی سرگذشت علوم دین سے پیش کی جاسکتی ہے۔ الہلال والبلاغ کی مدتِ حیات سوا تین سال سے زیادہ نہ ہوگی ،مگر اس پائے کا کوئی دینی وعلمی رسالہ پیشتر جاری ہوا اور نہ الہلال کے دوسرے دور کے بعد سے اب تک (۴ پچھتر) برس میں کوئی صاحبِ علم وقلم بروئے کار لا سکا۔

الہلال برعظیم پاک وہند کے مسلمانوں کی مذہبی ، ذہنی اور سیاسی زندگی کا ایک اہم موڑ ہے۔ آپ نے مسلمانوں کو اسلام کی طرف دعوتِ مراجعت کی خاطر اس میں کئی مقالات تحریر کیے۔ ۸ر ستمبر ۱۹۱۲ء کو ایک مقالہ میں لکھتے ہیں:

> اسلام انسان کے لیے ایک جامع اور مکمل قانون لے کر آیا، اور انسانی اعمال کا کوئی مناقشہ ایسا نہیں جس کے لیے وہ حکم نہ ہو۔ وہ اپنی توحیدِ تعلیم میں نہایت غیور ہے، اور کبھی پسند نہیں کرتا کہ اس چوکھٹ پر جھکنے والے کسی دوسرے دروازے کے سائل بنیں۔ مسلمانوں کی اخلاقی زندگی ہو یا علمی ، سیاسی ہو یا معاشرتی ، دینی ہو یا دنیاوی، حاکمانہ ہو یا محکومانہ، وہ ہر زندگی کے لیے ایک اکمل ترین قانون اپنے اندر رکھتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا

تو وہ دنیا کا آخری اور عالمگیر مذہب نہ ہوسکتا۔ وہ خدا کی آواز اور اس کی تعلیم گاہ خدا کا حلقۂ درس ہے۔

مولانا کی علمی زندگی کے پروگراموں کا خاکہ نہایت دلکش اور عظیم الشان تھا لیکن سیاسی زندگی کے ہنگاموں نے بہت سے کام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچنے دیے۔ ہم نے مولانا کی مختلف تحریروں سے توحید، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے بارے میں ''ارکانِ اسلام'' کے نام سے یہ گلدستہ تیار کیا ہے۔ امید ہے انشاء اللہ اس سے تفہیمِ دین کے سلسلے میں بہت مدد ملے گی ۔ اللہ سے دعا ہے کہ حضرت مولانا کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔

آخر میں محترم پروفیسر افضل حق قرشی اور محترم احمد جاوید صاحب کا ازحد ممنون ہوں کہ انکی شفقت اور لحہ بہ لحہ رہنمائی کے طفیل یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ مکتبہ جمال کی یہ خوش نصیبی ہے کہ اسے ان کی شفقت اور ہمہ جہتی تعاون حاصل ہے۔

دوسرا ایڈیشن آپ کے ہاتھوں میں ہے پہلے ایڈیشن میں جو اغلاط رہ گئی تھیں موجودہ ایڈیشن میں انہیں درست کر دیا گیا ہے۔ محترمہ عابدہ چوہدری عابی نے بڑی محنت سے اسکی پروف خوانی کی اور سارے مسودے کو از سرِ نو اصل متن سے ملا کر دیکھا ادارہ انکے اس تعاون کے لیے بے حد ممنون ہے۔

(میاں مختار احمد کھٹانہ)

دیباچہ

مولانا ابوالکلام آزاد برصغیر میں اس علمی روایت کے معدودے چند نمائندوں میں سے تھے جس نے علم کی حقیقت اور اس کے حدود کو اپنی تمام تر گہرائیوں اور وسعتوں کے ساتھ قرآن کے تابع کر کے دکھا دیا۔ مولانا کے ہاں علم محض ایک ذہنی ضرورت نہیں بلکہ وہ وجودی تقاضا ہے جو معلوم کو موجود ہونے کی نظیر ہی نہیں اخلاقی اساس بھی بناتا ہے۔ اگر ذمہ داری سے تجزیہ کیا جائے تو انسان کی تمام مبادیات اپنی اصل میں اخلاقی ہیں، جن کے حصول کا سب سے قابل اعتماد ذریعہ وہ علم ہے جس کی مدد سے انسان ایسے فیصلے کرنے کی صلاحیت حاصل کرتا ہے جو اس کے وجودی کردار کو اس طرح متعین کر دیتے ہیں کہ وقت کا بہاؤ اور معمول کے شعور و احساس میں ناگزیر طور پر واقع ہونے والی تبدیلیاں اس کو متعصب نہیں کرتیں۔ علم و اخلاق کی یہی عینیت اصول ہستی کے غیر متغیر ہونے کی لازمی ضرورت کو پورا کرتی ہے، بصورت دیگر محض علم تغیر کے سیلِ تند پر بند نہیں باندھ سکتا۔ عقل اگر ارادے سے ہم آہنگ نہ ہو تو کوئی شے اپنی جگہ پر برقرار نہیں رہ سکتی۔ آزاد استدلال میں ڈھل جانے کی بجائے اسے خلق کرنے کا نام مسلمانوں میں معقولات کی روایت کا غالب حصہ اس نقطے کو نظر انداز کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے کہ دین میں استدلال کے مقامات اور نتائج عقلی نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس روایت میں وحی اور عقل کا توازن ایک ناقابل تلافی حد تک مجروح ہو چکا ہے۔ عقل کا ماتحت کردار ملحوظ نہ رہنے کی وجہ سے ایمانی مسلمات مبنی بر تعقل ہو کر رہ جاتے ہیں۔

ایسی صورتحال میں دین کا حجت ہونا بہت زیادہ بامعنی نہیں رہتا اور حقائق جو سرمایۂ ایمان ہیں خبر کی جگہ دریافت کا رنگ پیدا کر لیتے ہیں ظاہر ہے یہ بات ہی ایمان کے

پورے نظام علم کے خلاف ہے جہاں معلوم، علم کے تابع نہیں بلکہ علم معلوم کے تابع ہے۔

مولانا آزاد عقل کے فطری کردار کو غالباً اپنے تمام معاصرین سے کہیں زیادہ جانتے تھے۔ دین اور عقل کے بعض مشترک موضوعات پر ان کی تحریریں دیکھی جائیں تو واضح ہو جاتا ہے کہ وہ عقل کی خوئے تسلیم و اثبات کو اس کی دیگر صفات پر غالب کر کے اسے کس طرح وحی کا محکوم بناتے ہیں۔ آپ حقیقتِ توحید وغیرہ میں بالکل صاف طور پر دیکھیں گے کہ مولانا نے جس نظام استدلال کو کام میں لا کر عقل کی تشفی کی ہے وہ قرآن کا فراہم کردہ ہے، عقل کی ایجاد نہیں۔ مولانا اس طرح ہمیں بتاتے ہیں کہ تسلیم کے اصولی مرحلے سے گزر جانے کے بعد عقل کا حقیقی وظیفہ اثباتِ حقائق ہے نہ کہ تحقیقِ حقائق۔ عقل کی نظری امنگ کی تسکین خود عقل کے ہاتھ میں ہوتی تو یہ امنگ ہی کیوں پیدا ہوتی۔ مولانا کے ان مجموعوں کا مطالعہ کرتے وقت یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ ابھی لوگوں نے ان کے تصورِ علم و عقل پر ابتدائی غور بھی نہیں کیا اس لیے یہ امر تا حال مخفی ہے کہ مولانا نے معلوم کو محض ایک نظری تشکیل ہونے سے کس طرح بری کر کے دکھایا ہے۔ کاش کوئی باصلاحیت آدمی اس طرف متوجہ ہو جائے تو ابو الکلام کا یہ فکری کارنامہ سامنے آ سکتا ہے۔ ان کا نظریۂ علم اپنے اصولِ تفصیل میں بہت سی مستقل مشکلات کا خاتمہ کرنے کی قوت رکھتا ہے خصوصاً عقل کے دینی کردار پر انہوں نے جو کلام کیا ہے وہ ہماری تاریخ میں ایک بالکل منفرد اور ممتاز چیز ہے۔

انسان اور انسانی دنیا میں ثبات اور تغیر کے تمام محرکات کا ایک اصول کے تابع ہونا، اور خود اس اصول کا قرآن و سنت سے مستنبط ہونا، مولانا ابوالکلام آزاد کا بنیادی موضوع ہے۔ غور سے دیکھیں تو صاف معلوم ہو گا کہ مولانا کی تمام علمی و عملی سرگرمیاں اسی مرکز کے گرد گھوم رہی ہیں۔ ان کے لیے دین وہ واحد سانچہ ہے جس میں ڈھل کر انسان کے ظاہر و باطن کی حتمی اور فطری تشکیل ہوتی ہے۔ ان کا تصور انسان کسی بھی پیمانے پر تنگ، محدود اور بے لچک نہیں ہے، اور ان تمام انسانی تنوعات کا احاطہ کرتا ہے جو مطالعۂ انسان کے کسی بھی منہاج کا موضوع ہو سکتے ہیں۔ وہ آدمیت کی کسی مروجہ تعبیر سے لڑے بغیر اسے دین کی

بنائی ہوئی انسانی کائنات میں اس طرح کھپا دیتے ہیں کہ ان کا قاری اور کچھ نہ ہوتو کم از کم دین کی اس ہمہ گیری کو محسوس کرنے کے قابل ضرور ہو جاتا ہے جو ہر مزاحمت کو موافقت میں بدل دینے کی قوت رکھتی ہے۔

مولانا کے اس وصف سے بے خبری نے لوگوں کو غلط راستے پر ڈال دیا' خاص طور پر متحدہ قومیت کے مسئلے پر ان کے ناقدین ان کے موقف کی اصولی وسعت کو سمجھنے کی ابتدائی اہلیت بھی نہ رکھتے تھے۔ اس معاملے میں یا اس سے ملتے جلتے دیگر معاملات میں مولانا کا ہر موقف دراصل اسلام کی اس ورائے قانون جہت کی طرف اشارہ کرتا تھا جو آدمی' تاریخ' تہذیب اور دنیا کو ان کی تمام تر نیرنگیوں کے ساتھ اسلام کے بنا کردہ نظام بندگی کا حصہ بنا لیتی ہے۔ اس بحث میں اگرچہ خاصے تفصیلی کام کی ضرورت ہے لیکن سر دست ہمارا موضوع کچھ اور ہے۔ لہٰذا اس سے صرف نظر کرتے ہوئے ہم اس مجموعے میں شامل ایک انتہائی اہم کتاب ''حقیقت الصلوٰۃ'' کے بارے میں کچھ معروضات اس طرح پیش کریں گے کہ ان کا یہ وصف بھی سامنے آ جائے۔ اس کتاب کے بارے میں ہماری باتیں ممکن ہے کچھ طوالت پکڑ لیں لیکن اس کا ایک فائدہ ضرور ہوگا کہ قاری مولانا کے مجموعی تصورِ دین سے ضروری حد تک مانوس اور واقف ہو جائے گا۔ اس کتاب میں مولانا نے ایمان اور عمل صالح کی یکجائی پر اپنے موقف کو جس کمال کے ساتھ بیان کیا ہے اس کی مکمل نظیر ''حقیقت التوحید'' اور کہیں نظر نہیں آتی۔ ''حقیقت التوحید'' میں خدا، کائنات اور فطرت کو موضوع بنایا گیا ہے جبکہ حقیقت الصلوٰۃ میں مرکزی حیثیت انسان کو حاصل ہے۔ خدا، کائنات اور انسان کے بارے میں مولانا کے بنیادی تصورات ان دو کتابوں میں پوری طرح بیان ہو گئے ہیں۔ اس مجموعے کی دیگر کتابیں دراصل انہیں کی تفصیل ہیں۔

مولانا اسلام کا ایک حرکی اور انقلابی تصور رکھتے تھے جس میں قرآن اور نماز کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ دین سے وابستگی کی ہر سطح ان کے نزدیک انہی دو بنیادوں پر استوار ہے۔ قرآن معبودیت کا اظہار ہے اور نماز عبودیت کا' گویا یہ دو قوسیں ہیں جن سے مل کر

دین کا دائرہ مکمل ہوتا ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ قرآن جس کمال بندگی کا متقاضی ہے وہ نماز میں حاصل ہوتا ہے۔ بندگی کی کوئی بھی صورت ہو یہ ممکن نہیں کہ اس کی تکمیل نماز سے باہر کہیں اور ہوتی ہو۔ عقیدہ وعمل کی تمام وسعتوں، بلندیوں اور گہرائیوں کا اگر بندگی کی کسی ایک وضع میں کمال اور جامعیت کے ساتھ اظہار ہوتا ہے تو وہ نماز ہے۔ یہ کتاب اسی دعوے کو جامۂ ثبوت پہناتی ہے۔

اپنی ذہنی ساخت اور افتادِ طبع کے عین مطابق مولانا نے ایک سطحی مذہبی ذہن کی طرح اس کتاب میں بھی اپنے موضوع کی صورت نہیں بلکہ حقیقت کو ہدف بنایا ہے یعنی مسائل صلوٰۃ کی بجائے نماز جس جوہرِ بندگی اور حقیقتِ عبدیّت کا مظہر ہے اس کی طرف اس طرح توجہ کی ہے کہ مسلمان ہونے کا حقیقی مطلب نہ صرف یہ کہ لائقِ فہم ہو جاتا ہے بلکہ حس بندگی اگر زندہ ہوتو ہمارا تجربہ بن جاتا ہے۔ مضمون کی گہرائی اور بیان کا شکوہ مولانا آزاد کی تحریروں کا عمومی وصف ہے، ان کی یکجائی سے وہ بڑے بڑے کام لیتے ہیں جیسے اس کتاب میں انہوں نے نماز کی حقیقت تک پہنچ کر اسے جس بے مثال اسلوب میں بیان کیا ہے، وہ قاری کو محض فہم کی سطح تک نہیں رہنے دیتی بلکہ ایک روحانی تجربے سے بھی گزارتی ہے۔ یہ بات اعتماد سے کہی جاسکتی ہے کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد آدمی کی نماز وہ نہیں رہتی جو پہلے تھی۔ سچ پوچھیں تو کسی دینی تحریر کا منتہا یہی ہے کہ وہ مفہوم کو حال بنا دے۔

''حقیقۃ الصلوٰۃ'' میں مولانا کا مقدمہ یہ ہے کہ انسان کے اجتماعی اور انفرادی کمال کا مبداء اور منتہاء ایک ہی ہے جو بندگی کی حقیقتِ واحدہ اور ہیئتِ جامعہ سے عینیت کی نسبت رکھتی ہے اور اس کا یکہ وتنہا مظہر بھی ہے۔ اسی میں بندے کا حقیقی کردار اپنی تمام اجزائی تفصیل سمیت مندرج ہے اور کمالِ بندگی کے حصول کی ہر کوشش اسی سے شروع ہو کر اسی پر تمام ہوتی ہے۔ چونکہ عبودیت محض امر ذہنی نہیں ہے، اس کی تشکیل میں عمل کو غلبہ حاصل ہے۔ لہٰذا اصل بندگی کو ایک صورت کا بھی حامل ہونا چاہیے جو اس کے معانی کا ظرف بننے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ مولانا کے نزدیک نماز ہی وہ عمل ہے جو اپنے ظاہر و باطن

کے حوالے سے ان تمام تقاضوں پر پورا اترتی ہے یعنی از رُوئے حقیقت نماز جوہرِ عبدیّت ہے اور از رُوئے صورت بندگی کی ہیئتِ واحدہ۔

نماز کی حقیقت پر مولانا سے پہلے بھی بہت کچھ لکھا گیا اور بعد میں بھی بہت کچھ لکھا جاتا رہا لیکن اس کتاب کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں مدار کلام قرآن کو بنایا گیا ہے اور وہ بھی دُور از کار تاویلات کے بغیر۔ صوفیانہ واردات اور عارفانہ تخلیات سے دامن بچا کر حقیقت صلوٰۃ پر گفتگو کرنا' جاننے والے جانتے ہیں کہ تقریباً ناممکن ہوا کرتا ہے لیکن مولانا نے اسے ممکن کر دکھایا۔ قاری ابھی کتاب کے ابتدائی صفحات پر ہی ہوتا ہے کہ اسے یہ خوشگوار تاثر ملنا شروع ہو جاتا ہے کہ مولانا نے اسلام کے سب سے بڑے عمل کی حقیقت کو اس طرح چھیڑا ہے کہ فہم سلیم اور ذوق صحیح ایک ہو کر اللہ تعالیٰ اور بندے کے تعلق کی سچی معرفت کو اس طرز احساس میں ڈھال دیتے ہیں جو کسی بھی درجے میں قرآن وسنّت سے مغائرت نہیں رکھتا اور ان تمام تصورات سے یکسر پاک ہے جن کے بیرونی پن کو کسی بھی طرح زائل نہیں کیا جا سکتا۔

مولانا دینی احکام کی تعمیل اور اعمال کی ادائیگی کو ان متعین نتائج سے مشروط کرتے ہیں جن کا ظہور آدمی کے اندر بھی ہوتا ہے اور باہر بھی' انفرادی سطح پر بھی ہوتا ہے اور اجتماعی سطح پر بھی۔ کسی بھی دینی موضوع پر کلام کرتے ہوئے یہ بات ہمیشہ ان کے پیش نظر رہتی ہے کہ دین کی اخلاقی اور انقلابی قوت اور اس کی کارفرمائی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی وہ صورتحال ضرور سامنے آ جائے جس سے انسان کی کلیّت کی صُورت گری ہوتی ہے۔ غیر مربوط مقاصد اور نتائج ان کی نظر میں اس عقیدۂ توحید کے منافی ہیں جو دین کا اصل اصول ہے اور اپنی ایک جہت میں وحدت انسانی پر بھی ہے اور نماز اس کا اعلیٰ ترین مظہر ہے۔ لہٰذا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ نماز ان نتائج تک نہ پہنچائے جو بندگی کے تمام مراتب کا احاطہ نہ کرتے ہوں۔

بندگی کیا ہے، اللہ سے تعلق کا شعور اور اس پر عمل .... تعلق باللہ کا شعور اخلاق

پیدا کرتا ہے اور اس کی تعمیل سے انقلاب کی تخلیق ہوتی ہے۔ یہ ہے مولانا کی پوری فکر کا خلاصہ جو اس کتاب میں بھی نمایاں ہے۔ اس کی مثال میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ نماز سے دو مقاصد لازماً حاصل ہوتے ہیں یا ہونے چاہئیں: حصول فضائل اور دفع رذائل حصول فضائل کا تعلق اخلاق سے ہے اور دفع رذائل کا انقلاب سے۔ فضائل نفس روحانی کو ترقی دیتے ہیں جبکہ ازالہ رذائل سے نفس کی مجموعی فضا منقلب ہو جاتی ہے یہ کلیہ جس طرح باطن پر صادق آتا ہے اسی طرح باہر کی صورتحال کو بھی محیط ہے۔ فضائل کی جستجو آدمی پر لازم کرتی ہے کہ وہ اپنے اردگرد کو اس کے ممکنہ پھیلاؤ کے ساتھ مدار خیر پر رکھے اور رذائل سے بچنے کی کوشش میں آدمی مجبور ہے کہ باہر کی دنیا کو بھی اسی طرح بدلنے کی کوشش کرے جس طرح اندر کی دنیا کو تبدیل کرنے کے لیے کی جاتی ہے۔

گویا اخلاق کا کمال یہ ہے کہ انسان کے اندر اور کائنات میں جو خیر موجود ہے اسے باقی رکھا جائے اور اس کی بنیاد پر انسان و کائنات میں موجود فطری ہم آہنگی کے نئے نئے امکانات بروئے کار لائے جائیں تاکہ حق اور خیر کسی خاص اور بے لچک تناظر میں محدود رہنے کی وجہ سے بے کشش، فرسودہ اور جامد ہو کر نہ رہ جائیں اور انسان دنیا میں رہنے کے تقاضے پورے کرنے کے لیے اپنی خوئے بندگی کو نظر انداز کرنے پر مجبور نہ ہو۔ دوسری طرف انقلاب کی حقیقت یہ ہے کہ انسان اور کائنات میں بگاڑ کی جو صورتیں پیدا ہو گئی ہیں انہیں یکساں اہمیت دے کر ایک ہی قوت اور ایک ہی مقصد کے ذریعے سے دور کرنے کی کوشش کی جائے یعنی انسانی اور کائناتی بگاڑ اپنی ماہیت میں ایک ہے لہٰذا اس کا علاج بھی ایک ہوگا۔ جو چیز آدمی کو ٹھیک کر سکتی ہے دنیا بھی اسی سے ٹھیک ہوگی .... مولانا جب نظمِ اجتماعی پر زور دیتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ انسانوں کی انفرادی ضروریات کو اہمیت نہیں دیتے بلکہ اس سے ان کا مقصود یہ ہے کہ اصول بندگی کا اطلاق اجتماعی سطح پر ہی مکمل ہوتا ہے اس کے بغیر بندگی کے انفرادی امور کوئی معنی نہیں رکھتے۔ دین میں انفرادی کمالات کا کوئی ایسا تصور موجود نہیں ہے جس کی رو سے فرد اور معاشرہ دو

لخت ہو جائیں اور دین محض چند انفرادی نمونوں تک محدود ہو کر رہ جائے۔ دین سے منحرف معاشروں میں دیندار افراد کی موجودگی دراصل ان افراد کے کمال پر نہیں بلکہ ناکامی پر دلالت کرتی ہے۔ اسی طرح وہ معاشرہ احکام الٰہیہ پر چلنے کی ضروری استعداد بھی گنوا بیٹھتا ہے جہاں فرد بے اثر ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس صورتحال کو تبدیل کرنے کا اگر کوئی حتمی موثر ذریعہ ہو سکتا ہے تو وہ تمسک بالقرآن اور قیامِ صلوٰۃ ہے۔ جن حضرات نے ترجمان القرآن دیکھ رکھی ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ مولانا ابو الکلام آزادؒ کی انقلابی فکر انہی دو بنیادوں پر قائم ہے۔

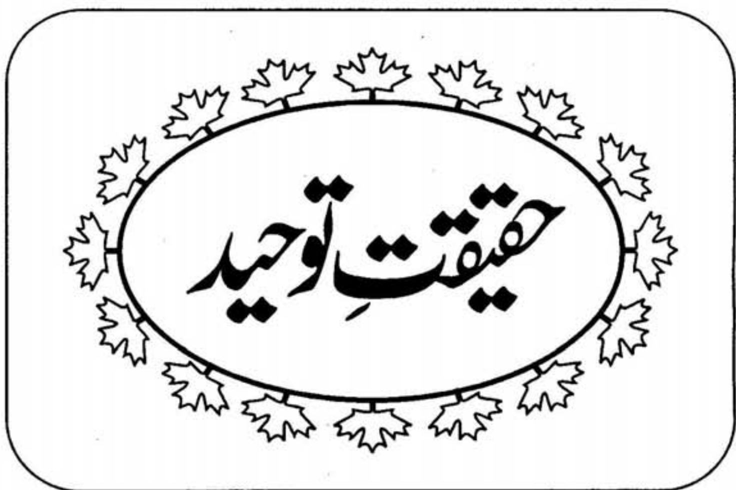
''حقیقۃ الصلوٰۃ'' میں مولانا نے ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے اور وہ یہ کہ نماز کو غالی صوفیوں اور متشدّد فقیہوں کی گرفت سے کُلیۃً نکال کر دکھا دیا ہے۔ ان دو طبقات میں سے ایک نے نماز کی حقیقت پر اجارہ داری قائم کر رکھی تھی اور دوسرے نے اس کی صورت پر قبضہ جما رکھا تھا اور دونوں جس سند پر کھڑے تھے افسوس کہ وہ قرآن وسنت کی فراہم کردہ نہیں تھی۔ مولانا آزاد نے اس پوری روایت کو توڑ کر رکھ دیا اور نماز کی حقیقت ہو یا صورت دونوں کی اساس قرآن وسنت اور ان سے پیدا ہونے والی فطرت بندگی پر رکھ کر دکھا دیا۔ سچ پوچھیں تو یہ کام ابن تیمیہ اور ابن قیم ایسے آئمہ کی یاد دلا دیتا ہے اور کم از کم برصغیر کی حد تک اپنی کوئی مثل نہیں رکھتا۔

''حقیقت التوحید'' اور ''حقیقت الصلوٰۃ'' پر ہماری توجہ مرتکز رہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بقیہ رسائل کی اہمیت ثانوی اور اضافی ہے ہر رسالہ اپنے اندر ندرت و امتیاز کے ٹھوس دلائل رکھتا ہے مثلاً ''حقیقت الزکوٰۃ'' میں اسلامی ریاست کا جو تصور پیش کیا گیا ہے، ہماری مذہبی سیاسی فکر اس سے تقریباً ناآشنا چلی آ رہی ہے اسی طرح زکوٰۃ کی قانونی ہیئت پر بھی عام اسلوب سے ہٹ کر مجتہدانہ انداز سے گفتگو کی گئی ہے۔ اسی طرح ''حقیقت الحج'' بھی حج کے موضوع پر لکھے جانے والے سارے لٹریچر سے نہ صرف یہ کہ منفرد ہے بلکہ اس میں حج کے عمل کو جس عظیم روحانی تناظر میں رکھ کر دیکھا گیا ہے۔ وہ انسان کی

استعداد بندگی اور مدارِ وابستگی کو گویا تصویر کر دیتا ہے۔ غرض مولانا کسی بھی مسئلے پر کلام کرتے ہوئے انسان اور اس کی کلیّت کو اس میں داخل کر دیتے ہیں۔ ان کا سارا کام اسی وجہ سے اپنے کسی جز میں بھی غیر متعلق اور بھرتی کا نہیں لگتا وہ مسائل کی سمجھ ہی نہیں پیدا کرتے بلکہ ان کا تجربہ کروا دیتے ہیں۔ یہ کمال ان کے بعد اگر کسی اور کو نصیب ہوا ہو تو کم از کم میں اس سے بالکل بے خبر ہوں۔

احمد جاوید

اقبال اکادمی پاکستان، لاہور


حقیقتِ توحید

اسلام کی اولین اصل ''عقیدہ توحید'' ہے۔اس عقیدہ کے اندر مسلمانوں کی تمام روح حیات مضمر تھی اور اسی روح نے ان کو دائمی زندگی کی خوشخبری سنائی تھی لیکن مسلمانوں نے سب سے زیادہ اسی عقیدہ سے انحراف کیا۔حتیٰ کہ آج اس سے بڑھ کر اور کسی اعتقاد میں وہ تجدید دعوت کے محتاج نہیں ہیں۔جس طرح عقیدہ توحید کے معنی یہ نہ تھے کہ مشرکین مکہ کی طرح زبان سے تو ایک صانع کل کا اقرار کر دیا جائے (لیقولن اللہ) لیکن اپنی عملی زندگی پر صدہا غیر الٰہی عبودتیوں کی لعنت بھی طاری کر لی جائے اسی طرح توحید کی حقیقت کے ساتھ یہ ضلالت بھی جمع نہیں ہو سکتی تھی کہ ایک فاطر السموات والارض کی بندگی کا دعویٰ کر کے بہت سے خداؤں کے ماننے والوں کی طرح بہت سی جماعتوں اور شکلوں میں متفرق ہو جائیں۔اعتقاد توحید کا اولین مطالبہ یہ تھا کہ تمام کرہ ارضی کی سعادت وہدایت کے لیے ایک ایسی امت عادلہ تیار ہو جو تمام پچھلی قوموں کے برخلاف اپنے تمام عقائد واعمال کے اندر جلوۂ توحید رکھے،اس کا خدا ایک ہو اس کا مبدۂ حکم وسلطانی ایک ہو۔اس کا مصدر امر ونہی ایک ہو۔اس کا قبلہ ایک ہو اس کا نام ایک ہو اس کے خصائص واعمال ایک ہوں یعنی جس طرح اس کا خدا وحدہ لاشریک ہو اسی طرح اس کا قرآن بھی اپنی ہدایت میں،اس کا رسول بھی اپنی تعلیم کتاب وحکمت میں اور اس کی امت بھی اپنے خصائص ومحامد اور وحدت ویگانگت میں وحدہ لاشریک ہو۔ان ھٰذہٖ اُمتکم امۃً واحدۃً وانا ربُکم فاتقون.

قوم وملت کی بقا کے لیے ہر طرح کے دائرے اور ہر طرح کے مرکز قرار دیئے۔

فہرست (حقیقت توحید)

خدا کا تصور

صفاتِ الٰہیہ

خدا کا تصور ہمیشہ انسان کی روحانی و اخلاقی زندگی کا محور رہا ہے۔ صفاتِ الٰہی کا مسئلہ ایک نہایت دقیق اور پیچیدہ مسئلہ ہے۔ اس کے بحث ونظر کی سرحد ایک طرف مابعدالطبیعات Metaphysics سے جا ملی ہے، دوسری طرف مذہب سے اور دونوں نے یکساں طور پر اسے اپنے حلقۂ فکر کا موضوع تصور کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علم ونظر کے ہر دور میں علمائے مذاہب سے زیادہ فلسفیوں کی کاوشوں نے اس میں حصہ لیا اور ہندوستان، یونان، سکندریہ اور قرونِ وسطیٰ کے فلسفیانہ مباحث کا ایک بڑا ذخیرہ فراہم ہو گیا۔ مسلمانوں میں جب علم توحید کی کلامی بحثوں نے سر اٹھایا تو اسی مسئلے میں سب سے زیادہ رَدّ و کد ہوئی اور مختلف مذاہب پیدا ہو گئے۔ اصحابِ حدیث اور اشاعرہ کا سب سے بڑا اختلاف اسی دروازے سے آیا تھا۔

یہ مسئلہ بھی منجملہ ان مسئلوں کے ہے جو طالب علمی کے زمانے میں میرے لیے سخت شکوک وخلجان کا باعث ہوئے تھے اور مدتوں حیران و سرگشتہ رہا تھا۔ بالآخر جب حقیقت حال منکشف ہوئی تو معلوم ہوا کہ متکلمین کی راہ نمائی اس راہ میں کچھ سود مند نہیں ہو سکتی۔ بلکہ منزل مقصود سے اور زیادہ دور کر دیتی ہے یقین وطمانیت کی اگر راہ ہے تو وہی ہے جو ظواہر قرآن نے اختیار کی ہے اور جس سے متبعین سلف منحرف ہونا پسند نہیں کرتے تھے۔

چنداں کہ دست و پا زَدم آشفتہ تر شدم
ساکن شدم میانہ کہ دریا کنار شد

اس جستجو وطلب نے بالآخر جن نتائج تک پہنچایا تھا وہ بالاختصار واضح کر دیے گئے ہیں۔ انسان کے لیے معرفت حق کی راہ کیا ہے؟ قرآن کہتا ہے صرف ایک ہی راہ ہے اور وہ یہ ہے کہ کائنات خلقت میں تفکّر وتدّبر کرے۔ مصنوعات کا مطالعہ اسے صانع تک پہنچا

دے گا۔ اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۳:۱۹۱) اب فرض کرو ایک طالب صادق اس راہ میں قدم اٹھاتا ہے اور کائنات خلقت کے مظاہر و آثار کا مطالعہ کرتا ہے تو سب سے پہلا اثر جو اس کے دل و دماغ پر طاری ہوگا وہ کیا ہوگا؟ وہ دیکھے گا کہ خود اس کا وجود اور اس کے وجود سے باہر کی ہر چیز ایک صانع حکیم اور مدبرِ قدیر کی کارفرمائیوں کی جلوہ گاہ ہے اور اس کی ربوبیّت اور رحمت کا ہاتھ ایک ایک ذرّۂ خلقت میں صاف نظر آ رہا ہے۔ پس قدرتی طور پر اس کی رُوح جوشِ ستائش اور محویّتِ جمال سے معمور ہو جائے گی۔ وہ بے اختیار پکار اٹھے گا کہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ! ساری حمد و ستائش اس کے لیے ہے جو اپنی کارفرمائی کے ہر گوشے میں سر چشمۂ رحمت و فیضان اور معنئ حسن و کمال ہے!

اس راہ میں فکر انسانی کی سب سے بڑی گمراہی یہ رہی ہے کہ اس کی نظریں مصنوعات کے جلووں میں محو ہو کر رہ جاتیں، آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرتیں، وہ پردوں کے نقش و نگار کو دیکھ کر بے خود ہو جاتا مگر اس کی جستجو نہ کرتا جس نے اپنے جمال صنعت پر یہ دل آویز پردے ڈال رکھے ہیں۔ دنیا میں مظاہرِ فطرت کی پرستش کی بنیاد اسی کوتاہ نظری سے پڑی۔ پس "الحمد للّٰہ" کا اعتراف اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ کائنات ہستی کا تمام فیضان و جمال خواہ کسی گوشے اور کسی شکل میں ہو۔ صرف ایک صانع حقیقی کی صفتوں ہی کا ظہور ہے اس لیے حسن و جمال کے لیے جتنی بھی شیفتگی ہوگی، خوبی و کمال کے لیے جتنی بھی مدحت طرازی ہوگی۔ بخشش و فیضان کا جتنا بھی اعتراف ہوگا۔ مصنوع و مخلوق کے لیے نہیں ہوگا صانع و خالق ہی کے لیے ہوگا۔

عبارا تناشتی و حسنک واحد
و کل الی ذاک الجمال یشیر!

اللّٰہ

نزول قرآن سے پہلے عربی میں "اللّٰہ" کا لفظ خدا کے لیے بطور اسم ذات کے مستعمل تھا، جیسا کہ شعراء جاہلیت کے کلام سے ظاہر ہے، یعنی خدا کی تمام صفتیں اس کی

طرف منسوب کی جاتی تھیں۔ یہ کسی خاص صفت کے لیے نہیں بولا جاتا تھا۔ قرآن نے بھی یہی لفظ بطور اسم ذات کے اختیار کیا اور تمام صفتوں کو اس کی طرف نسبت دی۔

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْهُ بِهَا. (۷:۱۸۰)

اور اللہ کے لیے حسن و خوبی کے نام ہیں (یعنی صفتیں ہیں) پس چاہیے کہ اسے ان صفتوں کے ساتھ پکارو۔

قرآن نے یہ لفظ محض اس لیے اختیار کیا کہ لغت کی مطابقت کا مقتضیٰ یہی تھا یا اس سے بھی زیادہ کوئی معنوی موزونیّت اس میں پوشیدہ ہے؟

جب ہم اس لفظ کی معنوی دلالت پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے اس غرض کے لیے سب سے زیادہ موزوں لفظ یہی تھا۔

نوعِ انسانی کے دینی تصورات کا ایک قدیم عہد جو تاریخ کی روشنی میں آیا ہے مظاہر فطرت کی پرستش کا عہد ہے۔ اسی پرستش نے بتدریج اصنام پرستی کی صورت اختیار کی۔ اصنام پرستی کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف زبانوں میں بہت سے الفاظ دیوتاؤں کے لیے پیدا ہو گئے۔ اور جوں جوں پرستش کی نوعیت میں وسعت ہوتی گئی الفاظ کا تنوع بھی بڑھتا گیا۔ لیکن چونکہ یہ بات انسان کی فطرت کے خلاف تھی کہ ایک ایسی ہستی کے تصور سے خالی الذہن رہے جو سب سے اعلیٰ اور سب کی پیدا کرنے والی ہستی ہے اس لیے دیوتاؤں کی پرستش کے ساتھ ایک سب سے بڑی اور سب پر حکمران ہستی کا تصور بھی کم و بیش ہمیشہ موجود رہا اور اس لیے جہاں بے شمار الفاظ دیوتاؤں اور ان کی معبودانہ صفات کے لیے پیدا ہو گئے، وہاں کوئی نہ کوئی لفظ ایسا بھی ضرور مستعمل رہا جس کے ذریعے اس اَن دیکھی اور اعلیٰ ترین ہستی کی طرف اشارہ کیا جاتا تھا۔

چنانچہ سامی زبانوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حروف و اصوات کی ایک خاص ترکیب ہے جو معبودیّت کے معنی میں مستعمل رہی ہے اور عبرانی، سریانی، آرامی، کلدانی، حمیری، عربی وغیرہ تمام زبانوں میں اس کا یہ لغوی خاصہ پایا جاتا ہے۔ یہ الف لام

اور ھ کا مادہ ہے اور مختلف شکلوں میں مشتق ہوا ہے۔ کلدانی وسریانی کا ''الاھیا'' عبرانی کا ''الوہ'' اور عربی کا ''الٰہ'' اسی سے ہے اور بلاشبہ یہی ''الٰہ'' ہے جو حرف تعریف کے اضافے کے بعد ''اللہ'' ہو گیا ہے اور تعریف نے اسے صرف خالق کائنات کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔

لیکن اگر ''اللہ'' ''الٰہ'' سے ہے تو ''الٰہ'' کے معنی کیا ہیں؟ علمائے لغت واشتقاق کے مختلف اقوال ہیں مگر سب سے زیادہ قوی قول یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اصل ''اُلٰہ'' ہے اور ''اُ'' کے معنی تحیر اور درماندگی کے ہیں۔ بعضوں نے اسے ''ولہ'' سے ماخوذ بتایا ہے اور اس کے معنی بھی یہی ہیں۔ پس خالقِ کائنات کے لیے یہ لفظ اس لیے اسم قرار پایا کہ اس بارے میں انسان جو کچھ جانتا اور جان سکتا ہے وہ عقل کے تحیّر اور ادراک کی درماندگی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ وہ جس قدر بھی اس ذات مطلق کی ہستی میں غور وخوض کرے گا اس کی عقل کی حیرانی اور درماندگی بڑھتی ہی جائے گی' یہاں تک کہ وہ معلوم کر لے گا کہ اس راہ کی ابتدا بھی عجز وحیرت سے ہوتی ہے۔ اور انتہا بھی عجز وحیرت ہی ہے:

اے بروں از وہم وقال و قیل من
خاک بر فرق من و تمثیل من!

اب غور کرو! خدا کی ذات کے لیے انسان کی زبان سے نکلے ہوئے لفظوں میں اس سے زیادہ موزوں لفظ اور کون سا ہو سکتا ہے؟ اگر خدا کو اس کی صفتوں سے پکارنا ہے تو بلا شبہ اس کی صفتیں بے شمار ہیں' لیکن اگر صفات سے الگ ہو کر اس کی ذات کی طرف اشارہ کرنا ہے تو وہ اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ ایک متحیّر کر دینے والی ذات ہے اور جو کچھ اس کی نسبت کہا جا سکتا ہے وہ عجز ودرماندگی کے اعتراف کے سوا کچھ نہیں ہے۔ فرض کرو نوعِ انسانی نے اس وقت تک خدا کی ہستی یا خلقت کائنات کی اصلیّت کے بارے میں جو کچھ سوچا اور سمجھا ہے وہ سب کچھ سامنے رکھ کر ہم ایک موزوں سے موزوں لفظ تجویز کرنا چاہیں تو وہ کیا ہوگا؟ اس سے زیادہ اور اس سے بہتر کوئی لفظ تجویز کیا جا سکتا ہے؟

یہی وجہ ہے کہ جب کبھی اس راہ میں عرفان وبصیرت کی کوئی بڑی سے بڑی بات کہی

گئی وہ یہی تھی کہ زیادہ سے زیادہ خود درشتگیوں کا اعتراف کیا گیا اور ادراک کا منتہیٰ مرتبہ یہی قرار پایا کہ ادراک کی نارسائی کا ادراک حاصل ہو جائے۔ عرفاء کے دل و زبان کی صدا ہمیشہ یہی رہی کہ "رَبِّ زِدْنِیْ فِیْکَ تَحَیُّرًا"[1] اور حکماء کی حکمت و دانش کا فیصلہ بھی ہمیشہ یہی ہوا کہ: .

"معلومم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد"

چونکہ یہ اسم خدا کے لیے بطور اسم ذات کے استعمال میں آیا۔ اس لیے قدرتی طور پر ان تمام صفتوں پر حاوی ہو گیا۔ جن کا خدا کی ذات کے لیے تصور کیا جا سکتا ہے۔ اگر ہم خدا کا تصور اس کی کسی صفت کے ساتھ کریں، مثلاً "الرب" یا "الرحیم" کہیں تو یہ تصور صرف ایک خاص صفت ہی میں محدود ہوگا، یعنی ہمارے ذہن میں ایک ایسی ہستی کا تصور پیدا ہو جائے گا جس میں ربوبیّت یا رحمت ہے۔ لیکن جب ہم اللہ کا لفظ بولتے ہیں تو فوراً ہمارا ذہن ایک ایسی ہستی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو ان تمام صفاتِ حسن و کمال سے متصف ہے جو اس کی نسبت بیان کیے گئے ہیں اور جو اس میں ہونے چاہئیں۔

رَبوبیّت

"الٰہ" کی طرح "رب" بھی سامی زبانوں کا ایک کثیر الاستعمال مادہ ہے۔ عبرانی اور سریانی اور عربی تینوں زبانوں میں اس کے معنی پالنے کے ہیں اور چونکہ پرورش کی ضرورت کا احساس انسانی زندگی کے بنیادی احساسات میں سے ہے۔ اس لیے اسے بھی قدیم ترین سامی تعبیرات میں سے سمجھنا چاہیے۔ پھر چونکہ معلم، استاد اور آقا کسی نہ کسی اعتبار سے پرورش کرنے والے ہی ہوتے ہیں، اس لیے اس کا اطلاق ان معنوں میں بھی ہونے لگا۔ چنانچہ عبرانی اور آرامی کا "ربی" اور "رباہ" پرورش کنندہ، معلم اور آقا تینوں معنی رکھتا تھا اور قدیم مصری اور کالڈی زبان کا ایک لفظ "رابو" بھی انھیں معنوں میں مستعمل ہوتا ہے اور ان ملکوں کی قدیم ترین سامی وحدت کی خبر دیتا ہے۔

بہر حال عربی میں "ربوبیت" کے معنی پالنے کے ہیں لیکن پالنے کو اس کے وسیع اور

کامل معنوں میں لینا چاہیے۔ اسی لیے بعض ائمہ لغت نے اس کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے: "هو انشاء الشئ حالا فحالاً الى حد التمام"[2] یعنی کسی چیز کو یکے بعد دیگرے اس کی مختلف حالتوں اور ضرورتوں کے مطابق اس طرح نشو ونما دیتے رہنا کہ وہ اپنی حدِ کمال تک پہنچ جائے۔ اگر ایک شخص بھوکے کو کھانا کھلا دے یا محتاج کو روپیہ دے دے تو یہ اس کا کرم ہوگا' جود ہوگا' احسان ہوگا' لیکن وہ بات نہ ہوگی جسے ربوبیّت کہتے ہیں۔ ربوبیّت کے لیے ضروری ہے کہ پرورش اور نگہداشت کا ایک جاری اور مسلسل اہتمام ہو اور ایک وجود کو اس کی تکمیل و بلوغ کے لیے وقتاً فوقتاً جیسی کچھ ضرورتیں پیش آتی رہی۔ ان سب کا سرو سامان ہوتا رہے۔ نیز ضروری ہے کہ یہ سب کچھ محبت وشفقت کے ساتھ ہو' کیونکہ جو عمل محبت و شفقت کے عاطفہ سے خالی ہوگا ربوبیّت نہیں ہوسکتا۔

ربوبیّت کا ایک ناقص نمونہ ہم اس پرورش میں دیکھ سکتے ہیں جس کا جوش ماں کی فطرت میں ودیعت کر دیا گیا ہے۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو محض گوشت پوست کا ایک متحرک لوتھڑا ہوتا ہے اور زندگی اور نمو کی جتنی قوتیں بھی رکھتا ہے۔ سب کی سب پرورش و تربیّت کی محتاج ہوتی ہیں۔ یہ پرورش محبت وشفقت' حفاظت' نگہداشت اور بخشش واعانت کا ایک طول طویل سلسلہ ہے اور اسے اس وقت تک جاری رہنا چاہیے جب تک بچہ اپنے جسم و ذہن کے حدِ بلوغ تک نہ پہنچ جائے۔ پھر پرورش کی ضرورتیں ایک دو نہیں بے شمار ہیں۔ ان کی نوعیّت ہمیشہ بدلتی رہتی ہے اور ضروری ہے کہ ہر عمر اور ہر حالت کے مطابق محبت کا جوش' نگرانی کی نگاہ اور زندگی کا سر و سامان ملتا رہے۔ حکمت الٰہی نے ماں کی محبت میں ربوبیّت کے یہ تمام خدوخال پیدا کر دیے ہیں۔ یہ ماں کی ربوبیّت ہے جو پیدائش کے دن سے لے کر بلوغ تک بچے کو پالتی' بچاتی' سنبھالتی اور ہر وقت اور ہر حالت کے مطابق اس کی ضروریاتِ پرورش کا سر و سامان مہیا کرتی رہتی ہے۔

جب بچے کا معدہ دودھ کے سوا کسی غذا کا متحمل نہ تھا تو اسے دودھ ہی پلایا جاتا تھا۔ جب دودھ سے زیادہ قوی غذا کی ضرورت ہوئی تو ویسی ہی غذا دی جانے لگی۔ جب اس

کے پاؤں میں کھڑے ہونے کی سکت نہ تھی تو ماں اسے گود میں اٹھائے پھرتی تھی۔ جب کھڑے ہونے کے قابل ہوا تو انگلی پکڑ لی اور ایک ایک قدم چلانے لگی۔ پس یہ بات کہ ہر حالت اور صورت کے مطابق ضروریات مہیا ہوتی رہیں اور نگرانی و حفاظت کا ایک مسلسل اہتمام جاری رہا' وہ صورت حال ہے جس سے ربوبیّت کے مفہوم کا تصور کیا جا سکتا ہے۔

مجازی ربوبیّت کی یہ ناقص اور محدود مثال سامنے لاؤ اور ربوبیّت الٰہی کی غیر محدود حقیقت کا تصور کرو۔ اس کے "رب العلمین" ہونے کے معنی یہ ہوئے کہ جس طرح اس کی خالقیّت نے کائنات ہستی اور اس کی ہر چیز پیدا کی ہے' اسی طرح اس کی ربوبیّت نے ہر مخلوق کی پرورش کا سروسامان بھی کر دیا ہے۔ اور یہ پرورش کا سروسامان ایک ایسے عجیب و غریب نظام کے ساتھ ہے کہ ہر وجود کو زندگی اور بقا کے لیے جو کچھ مطلوب تھا وہ سب کچھ مل رہا ہے اور اس طرح مل رہا ہے کہ ہر حالت کی رعایت ہے' ہر ضرورت کا لحاظ ہے۔ ہر تبدیلی کی نگرانی ہے۔ اور ہر کمی بیشی ضبط میں آ چکی ہے۔ چیونٹی اپنے بل میں رینگ رہی ہے' کیڑے مکوڑے کوڑے کرکٹ میں ملے ہوئے ہیں۔ مچھلیاں دریا میں تیر رہی ہیں' پرند ہوا میں اڑ رہے ہیں' پھول باغ میں کھل رہے ہیں' ہاتھی جنگل میں دوڑ رہا ہے۔ اور ستارے فضا میں گردش کر رہے ہیں لیکن فطرت کے پاس سب کے لیے یکساں طور پر پرورش کی گود اور نگرانی کی آنکھ ہے اور کوئی نہیں جو فیضان ربوبیّت سے محروم ہو۔ اگر مثالوں کی جستجو میں تھوڑی سی کاوش جائز رکھی جائے تو مخلوقات کی بے شمار قسمیں ایسی ملیں گی جو اتنی حقیر اور بے مقدار ہیں کہ غیر مسلح آنکھ سے ہم انھیں دیکھ بھی نہیں سکتے۔ تاہم ربوبیّت الٰہی نے جس طرح اور جس نظام کے ساتھ ہاتھی جیسی جسیم اور انسان جیسی عقیل مخلوق کے لیے سامان پرورش مہیا کر دیا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اور ویسے ہی نظام کے ساتھ ان کے لیے بھی زندگی اور بقاء کی ہر چیز مہیا کی ہے۔ اور پھر یہ جو کچھ بھی ہے انسان کے وجود سے باہر ہے۔ اگر انسان اپنے وجود کو دیکھے تو خود اس کی زندگی اور زندگی کا ہر لمحہ ربوبیّت الٰہی کی کرشمہ سازیوں کی ایک پوری کائنات ہے۔

وَفِی الۡاَرۡضِ اٰیٰتٌ لِّلۡمُوۡقِنِیۡنَ ۝ وَفِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ ؕ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ ۝ (۵۱:۲۰-۲۱)

ان لوگوں کے لیے جو (سچائی پر) یقین رکھنے والے ہیں' زمین میں (خدا کی کارفرمائیوں کی) کتنی ہی نشانیاں ہیں۔ اور خود تمھارے وجود میں بھی' پھر کیا تم دیکھتے نہیں؟

نظام ربوبیّت

لیکن سامان زندگی کی بخشائش میں اور ربوبیّت کے عمل میں جو فرق ہے اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اگر دنیا میں ایسے عناصر' عناصر کی ایسی ترکیب اور اشیاء کی ایسی بناوٹ موجود ہے جو زندگی اور نشو و نما کے لیے سودمند ہے تو محض اس کی موجودگی ربوبیّت سے تعبیر نہیں کی جا سکتی۔ ایسا ہونا قدرت الٰہی کی رحمت ہے' بخشش ہے' احسان ہے' مگر وہ بات نہیں جسے ربوبیّت کہتے ہیں۔ ربوبیّت یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں۔ دنیا میں سودمند اشیاء کی موجودگی کے ساتھ ان کی بخشش و تقسیم کا بھی ایک نظام موجود ہے اور فطرت صرف بخشتی ہی نہیں' بلکہ جو کچھ بخشتی ہے ایک مقررہ انتظام اور ایک منضبط ترتیب و مناسبت کے ساتھ بخشتی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں۔ ہر وجود کو زندگی اور بقا کے لیے جس جس چیز کی ضرورت تھی اور جس جس وقت اور جیسی جیسی مقدار میں ضرورت تھی۔ ٹھیک اسی طرح' انھیں وقتوں میں اور اسی مقدار میں اسے مل رہی ہے اور اس نظم و انضباط سے تمام کارخانہ خیال چل رہا ہے۔

پانی کی بخشش و تقسیم کا نظام

زندگی کے لیے پانی اور رطوبت کی ضرورت ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ پانی کے وافر ذخیرے ہر طرف موجود ہیں۔ لیکن اگر صرف اتنا ہی ہوتا تو یہ زندگی کے لیے کافی نہ تھا۔ کیونکہ زندگی کے لیے صرف یہی ضروری نہیں کہ پانی موجود ہو' بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ایک خاص انتظام، ایک خاص ترتیب اور ایک خاص مقررہ مقدار کے ساتھ موجود ہو۔ پس یہ جو دنیا

میں پانی کے بننے اور تقسیم ہونے کا ایک خاص انتظام پایا جاتا ہے اور فطرت صرف پانی بناتی ہی نہیں بلکہ ایک خاص ترتیب و مناسبت کے ساتھ بناتی اور ایک خاص اندازے کے ساتھ بانٹتی رہتی ہے تو یہی ربوبیّت ہے اور اسی سے ربوبیّت کے تمام اعمال کا تصور کرنا چاہیے۔ قرآن کہتا ہے یہ اللہ کی رحمت ہے جس نے پانی جیسا جوہر حیات پیدا کر دیا، لیکن یہ اس کی ربوبیّت ہے جو پانی کو ایک ایک بوند کر کے ٹپکاتی، زمین کے ایک ایک گوشے تک پہنچاتی، ایک خاص مقدار اور حالت میں تقسیم کرتی' ایک خاص موسم اور محل میں برساتی اور پھر زمین کے ایک ایک تشنہ ذرّے کو ڈھونڈ ھ ڈھونڈ ھ کر سیراب کر دیتی ہے۔

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَاءً بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍ بِهٖ لَقَادِرُوْنَo فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَo (۲۳:۱۸۔۱۹)

اور (دیکھو) ہم نے آسمان سے ایک خاص اندازے کے ساتھ پانی برسایا' پھر اسے زمین میں ٹھہرائے رکھا اور ہم اس پر بھی قادر ہیں کہ (جس طرح برسایا تھا اسی طرح) اسے واپس لے جائیں۔ پھر (دیکھو) اسی پانی سے ہم نے کھجوروں اور انگوروں کے باغ پیدا کر دیے جن میں بے شمار پھل لگتے ہیں اور انھیں سے تم اپنی غذا بھی حاصل کرتے ہو۔

تقدیر اشیاء

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جا بجا اشیاء کی قدر اور مقدار کا ذکر کیا۔ یعنی اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ فطرت کائنات کو جو کچھ بخشتی ہے ایک خاص اندازے کے ساتھ بخشتی ہے اور یہ اندازہ ایک خاص قانون کے ماتحت ٹھہرایا ہوا ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍo (الحجر۔۲۱)

اور کوئی شے نہیں جس کے ہمارے پاس ذخیرے موجود نہ ہوں (لیکن

ہمارا طریق کار یہ ہے) جو کچھ نازل کرتے ہیں' ایک مقررہ مقدار میں
نازل کرتے ہیں کرم بھی خشکی اور تری میں بچھا ہوا ہے اور کوئی مخلوق نہیں
جس کے گردو پیش اس کی غذا کا ذخیرہ موجود نہ ہو۔

نظام پرورش

پھر سامان پرورش کے اس عالمگیر نظام پر غور کرو۔ جو اپنے ہر گوشۂ عمل میں پروردگی کی گود اور بخشش حیات کا سرچشمہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا یہ تمام کارخانہ صرف اسی لیے بنا ہے کہ زندگی بخشے اور زندگی کی ہر استعداد کی رکھوالی کرے۔ سورج اس لیے ہے کہ روشنی کے لیے چراغ کا اور گرمی کے لیے تنور کا کام دے اور اپنی کرنوں کے ڈول بھر بھر کر سمندر سے پانی کھینچتا رہے۔ ہوائیں اس لیے ہیں کہ اپنی سردی اور گرمی سے مطلوبہ اثرات پیدا کرتی رہیں اور کبھی پانی کے ذرات جما کر ابر کی چادریں بچھا دیں۔ کبھی ابر کو پانی بنا کر بارش بنا دیں۔ زمین اس لیے ہے کہ نشو و نما کے خزانوں سے ہمیشہ معمور رہے۔ اور ہر دانے کے لیے اپنی گود میں زندگی اور ہر پودے کے لیے اپنے سینے میں پروردگی رکھے۔ مختصر یہ کہ کارخانۂ ہستی کا ہر گوشہ صرف اسی کام میں لگا ہوا ہے۔ ہر قوت استعداد ڈھونڈ رہی ہے۔ اور ہر تاثیر اثر پذیری کے انتظار میں ہے۔ جوں ہی کسی وجود میں بڑھنے اور نشو و نما پانے کی استعداد پیدا ہوتی ہے معاً تمام کارخانۂ ہستی اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ سورج کی تمام کارفرمائیاں' فضا کے تمام تغیرات' زمین کی تمام قوتیں' عناصر کی تمام سرگرمیاں صرف اس انتظار میں رہتی ہیں کہ کب چیونٹی کے انڈے سے ایک بچہ ہوتا ہے اور کب دہقان کی جھولی سے زمین پر ایک دانہ گرتا ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ٥ (۱۳:۴۵)

اور آسمان و زمین میں جو کچھ بھی ہے سب کو اللہ نے تمھارے لیے مسخر کر
دیا ہے بلاشبہ ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرنے والے ہیں' اس بات

میں (معرفت حقیقت کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں۔

نظام ربوبیّت کی وحدت

سب سے زیادہ عجیب مگر سب سے زیادہ نمایاں حقیقت نظام ربوبیت کی یکسانیت اور ہم آہنگی ہے۔ یعنی ہر وجود کی پرورش کا سر و سامان جس طرح اور جس اسلوب پر کیا گیا ہے وہ ہر گوشے میں ایک ہی ہے اور ایک ہی اصل و قاعدہ رکھتا ہے۔ پتھر کا ایک ٹکڑا تمھیں گلاب کے شاداب اور عطر بیز پھول سے کتنا ہی مختلف دکھائی دے لیکن دونوں کی پرورش کے اصول و احوال پر نظر ڈالو گے تو صاف نظر آ جائے گا کہ دونوں کو ایک ہی طریقے سے سامان پرورش ملا ہے۔ اور دونوں ایک ہی طرح پالے پوسے جا رہے ہیں۔ انسان کا بچہ اور درخت کا پودا تمھاری نظروں میں کتنی بے جوڑ چیزیں ہیں لیکن اگر ان کی نشو و نما کے طریقوں کا کھوج لگاؤ گے تو دیکھ لو گے کہ قانونِ پرورش کی یکسانیت نے دونوں کو ایک ہی رشتے میں منسلک کر دیا ہے۔ پتھر کی چٹان ہو یا پھول کی کلی' انسان کا بچہ ہو یا چیونٹی کا انڈا' سب کے لیے پیدائش ہے اور قبل اس کے کہ پیدائش ظہور میں آئے سامانِ پرورش مہیا ہو جاتا ہے' پھر طفولیّت کا دور ہے اور اس دور کی ضروریات ہیں۔ انسان کا بچہ بھی اپنی طفولیت رکھتا ہے' درخت کے مولودِ نباتی کے لیے بھی طفولیّت ہے اور تمھاری چشم ظاہر بین کے لیے کتنا ہی عجیب کیوں نہ ہو' لیکن پتھر کی چٹان کا تو دہ بھی اپنی اپنی طفولیّت رکھتا ہے۔ پھر طفولیّت رشد و بلوغ کی طرف بڑھتی ہے اور جوں جوں بڑھتی جاتی ہے' اس کی روز افزوں حالت کے مطابق یکے بعد دیگرے سامان پرورش میں بھی تبدیلیاں ہوتی جاتی ہیں' یہاں تک کہ ہر وجود اپنے سن کمال تک پہنچ جاتا ہے اور جب سن کمال تک پہنچ گیا تو از سر نو ضعف و انحطاط کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ پھر اس ضعف و انحطاط کا خاتمہ بھی سب کے لیے ایک ہی طرح ہے۔ کسی دائرے میں اسے مر جانا کہتے ہیں۔ کسی میں مرجھا جانا اور کسی میں پامال ہو جانا' الفاظ متعدد ہو گئے مگر حقیقت میں تعدد نہیں ہوا۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً

ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفاً وَّ شَيْبَةً ط يَخْلُقُ مَايَشَآءُ وَ هُوَ الْعَلِيْمُ قَدِيْرٌo (۳۰-۵۴)

یہ اللہ ہی کی کارفرمائی ہے کہ اس نے تمھیں اس طرح پیدا کیا کہ پہلے ناتوانی کی حالت ہوتی ہے' پھر ناتوانی کے بعد قوت آتی ہے۔ پھر قوت کے بعد دوبارہ ناتوانی اور بڑھاپا ہوتا ہے، وہ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ وہ علم اور قدرت رکھنے والا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِيْ الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجَ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰهُ مَصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهٗ حُطَامًا ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِo (۳۹:۲۱)

کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا' پھر زمین میں اس کے چشمے رواں ہو گئے۔ پھر اسی پانی سے رنگ برنگ کی کھیتیاں لہلہا اٹھیں۔ پھر ان کی نشو ونما میں ترقی ہوئی اور پوری طرح پک کر تیار ہو گئیں۔ پھر (ترقی کے بعد زوال طاری ہوا اور) تم دیکھتے ہو کہ ان پر زردی چھا گئی' پھر بالآخر خشک ہو کر چورا چورا ہو گئیں۔ بلاشبہ دانش مندوں کے لیے اس صورت میں بڑی ہی عبرت ہے۔

جہاں تک غذا کا تعلق ہے' حیوانات میں ایک قسم ان جانوروں کی ہے جن کے بچے دودھ سے پرورش پاتے ہیں اور ایک ان کی ہے جو عام غذاؤں سے پرورش پاتے ہیں۔ غور کرو نظام ربوبیّت نے دونوں کی پرورش کے لیے کیسا عجیب سرو سامان مہیا کر دیا ہے۔ دودھ سے پرورش پانے والے حیوانات میں انسان بھی داخل ہے سب سے پہلے انسان اپنی ہی ہستی کا مطالعہ کرے۔ جوں ہی وہ پیدا ہوتا ہے اس کی غذا اپنی خاصیّتوں' مناسبتوں اور شرطوں کے ساتھ خود بہ خود مہیا ہوتی جاتی ہے اور ایسی جگہ سے مہیا ہوتی ہے جو حالت

طفولیت میں اس کے لیے سب سے قریب تر اور سب سے موزوں جگہ ہے۔ ماں بچے کو جوش محبت میں سینے سے لگا لیتی ہے اور وہیں اس کی غذا کا سرچشمہ بھی موجود ہوتا ہے۔ پھر دیکھو اس غذا کی نوعیّت اور مزاج میں اس کی حالت کا درجہ بہ درجہ کس قدر لحاظ رکھا گیا ہے اور کس طرح یکے بعد دیگرے اس میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ ابتدا میں بچے کا معدہ اتنا کمزور ہوتا ہے کہ اسے بہت ہی ہلکے قوام کا دودھ ملنا چاہیے۔ چنانچہ نہ صرف انسان میں بلکہ تمام حیوانات میں ماں کا دودھ بہت ہی پتلے قوام کا ہوتا ہے لیکن جوں جوں بچے کی عمر بڑھتی جاتی ہے اور معدہ قوی ہوتا جاتا ہے۔ دودھ کا قوام بھی بدلتا جاتا ہے اور ماہیّت کے مقابلے میں دہنیت بڑھتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بچے کا عہدِ رضاعت پورا ہو جاتا ہے اور اس کا معدہ عام غذاؤں کے ہضم کرنے کی استعداد پیدا کر لیتا ہے۔ جوں ہی اس کا وقت آتا ہے ماں کا دودھ خشک ہو جاتا ہے۔ یہ گویا ربوبیت الٰہی کا اشارہ ہوتا ہے۔ کہ اب اس کے لیے دودھ کی ضرورت نہیں رہی، ہر طرح کی غذائیں استعمال کر سکتا ہے۔

وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا (۴۶:۱۵)

''اور حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت کم از کم تیس مہینوں کی ہے۔''

پھر ربوبیت الٰہی کی اس کارسازی پر غور کرو کہ کس طرح ماں کی فطرت میں بچے کی محبت ودیعت کر دی گئی ہے۔ اور کس طرح اس جذبے کو طبیعت بشری کے تمام جذبات میں سب سے زیادہ پر جوش اور سب سے زیادہ ناقابل تسخیر بنا دیا گیا ہے۔ دنیا کی کون سی قوت ہے جو اس جوش کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ جسے ماں کی مامتا کہتے ہیں؟ جس بچے کی پیدائش اس کے لیے زندگی کی سب سے بڑی مصیبت تھی۔

حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّ وَضَعَتْهُ كُرْهًا. (۴۶:۱۵)

''اس کی ماں نے اسے تکلیف کے ساتھ پیٹ میں رکھا اور تکلیف کے ساتھ جنا۔''

اسی کی محبت اس کے اندر زندگی کا سب سے بڑا جذبہ مشتعل کر دیتی ہے۔ جب تک بچہ

سن بلوغ تک نہیں پہنچ جاتا ہے۔ وہ اپنے لیے نہیں' بلکہ بچے کے لیے زندہ رہنا چاہتی ہے۔ زندگی کی کوئی خودفراموشی نہیں جو اس پر طاری نہ ہوتی ہو اور راحت و آسائش کی کوئی قربانی نہیں جس سے اسے گریز ہو۔ ذات جو فطرت انسانی کا سب سے زیادہ طاقت ور جذبہ ہے اور جس کے انفعالات کے بغیر کوئی مخلوق زندہ نہیں رہ سکتی' وہ بھی اس جذبۂ خودفراموشی کے مقابلے میں مضمحل ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ بات کہ ایک ماں نے بچے کے مجنونانہ عشق میں اپنی زندگی قربان کر دی' فطرت مادری کا ایسا معمولی واقعہ ہے جو ہمیشہ پیش آتا رہتا ہے اور ہم اس میں کسی طرح کی غرابت محسوس نہیں کرتے۔

لیکن پھر دیکھو کہ کارساز فطرت کی یہ کیسی کرشمہ سازی ہے کہ جوں جوں بچے کی عمر بڑھتی جاتی ہے' محبت مادری کا یہ شعلہ خود بخود دھیما پڑتا جاتا ہے۔ اور پھر ایک وقت آتا ہے جب حیوانات میں تو بالکل ہی بجھ جاتا ہے اور انسان میں بھی اس کی گرم جوشیاں باقی نہیں رہتیں۔ یہ انقلاب کیوں ہوتا ہے؟ ایسا کیوں ہے کہ بچے کے پیدا ہوتے ہی محبت کا ایک عظیم ترین جذبہ جنبش میں آ جائے اور پھر ایک خاص وقت تک قائم رہ کر خود بہ خود غائب ہو جائے؟ اس لیے کہ یہ نظام ربوبیّت کی کارفرمائی ہے اور اس کا مقتضیٰ یہی تھا۔ ربوبیّت چاہتی ہے کہ بچے کی پرورش ہو۔ اس نے پرورش کا ذریعہ ماں کے جذبۂ محبت میں رکھ دیا۔ جب بچے کی عمر اس حد تک پہنچ گئی کہ ماں کی پرورش کی احتیاج باقی نہ رہی تو اس ذریعے کی بھی ضرورت باقی نہ رہی۔ اب اس کا باقی رہنا ماں کے لیے بوجھ اور بچے کے لیے رکاوٹ ہوتا۔ بچے کی احتیاج کا سب سے زیادہ نازک وقت اس کی نئی نئی طفولیت تھی۔ اس لیے ماں کی محبت میں بھی سب سے زیادہ جوش اسی وقت تھا۔ پھر جوں جوں بچہ بڑھتا گیا احتیاج کم ہوتی گئی۔ اس لیے محبت کی گرم جوشیاں بھی گھٹتی گئیں۔ فطرت نے محبتِ مادری کا دامن بچے کی احتیاج پرورش سے باندھ دیا تھا۔ جب احتیاج زیادہ تھی تو محبت کی سرگرمی بھی زیادہ تھی۔ جب احتیاج کم ہو گئی تو محبت بھی تغافل کرنے لگی۔[1]

جن حیوانات کے بچے انڈوں سے پیدا ہوتے ہیں' ان کی جسمانی ساخت اور

طبیعت دودھ دینے والے حیوانات سے مختلف ہوتی ہے۔ اس لیے وہ اول دن ہی سے معمولی غذائیں کھا سکتے ہیں' بشرطیکہ کھلانے کے لیے کوئی شفیق نگرانی موجود ہو۔ چنانچہ تم دیکھتے ہو کہ بچہ انڈے سے نکلتے ہی غذا ڈھونڈنے لگتا ہے اور ماں چن چن کر اس کے سامنے ڈالتی اور منہ میں لے لے کر کھانے کی تلقین کرتی ہے یا ایسا کرتی ہے کہ خود کھا لیتی ہے مگر ہضم نہیں کرتی۔ اپنے اندر نرم اور ہلکا بنا کر محفوظ رکھتی ہے اور جب بچہ غذا کے لیے منہ کھولتا ہے تو اس کے اندر اتار دیتی ہے۔

ربوبیت معنوی

پھر اس سے بھی عجیب تر نظام ربوبیت کا معنوی پہلو ہے۔ خارج میں زندگی اور پرورش کا کتنا ہی سرو سامان کیا جاتا' لیکن وہ کچھ مفید نہیں ہو سکتا تھا اگر ہر وجود کے اندر اس سے کام لینے کی ٹھیک ٹھیک استعداد نہ ہوتی اور اس کے ظاہری و باطنی قویٰ اس کا ساتھ نہ دیتے۔ پس یہ ربوبیت ہی کا فیضان ہے کہ ہم دیکھتے ہیں ہر مخلوق کی ظاہری و باطنی بناوٹ اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ اس کی ہر قوت اس کے سامان پرورش کی نوعیّت کے مطابق ہوتی ہے اور اس کی ہر چیز اسے زندہ رہنے اور نشو و نما پانے میں مدد دیتی ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی مخلوق اپنے جسم و قویٰ کی ایسی نوعیت رکھتی ہو جو اس کے حالات پرورش کے مقتضیات کے خلاف ہو۔ اس سلسلے میں جو حقائق مشاہدہ و تفکر سے نمایاں ہوتے ہیں ان میں دو باتیں سب سے زیادہ نمایاں ہیں اس لیے جا بجا قرآن حکیم نے ان پر توجہ دلائی ہے۔ ایک کو وہ تقدیر سے تعبیر کرتا ہے، دوسری کو ہدایت سے۔

تقدیر

تقدیر کے معنی اندازہ کر دینے کے ہیں' یعنی کسی چیز کے لیے ایک خاص طرح کی حالت ٹھہرا دینے کے' خواہ یہ ٹھہراؤ کمیّت میں ہو یا کیفیت میں' چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ فطرت نے ہر وجود کی جسمانی ساخت اور معنوی قویٰ کے لیے ایک خاص طرح کا اندازہ ٹھہرا دیا ہے جس سے وہ باہر نہیں جا سکتا اور یہ اندازہ ایسا ہے جو اس کی زندگی اور نشو و نما

کے تمام احوال وظروف سے ٹھیک ٹھیک مناسبت رکھتا ہے۔

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا ۝ (۲:۲۵)

اور اس نے تمام چیزیں پیدا کیں، پھر ہر چیز کے لیے (اس کی حالت اور ضرورت کے مطابق) ایک خاص اندازہ ٹھہرایا۔

یہ کیا چیز ہے کہ ہر گرد وپیش میں اور اس کی پیداوار میں ہمیشہ مطابقت پائی جاتی ہے اور یہ ایک ایسا قانونِ خلقت ہے جو کبھی متغیر نہیں ہو سکتا؟ یہ کیوں ہے کہ ہر مخلوق اپنی ظاہری و باطنی بناوٹ میں ویسی ہی ہوتی ہے جیسا اس کا گرد وپیش ہے اور ہر گرد وپیش ویسا ہی ہوتا ہے جیسی اس کی مخلوقات کی ساخت ہوتی ہے؟ یہ اس حکیم وقدیر کی ٹھہرائی ہوئی تقدیر ہے اور اس نے ہر چیز کی خلقت وزندگی کے لیے ایسا ہی اندازہ مقرر کر دیا ہے۔ اس کا یہ قانونِ تقدیر صرف حیوانات ونباتات ہی کے لیے نہیں ہے، بلکہ کائناتِ ہستی کی ہر چیز کے لیے ہے۔ ستاروں کا یہ پورا نظامِ گردش بھی اسی تقدیر کی حد بندیوں پر قائم ہے۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ج ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ۝ (۳۸:۳۶)

اور (دیکھو) سورج کے لیے جو قرار گاہ ٹھہرا دی گئی ہے وہ اسی پر چلتا ہے اور یہ عزیز وعلیم خدا کی اس کے لیے تقدیر ہے۔

مخلوقات اور اس کے گرد وپیش کی مطابقت کا یہی قانون ہے جس نے دونوں میں باہم دِگر مناسبت پیدا کر دی ہے۔ اور ہر مخلوق اپنے چاروں طرف وہی پاتی ہے جس میں اس کے لیے پرورش اور نشو ونما کا سامان ہوتا ہے۔ پرند کا جسم اڑنے والا ہے، مچھلی کا تیرنے والا، چار پایوں کا چلنے والا، حشرات کا رینگنے والا، اس لیے کہ ان میں سے ہر نوع کا گرد وپیش ویسے ہی جسم کے لیے موزوں ہے جیسا اسے ملا ہے اور اس لیے کہ ان میں سے ہر نوع کی جسمانی ساخت ویسا ہی گرد وپیش چاہتی ہے جیسا گرد وپیش اسے حاصل ہے۔ دریا میں پرند پیدا نہیں ہوتا، اس لیے کہ یہ گرد وپیش اس کے لیے مفیدِ پرورش نہیں۔ خشکی

میں مچھلیاں پیدا نہیں ہوسکتیں، کیونکہ خشکی ان کے لیے موزوں نہیں۔ اگر فطرت کی اس تقدیر کے خلاف ایک خاص گرد وپیش کی مخلوق دوسری قسم کے گرد وپیش میں چلی جاتی ہے تو یا تو وہاں زندہ نہیں رہتی یا رہتی ہے تو پھر بتدریج اس کی جسمانی ساخت اور طبیعت بھی ویسی ہی ہو جاتی ہے جیسی اس گرد وپیش میں ہونی چاہیے۔

پھر ان میں سے ہر نوع کے لیے مقامی مؤثرات کے مختلف گرد وپیش ہیں اور ہر گرد و پیش کا یہی حال ہے۔ سرد آب وہوا کی پیداوار سرد آب وہوا ہی کے لیے ہے، گرم کی گرم کے لیے' قطب شمالی کے قرب و جوار کا ریچھ خط استواء کے قرب میں نظر نہیں آ سکتا اور منطقۂ حارہ کے جانور منطقہ باردہ میں معدوم ہیں۔

ہدایت

ہدایت کے معنی راہ دکھانے، راہ پر لگا دینے، راہ نمائی کرنے کے ہیں۔ اور اس کے مختلف مراتب اور اقسام ہیں۔ یہاں صرف اس مرتبۂ ہدایت کا ذکر کرنا ہے جو تمام مخلوقات پر ان کی پرورش کی راہیں کھولتا' انھیں زندگی کی راہ پر لگاتا اور ضروریاتِ زندگی کی طلب و حصول میں رہ نمائی کرتا ہے۔ فطرت کی یہ ہدایت ربوبیت کی ہدایت ہے اور اگر ہدایت ربوبیت کی دستگیری نہ ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ کوئی مخلوق بھی دنیا کے سامانِ حیات و پرورش سے فائدہ اٹھا سکتی اور زندگی کی سرگرمیاں ظہور میں آ سکتیں۔

لیکن ربوبیت الٰہی کی یہ ہدایت کیا ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ یہ وجدان کا فطری الہام اور حواس وادراک کی قدرتی استعداد ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ فطرت کی ایسی راہ نمائی ہے جو ہر مخلوق کے اندر پہلے وجدان کا الہام بن کر نمودار ہوتی ہے پھر حواس وادراک کا چراغ روشن کر دیتی ہے۔ یہ ہدایت کے مختلف مراتب میں سے وجدان اور ادراک کی ہدایت کے مراتب ہیں۔

ہدایتِ وجدان

وجدان کی ہدایت یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں ہر مخلوق کی طبیعت میں کوئی ایسا اندرونی الہام موجود ہے جو اسے زندگی اور پرورش کی راہوں پر خود بخود لگا دیتا ہے اور وہ باہر کی راہ

نمائی و تعلیم کی محتاج نہیں ہوتی۔ انسان کا بچہ ہو یا حیوان کا۔ جونہی شکم مادر سے باہر آتا ہے خود بخود معلوم کر لیتا ہے کہ اس کی غذا ماں کے سینے میں ہے اور جب پستان منہ میں لیتا ہے تو جانتا ہے کہ اسے زور زور سے چوسنا چاہیے۔ بلی کے بچوں کو ہمیشہ دیکھتے ہیں کہ ابھی ابھی پیدا ہوئے ہیں، ان کی آنکھیں بھی نہیں کھلی ہیں لیکن ماں جوشِ محبت میں انھیں چاٹ رہی ہے۔ وہ اس کے سینے پر منہ مار رہے ہیں۔ یہ بچہ جس نے عالم ہستی میں ابھی ابھی قدم رکھا ہے، جسے خارج کے مؤثرات نے چھوا تک نہیں، کس طرح معلوم کر لیتا ہے کہ اسے پستان منہ میں لے لینا چاہیے اور اس کی غذا کا سرچشمہ یہیں ہے؟ وہ کون سا فرشتہ ہے جو اس وقت اس کے کان میں پھونک دیتا ہے کہ وہ اس طرح اپنی غذا حاصل کر لے؟ یقیناً وہ وجدانی ہدایت کا فرشتہ ہے اور یہی وجدانی ہدایت ہے جو قبل اس کے کہ حواس و ادراک کی روشنی نمودار ہو ہر مخلوق کو اس کی پرورش و زندگی کی راہوں پر لگا دیتی ہے۔

تمھارے گھر میں پلی ہوئی بلّی ضرور ہوگی۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ بلّی اپنی عمر میں پہلی مرتبہ حاملہ ہوئی ہے۔ اس حالت کا اسے کوئی پچھلا تجربہ حاصل نہیں۔ تاہم اس کے اندر کوئی چیز ہے جو اسے بتا دیتی ہے کہ تیاری و حفاظت کی سرگرمیاں شروع کر دینی چاہئیں۔ جونہی وضع حمل کا وقت آتا ہے، خود بخود اس کی توجہ ہر چیز کی طرف سے ہٹ جاتی ہے اور کسی محفوظ گوشے کی جستجو شروع کر دیتی ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ مضطرب الحال بلی مکان کا ایک ایک کونہ دیکھتی پھرتی ہے۔ پھر وہ خود بخود ایک سب سے محفوظ اور علیحدہ گوشہ چھانٹ لیتی ہے اور وہاں بچے کو جنم دیتی ہے۔ پھر یکایک اس کے اندر بچے کی حفاظت کی طرف سے ایک مجہول خطرہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ یکے بعد دیگرے اپنی جگہ بدلتی رہتی ہے۔ غور کرو! یہ کون سی قوت ہے جو بلّی کے اندر خیال پیدا کر دیتی ہے کہ محفوظ جگہ تلاش کرے، کیونکہ عنقریب ایسی جگہ کی اسے ضرورت ہوگی؟ یہ کون سا الہام ہے جو اسے خبردار کر دیتا ہے کہ بلاّ بچوں کا دشمن اور ان کی بو سونگھتا پھرتا ہے، اس لیے جگہ بدلتے رہنا چاہیے؟ بلاشبہ یہ ربوبیّتِ الٰہی کی وجدانی ہدایت ہے۔ جس کا الہام ہر مخلوق کے اندر اپنی نمود رکھتا ہے اور

جوان پر زندگی اور پرورش کی تمام راہیں کھول دیتا ہے۔

ہدایت حواس

ہدایت کا دوسرا مرتبہ حواس اور مدرکات ذہنی کی ہدایت ہے اور وہ اس درجہ واضح و معلوم ہے کہ تشریح کی ضرورت نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اگرچہ حیوانات اس جوہر دماغ سے محروم ہیں جسے فکر و عقل سے تعبیر کیا جاتا ہے' تاہم فطرت نے انھیں احساس وادراک کی وہ تمام قوتیں دے دی ہیں جن کی زندگی و معیشت کے لیے ضرورت تھی۔ اوران کی مدد سے وہ اپنے رہنے سہنے' کھانے پینے' توالد و تناسل اور حفاظت و نگرانی کے تمام وظائف حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیتے رہتے ہیں۔ پھر حواس وادراک کی یہ ہدایت ہر حیوان کے لیے ایک ہی طرح کی نہیں ہے' بلکہ ہر وجود کو اتنی ہی اور ویسی ہی استعداد دی گئی ہے جتنی اور جیسی استعداد اس کے احوال وظروف کے لیے ضروری تھی۔ چیونٹی کی قوت شامہ نہایت دوررس ہوتی ہے' اس لیے کہ اسی قوت کے ذریعے وہ اپنی غذا حاصل کر سکتی ہے' چیل اور عقاب کی نگاہ تیز ہوتی ہے' کیونکہ اگر ان کی نگاہ تیز نہ ہو تو بلندی میں اڑتے ہوئے اپنا شکار دیکھ نہ سکیں۔ یہ سوال بالکل غیر ضروری ہے کہ حیوانات کے حواس وادراک کی یہ حالت اوّل دن سے تھی یا احوال وظروف کی ضروریات اور قانون مطابقت کے مؤثرات سے بتدریج ظہور میں آئی۔ اس لیے کہ خواہ کوئی صورت ہو' بہرحال فطرت کی بخشی ہوئی استعداد ہے اور نشو وارتقا کا قانون بھی فطرت ہی کا ٹھہرایا ہوا قانون ہے۔

چنانچہ یہی مرتبۂ ہدایت ہے جس کو قرآن نے ربوبیت الٰہی کی ''وحی'' سے تعبیر کیا ہے۔ عربی میں وحی کے معنی مخفی ایماء اور اشارے کے ہیں۔ یہ گویا فطرت کی وہ اندرونی سرگوشی ہے جو ہر مخلوق پر اس کی راہ عمل کھول دیتی ہے۔

وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّ
مِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ٥ (١٦:٦٨)

''اور دیکھو! تمھارے پروردگار نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈال

دی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اوران ٹٹیوں میں جو اس غرض سے بلند کی جاتی ہیں اپنے لیے چھتے بنائے۔''

اور یہی وہ ربوبیت الٰہی کی ہدایت ہے جس کی طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی اشارہ کیا گیا ہے۔ فرعون نے جب پوچھا: فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى؟ تمھارا پروردگار کون ہے؟ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا:

رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰىo (۲۰:۵۰)

''ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی بناوٹ دی۔ پھر اس پر زندگی و معیشت کی راہ کھول دی۔''

اور پھر یہی وہ ہدایت ہے جسے دوسری جگہ ''راہ عمل آسان کر دینے'' سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔

مِنْ اَیِّ شَیْءٍ خَلَقَهٗo مِنْ نُّطْفَةٍ ط خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗo ثُمَّ السَّبِیْلَ یَسَّرَهٗo (۸۰:۱۸۔۲۰)

''اس نے انسان کو کس چیز سے پیدا کیا؟ نطفہ سے پیدا کیا۔ پھر اس (کی تمام ظاہری و باطنی قوتوں) کے لیے ایک اندازہ ٹھہرا دیا' پھر اس پر (زندگی و عمل کی) راہ آسان کر دی۔''

یہی ''ثُمَّ السَّبِیْلَ یَسَّرَهٗ'' یعنی ''راہ عمل آسان کر دینا'' وجدان وادراک کی ہدایت ہے جو تقدیر کے بعد ہے' کیونکہ اگر فطرت کی یہ رہنمائی نہ ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ ہم اپنی ضروریاتِ زندگی حاصل کر سکتے۔

آگے چل کر تمھیں معلوم ہوگا کہ قرآن نے تکوینِ وجود کے جو چار مرتبے بیان کیے ہیں' ان میں سے تیسرا اور چوتھا مرتبہ یہی تقدیر اور ہدایت کا مرتبہ ہے۔ تخلیق' تسویہ' تقدیر' ہدایت۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰىo وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰىo (۸۷:۲۔۳)

''وہ پروردگار عالم جس نے پیدا کیا پھر اسے ٹھیک ٹھیک درست کر دیا اور جس نے ہر وجود کے لیے ایک اندازہ ٹھہرادیا۔ پھر اس پر راہ (عمل) کھول دی۔''

براہین قرآنیہ کا مبدءِ استدلال

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے خدا کی ہستی اور اس کی توحید وصفات پر جا بجا نظامِ ربوبیّت سے استدلال کیا ہے اور یہ استدلال اس کے مہمّاتِ دلائل میں سے ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ اس کی تشریح کی جائے، مناسب ہوگا کہ قرآن کے طریقِ استدلال کی بعض مبادیات واضح کر دی جائیں۔ کیونکہ مختلف اسباب سے جن کی تشریح کا یہ موقع نہیں ہے، مطالبِ قرآنی کا یہ گوشہ سب سے زیادہ مہجور ہو گیا ہے اور ضرورت ہے کہ از سرِ نو حقیقتِ گم گشتہ کا سراغ لگایا جائے۔

دعوتِ تعقل

قرآن کے طریقِ استدلال کا اوّلین مبدأ تعقّل وتفکّر کی دعوت ہے یعنی وہ جا بجا اس بات پر زور دیتا ہے کہ انسان کے لیے حقیقت شناسی کی راہ یہی ہے کہ خدا کی دی ہوئی عقل وبصیرت سے کام لے اور اپنے وجود کے اندر اور اپنے وجود کے باہر جو کچھ بھی محسوس کر سکتا ہے، اس میں تدّبر وتفکّر کرے۔ چنانچہ قرآن کی کوئی سورت اور سورت کا کوئی حصہ نہیں جو تفکّر وتعقّل کی دعوت سے خالی ہو:

وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ ۝ وَفِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ (۵۱:۲۰-۲۱)

''اور یقین رکھنے والوں کے لیے زمین میں بھی (معرفت حق کی) نشانیاں ہیں اور خود تمھارے وجود میں بھی، پھر کیا تم دیکھتے نہیں۔''

وہ کہتا ہے: انسان کو عقل وبصیرت دی گئی ہے اس لیے وہ اس قوت کے ٹھیک ٹھیک استعمال کرنے نہ کرنے کے لیے جواب دہ ہے۔

اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا. (۱۷:۳۶)

"یقیناً (انسان کا) سننا' دیکھنا' سوچنا سب اپنی اپنی جگہ جواب دہی رکھتے ہیں!
وہ کہتا ہے: زمین کی ہر چیز میں' آسمان کے ہر منظر میں' زندگی کے ہر تغیر میں' فکر انسانی کے لیے معرفت حقیقت کی نشانیاں ہیں' بشرطیکہ وہ غفلت و اعراض میں مبتلا نہ ہو جائے۔"

وَ كَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ○ (۱۲:۱۰۵)

"اور آسمان و زمین میں (معرفت حق کی) کتنی ہی نشانیاں ہیں۔ لیکن (افسوس انسان کی غفلت پر!) لوگ ان پر سے گزر جاتے ہیں اور نظر اٹھا کر دیکھتے تک نہیں!"

تخلیق بالحق

اچھا! اگر انسان عقل و بصیرت سے کام لے اور کائنات خلقت میں تفکر کرے تو اس پر حقیقت شناسی کا کون سا دروازہ کھلے گا؟ وہ کہتا ہے کہ سب سے پہلی حقیقت جو اس کے سامنے نمودار ہوگی وہ تخلیق بالحق کا عالمگیر اور بنیادی قانون ہے' یعنی وہ دیکھے گا کہ کائنات خلقت اور اس کی ہر چیز کی بناوٹ کچھ اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ ہر چیز ضبط و ترتیب کے ساتھ ایک خاص نظام و قانون میں منسلک ہے اور کوئی شے نہیں جو حِکم و مصالحت سے خالی ہو۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ سب کچھ تخلیق بالباطل ہو' یعنی بغیر کسی معین اور ٹھہرائے ہوئے مقصد و نظم کے وجود میں آ گیا ہو۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ اس نظم' اس یکسانیت، اس وقت کے ساتھ اس کی ہر بات کسی نہ کسی حکمت و مصلحت کے ساتھ بندھی ہوئی ہوتی۔

خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ○ (۲۹:۴۴)

"اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو حکمت اور مصلحت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور بلاشبہ اس بات میں اربابِ ایمان کے لیے (معرفت حق کی) ایک بڑی ہی نشانی ہے۔"

''آل عمران'' کی مشہور آیت میں ان اربابِ دانش کی جو آسمان و زمین کی خلقت میں تفکر کرتے ہیں۔ صدائے حال یہ بتائی ہے:

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا. (۳:۱۹۱)

''اے ہمارے پروردگار! یہ سب کچھ تو نے اس لیے پیدا نہیں کیا کہ محض ایک بے کار و عبث سا کام ہو۔''

دوسری جگہ ''تخلیق بالباطل'' کو تلعب سے تعبیر کیا ہے۔ ''تلعّب'' یعنی کوئی کام کھیل کود کی طرح بغیر کسی معقول غرض و مدعا کے کرنا۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ○ وَمَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ (۴۴:۳۸-۳۹)

''ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، محض کھیل اور تماشہ کرتے ہوئے نہیں پیدا کیا ہے۔ ہم نے انھیں نہیں پیدا کیا مگر حکمت و مصلحت کے ساتھ۔ مگر اکثر انسان ایسے ہیں جو اس حقیقت کا علم نہیں رکھتے۔''

پھر جا بجا اس ''تخلیق بالحق'' کی تشریح کی ہے۔ مثلاً ایک مقام پر ''تخلیق بالحق'' کے اس پہلو پر توجہ دلائی ہے کہ کائنات کی ہر چیز افادہ و فیضان کے لیے ہے اور فطرت چاہتی ہے کہ جو کچھ بنائے، اس طرح بنائے کہ اس میں وجود اور زندگی کے لیے نفع اور راحت ہو۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ط كُلٌّ يَّجْرِىْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ط اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ○ (۳۹:۵)

''اس نے آسمانوں اور زمین کو حکمت و مصلحت کے ساتھ پیدا کیا ہے اس نے رات اور دن کے اختلاف اور ظہور کا ایسا انتظام کر دیا کہ رات دن پر لپٹی جاتی ہے اور دن رات پر لپٹا آتا ہے اور سورج اور چاند دونوں کو اس

کی قدرت نے مسخر کر رکھا ہے سب (اپنی اپنی جگہ) اپنے مقررہ وقت
تک کے لیے گردش کر رہے ہیں۔ (سنو! وہ غالب اور بخشنے والا ہے)''

ایک دوسرے موقعہ پر خصوصیّت کے ساتھ اجرامِ سماویہ کے افادہ و فیضان پر توجہ دلائی ہے اور اسے ''تخلیق بالحق'' سے تعبیر کیا ہے۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَاءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابِ ط مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِکَ اِلَّا بِالْحَقِّ ط یُفَصِّلُ الْاٰیَاتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَo (۵:۱۰)

''وہ (کارفرمائے قدرت) جس نے سورج کو درخشندہ اور چاند کو روشن
بنایا اور پھر چاند کی گردش کے لیے منزلیں ٹھہرا دیں۔ تاکہ تم برسوں کی گنتی
اور (اوقات کا) حساب معلوم کر لو۔ بلاشبہ اللہ نے یہ سب کچھ پیدا نہیں کیا
مگر حکمت و مصلحت کے ساتھ۔ وہ ان لوگوں کے لیے جو جاننے والے
ہیں (علم و معرفت کی) نشانیاں الگ الگ کر کے واضح کر دیتا ہے۔''

ایک اور موقع پر فطرت کے جمال و زیبائی کی طرف اشارہ کیا ہے اور اسے ''تخلیق بالحق'' سے تعبیر کیا ہے، یعنی فطرتِ کائنات میں تحسین و آرائش کا قانون کام کر رہا ہے جو چاہتا ہے جو کچھ بنے' ایسا بنے کہ اس میں حسن و جمال اور خوبی و کمال ہو۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَکُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَکُمْo (۳:۶۴)

''اس نے آسمانوں اور زمین کو حکمت و مصلحت کے ساتھ پیدا کیا اور
تمھاری صورتیں بنائیں تو نہایت حسن و خوبی کے ساتھ بنائیں۔''

اسی طرح وہ قانونِ مجازات پر (یعنی جزا و سزا کے قانون پر) بھی اسی ''تخلیق بالحق'' سے استشہاد کرتا ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ دنیا میں ہر چیز کوئی نہ کوئی خاصہ اور نتیجہ رکھتی ہے اور تمام خواص اور نتائج لازمی اور اٹل ہیں۔ پھر کیونکر ممکن ہے کہ انسان کے اعمال میں بھی

اچھے اور برے خواص اور نتائج نہ ہوں اور وہ قطعی اور اٹل نہ ہوں۔ جو قانونِ فطرت دنیا کی ہر چیز میں اچھے برے کا امتیاز رکھتا ہے۔ کیا انسان کے اعمال میں اس امتیاز سے غافل ہو جائے گا۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْط سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ط وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ o (۴۵:۲۱-۲۲)

''جو لوگ برائیاں کرتے ہیں کیا وہ سمجھتے ہیں ہم انھیں ان لوگوں جیسا کر دیں گے جو ایمان لائے اور جن کے اعمال اچھے ہیں، یعنی دونوں برابر ہو جائیں زندگی میں بھی اور موت میں بھی (اگر ان لوگوں کے فہم و دانش کا فیصلہ یہی ہے تو) کیا ہی برا ان کا فیصلہ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو حکمت و مصلحت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اس لیے پیدا کیا ہے کہ ہر جان اپنی کمائی کے مطابق بدلا پائے اور ایسا نہیں ہوگا کہ ان کے ساتھ ناانصافی ہو۔''

معاد، یعنی مرنے کے بعد کی زندگی پر بھی اس سے جا بجا استشہاد کیا ہے، کائنات میں ہر چیز کوئی نہ کوئی مقصد اور منتہیٰ رکھتی ہے۔ پس ضروری ہے کہ انسانی وجود کے لیے بھی کوئی نہ کوئی مقصد اور منتہیٰ ہو۔ یہی منتہیٰ آخرت کی زندگی ہے، کیونکہ یہ تو نہیں ہوسکتا۔ کہ کائناتِ ارضی کی یہ بہترین مخلوق صرف اسی لیے پیدا کی گئی ہو کہ پیدا ہو اور چند دن جی کر فنا ہو جائے۔

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ط وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ o (۳۰:۸)

''کیا ان لوگوں نے کبھی اپنے دل میں اس بات پر غور نہیں کیا کہ اللہ نے

آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے محض بے کار وعبث نہیں
بنایا (بلکہ) ضروری ہے کہ حکمت ومصلحت کے ساتھ بنایا ہو اور اس کے
لیے ایک مقررہ وقت ٹھہرا دیا ہو۔ اصل یہ ہے کہ انسانوں میں بہت سے
لوگ ایسے ہیں جو اپنے پروردگار کی ملاقات سے یک قلم منکر ہیں۔"

غرض کہ قرآن کا مبدأ استدلال یہ ہے کہ:

مبدءِ استدلال

۱۔ اس کے نزول کے وقت دین داری اور خدا پرستی کے جس قدر عام تصورات موجود تھے وہ نہ صرف عقل کی آمیزش سے خالی تھے۔ بلکہ ان کی تمام تر بنیاد غیر عقلی عقائد پر آ کر ٹھہر گئی تھی، لیکن اس نے خدا پرستی کے لیے عقلی تصور پیدا کیا۔

۲۔ اس کی دعوت کی تمام تر بنیاد تعقل وتفکر پر ہے اور وہ خصوصیت کے ساتھ کائنات خلقت کے مطالعے وتفکر کی دعوت دیتا ہے۔

۳۔ وہ کہتا ہے: کائنات خلقت کے مطالعہ وتفکر سے انسان پر تخلیق بالحق کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ یعنی وہ دیکھتا ہے کہ اس کارخانۂ ہستی کی کوئی چیز نہیں جو کسی ٹھہرائے ہوئے مقصد اور مصلحت سے خالی ہو اور کسی بالاتر قانون خلقت کے ماتحت ظہور میں نہ آئی ہو۔ یہاں جو چیز بھی اپنا وجود رکھتی ہے ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ حکمتوں اور مصلحتوں کے عالمگیر سلسلے میں بندھی ہوئی ہے۔

۴۔ وہ کہتا ہے کہ جب انسان ان مقاصد ومصالح پر غور کرے گا تو عرفان حقیقت کی راہ خود بخود اس پر کھل جائے گی۔ اور وہ جہل وکوری کی گمراہیوں سے نجات پا جائے گا۔

برہانِ ربوبیّت

چنانچہ اس سلسلے میں اس نے مظاہرِ کائنات کے جن مقاصد ومصالح سے استدلال کیا ہے ان میں سب سے زیادہ عام استدلال "ربوبیت" کا استدلال ہے اور اسی لیے ہم

اسے برہانِ ربوبیت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ وہ کہتا ہے: کائنات کے تمام اعمال ومظاہر کا اس طرح واقع ہونا کہ ہر چیز پرورش کرنے والی، ہر تاثیر زندگی بخشنے والی ہے اور پھر ایک ایسے نظام ربوبیت کا موجود ہونا جو ہر حالت کی رعایت کرتا اور ہر طرح کی مناسبت ملحوظ رکھتا ہے' ہر انسان کو وجدانی طور پر یقین دلا دیتا ہے کہ ایک پروردگارِ عالم ہستی موجود ہے اور وہ ان تمام صفتوں سے متصف ہے جن کے بغیر نظام ربوبیّت کا یہ کامل اور بے عیب کارخانہ وجود میں نہیں آ سکتا تھا۔

وہ کہتا ہے: کیا انسان کا وجدان یہ باور کرسکتا ہے کہ نظام ربوبیت کا یہ پورا کارخانہ خود بخود وجود میں آ جائے۔اور کوئی زندگی' کوئی ارادہ' کوئی حکمت اس کے اندر کارفرمانہ ہو؟ کیا یہ ممکن ہے کہ اس کارخانۂ ہستی کی ہر چیز میں ایک بولتی ہوئی پروردگاری یا ایک ابھری ہوئی کارسازی موجود ہو۔مگر کوئی پروردگار' کوئی کارساز موجود نہ ہو؟ پھر کیا یہ محض ایک اندھی بہری فطرت' بے جان مادہ اور بے حس الیکٹرون Electrone کے خواص ہیں جن سے پروردگاری و کارسازی کا یہ پورا کارخانہ ظہور میں آ گیا ہے اور عقل اور ارادہ رکھنے والی کوئی ہستی موجود نہیں؟

پروردگاری موجود ہے مگر کوئی پروردگار موجود نہیں! کارسازی موجود ہے مگر کوئی کار ساز موجود نہیں! رحمت موجود ہے مگر کوئی رحیم نہیں! حکمت موجود ہے مگر کوئی حکیم موجود نہیں! سب کچھ موجود ہے مگر کوئی موجود نہیں! عمل بغیر کسی عامل کے، نظام بغیر کسی ناظم کے' قیام بغیر قیوم کے' عمارت بغیر کسی معمار کے' نقش بغیر کسی نقاش کے' کیا یہ سب کچھ بغیر کسی موجود کے وجود میں آ سکتا ہے؟ نہیں' انسان کی فطرت کبھی یہ باور نہیں کر سکتی۔ اس کا وجدان پکارتا ہے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں۔اس کی فطرت اپنی بناوٹ میں ایک ایسا سانچا لے کر آئی ہے جس میں یقین وایمان ہی ڈھل سکتا ہے' شک اور انکار کی اس میں سمائی نہیں!

قرآن کہتا ہے: یہ بات انسان کے وجدانی اذعان کے خلاف ہے کہ وہ نظام ربوبیّت کا مطالعہ کرے اور ایک رب العالمین ہستی کا یقین اس کے اندر جاگ نہ اٹھے وہ

کہتا ہے: ایک انسان غفلت کی سرشاری اور سرکشی کے ہیجان میں ہر چیز سے انکار کرسکتا ہے۔لیکن اپنی فطرت سے انکار نہیں کرسکتا۔ وہ ہر چیز کے خلاف جنگ کرسکتا ہے لیکن اپنی فطرت کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھا سکتا۔ وہ جب اپنے چاروں طرف زندگی اور پروردگاری کا ایک عالمگیر کارخانہ پھیلا ہوا دیکھتا ہے تو اس کی فطرت کی صدا کیا ہوتی ہے؟ اس کے دل کے ایک ایک ریشے میں کون سا اعتقاد سمایا ہوا ہوتا ہے؟ کیا یہی نہیں ہوتا کہ ایک پروردگار ہستی موجود ہے اور یہ سب کچھ اسی کی کرشمہ سازیاں ہیں؟

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن کا اسلوبِ بیان یہ نہیں ہے کہ نظری مقدمات اور ذہنی مسلّمات کی شکلیں ترتیب دے۔ پھر اس پر بحث وتقریر کرکے مخاطب کو ردّ وتسلیم پر مجبور کرے۔ اس کا تمام تر خطاب انسان کے فطری وجدان وذوق سے ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے خدا پرستی کا جذبہ انسانی فطرت کا خمیر ہے۔ اگر ایک انسان اس سے انکار کرنے لگتا ہے تو یہ اس کی غفلت ہے اور ضروری ہے کہ اسے غفلت سے چونکا دینے کے لیے دلیلیں پیش کی جائیں لیکن یہ دلیل ایسی نہیں ہونی چاہیے جو محض ذہن ودماغ میں کاوش پیدا کردے بلکہ ایسی ہونی چاہیے جو اس کے نہاں خانۂ دل پر دستک دے دے اور اس کا فطری وجدان بیدار کردے۔ اگر اس کا وجدان بیدار ہوگیا تو پھر اثباتِ مدّعا کے لیے بحث وتقریر کی ضرورت نہ ہوگی۔ خود اس کا وجدان ہی اسے مدّعا تک پہنچائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن خود انسان کی فطرت ہی سے انسان پر حجت لاتا ہے۔

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌۙ وَّ لَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗؕ

(۷۵:۱۴۔۱۵)

”بلکہ انسان کا وجود خود اس کے خلاف (یعنی اس کی کج اندیشیوں کے خلاف) حجت ہے اگرچہ وہ (اپنے وجدان کے خلاف) کتنے ہی عذر بہانے تراش لیا کرے۔“

اور اسی لیے وہ جا بجا فطرت انسانی کو مخاطب کرتا ہے اور اس کی گہرائیوں سے

جواب طلب کرتا ہے:

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ط اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ط وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ط فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَo فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ فَمَا ذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَo (۱۰:۳۱-۳۲)

''(اے پیغمبر! ان سے کہو) وہ کون ہے جو آسمان (میں پھیلے ہوئے کارخانۂ حیات) سے اور زمین (کی وسعت میں پیدا ہونے والے سامان رزق) سے تمھیں روزی بخش رہا ہے؟ وہ کون ہے جس کے قبضہ میں تمھارا سننا اور دیکھنا ہے؟ وہ کون ہے جو بے جان سے جان دار کو اور جان دار سے بے جان کو نکالتا ہے اور پھر وہ کون سی ہستی ہے جو یہ تمام کارخانۂ خلقت اس نظم و نگرانی کے ساتھ چلا رہی ہے؟ (اے پیغمبر!) یقیناً وہ (بے اختیار) بول اٹھیں گے: اللہ ہے (اس کے سوا کون ہو سکتا ہے؟) اچھا تم ان سے کہو: جب تمھیں اس بات سے انکار نہیں تو پھر یہ کیوں ہے کہ غفلت و سرکشی سے نہیں بچتے؟ ہاں بے شک یہ اللہ ہی ہے جو تمھارا پروردگارِ برحق ہے۔ اور جب یہ حق ہے تو حق کے ظہور کے بعد اسے نہ ماننا گمراہی نہیں تو اور کیا ہے؟ افسوس تمھاری سمجھ پر تم (حقیقت سے منہ پھرائے) کہاں جا رہے ہو؟''

ایک دوسرے موقع پر فرمایا۔

اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْبِتُوْا شَجَرَهَا ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَo اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ جَعَلَ خِلٰلَهَآ

اَنْهٰرًا وَّ جَعَلَ لَهَا رَوَاسِیَ وَجَعَلَ بَیْنَ الْبَحْرَیْنِ حَاجِزًاo ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِط بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَo (۲۷: ۶۱۔۶۰)

''وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور جس نے آسمانوں سے تمھارے لیے پانی برسایا۔ پھر اس آبپاشی سے خوشنما باغ اگا دیئے حالانکہ تمھارے بس کی یہ بات نہ تھی کہ ان باغوں کے درخت اگاتے کیا ان کاموں کا کرنے والا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود بھی ہے؟ (افسوس ان لوگوں کی سمجھ پر! حقیقت حال کتنی ہی ظاہر ہو) مگر یہ وہ لوگ ہیں جن کا شیوہ ہی کج روی ہے۔

اچھا بتاؤ! اور کون ہے جس نے زمین کو (زندگی و معیشت کا) ٹھکانا بنا دیا اس کے درمیان نہریں جاری کر دیں، اس (کی درستگی) کے لیے پہاڑ بلند کر دیے اور دریاؤں میں (یعنی دریا اور سمندر میں ایسی) دیوار حائل کر دی (کہ دونوں اپنی اپنی جگہ محدود رہتے ہیں) کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا بھی ہے؟ (افسوس! کتنی واضح بات ہے) مگر ان لوگوں میں اکثر ایسے ہیں، جو نہیں جانتے۔''

اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَیَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَیَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِط ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِیْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَo اَمَّنْ یَّهْدِیْكُمْ فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ یُّرْسِلُ الرِّیَاحَ بُشْرًا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِط تَعٰلَی اللّٰهُ عَمَّا یُشْرِكُوْنَo (۲۷۔۶۲۔۶۳)

''اچھا بتاؤ! وہ کون ہے جو بے قرار دلوں کی پکار سنتا ہے۔ جب وہ (ہر طرف سے مایوس ہو کر) اسے پکارنے لگتے ہیں اور ان کا دکھ درد ٹال دیتا ہے، اور وہ کہ اس نے تمھیں زمین کا جانشین بنایا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ

کوئی دوسرا بھی ہے؟ (افسوس تمھاری غفلت پر) بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ تم
نصیحت پذیر ہو!

(اچھا بتاؤ!) وہ کون ہے جو صحراؤں اور سمندروں کی تاریکیوں میں
تمھاری رہنمائی کرتا ہے؟ وہ کون ہے جو بارانِ رحمت سے پہلے خوش
خبری دینے والی ہوائیں چلا دیتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا بھی
معبود ہے؟ (ہرگز نہیں) اللہ کی ذات اس ساجھے سے پاک و منزہ ہے جو
یہ لوگ اس کی معبودیّت میں ٹھہرا رہے ہیں۔"

اَمَّنْ يَّبْدَءُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ
وَالْاَرْضِ ط ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ط قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِيْنَ o (۶۴:۲۷)

"اچھا بتاؤ! وہ کون ہے جو مخلوقات کی پیدائش شروع کرتا ہے اور پھر اسے
دہراتا ہے اور وہ کون ہے جو آسمان و زمین کے کارخانہ ہائے رزق سے
تمھیں روزی دے رہا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود بھی ہے؟
(اے پیغمبرؐ!) ان سے کہو اگر تم (اپنے رویے میں) سچے ہو (اور انسانی
عقل و بصیرت کی اس عالمگیر شہادت کے خلاف تمھارے پاس کوئی دلیل
ہے) تو اپنی دلیل پیش کرو۔"

ان سوالات میں سے ہر سوال اپنی جگہ ایک مستقل دلیل ہے، کیونکہ ان میں سے ہر
سوال کا صرف ایک ہی جواب ہو سکتا ہے اور وہ فطرت انسانی کا عالمگیر اور مسلمہ اذعان
ہے۔ ہمارے متکلموں کی نظر اس پہلو پر نہ تھی اس لیے قرآن کا اسلوب استدلال ان پر
واضح نہ ہو سکا اور دور دراز گوشوں میں بھٹک گئے۔

بہرحال قرآن کے وہ بے شمار مقامات، جن میں کائنات ہستی کے سروسامان پرورش
اور نظامِ ربوبیّت کی کارسازیوں کا ذکر کیا گیا ہے، دراصل اسی استدلال پر مبنی ہیں۔

فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ إِلٰى طَعَامِهٖ ۝ أَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ۝ ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا ۝ فَأَنْبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا وَّ عِنَبًا وَّ قَضْبًا وَّ زَيْتُوْنًا وَّ نَخْلًا وَّ حَدَائِقَ غُلْبًا وَّ فَاكِهَةً وَّ أَبًّا مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ ط (۸۰:۲۴-۳۲)

''انسان اپنی غذا پر نظر ڈالے (جو شب و روز اس کے استعمال میں آتی رہتی ہے) ہم پہلے زمین پر پانی برساتے ہیں' پھر اس کی سطح شق کر دیتے ہیں۔ پھر اس کی روئیدگی سے طرح طرح کی چیزیں پیدا کر دیتے ہیں اناج کے دانے' انگور کی بیلیں' کھجور کے خوشے، سبزی' ترکاری' زیتون کا تیل' درختوں کے جھنڈ' قسم قسم کے میوے' طرح طرح کا چارہ (اور یہ سب کچھ کس کے لیے؟) تمھارے فائدے کے لیے اور تمھارے جانوروں کے لیے!''

ان آیات میں ''فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ'' کے زور پر غور کرو۔ انسان کتنا ہی غافل ہو جائے اور کتنا ہی اعراض کرے' لیکن دلائل حقیقت کی وسعت اور ہمہ گیری کا یہ حال ہے کہ کسی حال میں بھی اس سے اوجھل نہیں ہو سکتیں۔ ایک انسان تمام دنیا کی طرف سے آنکھیں بند کر لے' لیکن بہرحال اپنی شب و روز کی غذا کی طرف سے تو آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔ جو غذا اس کے سامنے دھری ہے اسی پر نظر ڈال لیے۔ یہ کیا ہے؟ گیہوں کا دانہ ہے۔ اچھا! گیہوں کا ایک دانہ اپنی ہتھیلی پر رکھ لو اور اس کی پیدائش سے لے کر اس کی پختگی و تکمیل تک کے تمام احوال و ظروف پر غور کرو۔ کیا یہ حقیر سا ایک دانہ بھی وجود میں آ سکتا تھا۔ اگر تمام کارخانۂ ہستی ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ اس کی بناوٹ میں سرگرم نہ رہتا؟ اور اگر دنیا میں ایک ایسا نظام رَبوبیّت موجود ہے تو کیا یہ ہو سکتا ہے کہ ربوبیّت رکھنے والی ہستی موجود نہ ہو؟

سورہ نحل میں یہی استدلال ایک دوسرے پیرائے میں نمودار ہوا ہے۔

وَاِنَّ لَکُمْ فِیْ الْاَنْعَامِ لَعِبْرَۃً ط نُسْقِیْکُمْ مِّمَّا فِیْ بُطُوْنِہٖ مِنْ م بَیْنِ فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشَّارِبِیْنَo وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِیْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْہُ سَکَرًا وَّ رِزْقًا حَسَنًاo اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَo وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ ثُمَّ کُلِیْ مِنْ کُلِّ الثَّمَرَاتِ فَاسْلُکِیْ سُبُلَ رَبِّکِ ذُلُلاً ط یَخْرُجُ مِنْ م بُطُوْنِہَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُہٗ فِیْہِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ط اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَo (۱۶:۶۶۔۶۹)

''اور (دیکھو! یہ) چار پایے (جنھیں تم پالتے ہو) ان میں تمھارے لیے غور کرنے اور نتیجہ نکالنے کی کتنی عبرت ہے؟ ان کے جسم سے ہم خون و کثافت کے درمیان دودھ پیدا کر دیتے ہیں جو پینے والوں کے لیے بےغل وغش مشروب ہوتا ہے (اسی طرح) کھجور اور انگور کے پھل ہیں جن سے نشہ کا عرق اور اچھی غذا دونوں طرح کی چیزیں حاصل کرتے ہو۔ بلاشبہ اس بات میں اربابِ عقل کے لیے (ربوبیّت الٰہی کی) بڑی ہی نشانی ہے! اور پھر دیکھو تمھارے پروردگار نے شہد کی مکھی کی طبیعت میں یہ بات ڈال دی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور ان ٹٹیوں میں جو اس غرض سے بلند کر دی جاتی ہیں' اپنے لیے گھر بنائے پھر ہر طرح کے پھولوں سے رس چوسے' پھر اپنے پروردگار کے ٹھہرائے ہوئے طریقوں پر کامل فرماں برداری کے ساتھ گام زن ہو (چنانچہ تم دیکھتے ہو کہ) اس کے جسم سے مختلف رنگوں کا رس نکلتا ہے۔ جس میں انسان کے لیے شفا ہے بلاشبہ اس بات میں ان لوگوں کے لیے جو غور وفکر کرتے ہیں (ربوبیّت الٰہی کی عجائب آفرینیوں کی) بڑی ہی نشانی ہے۔''

جس طرح اس نے جا بجا خلقت سے استدلال کیا ہے' یعنی دنیا میں ہر چیز مخلوق ہے، اس لیے ضروری ہے کہ خالق بھی ہو، اسی طرح سے وہ ربوبیّت سے بھی استدلال کرتا ہے، یعنی دنیا میں ہر چیز مربوب ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ کوئی رب بھی ہو اور دنیا میں ربوبیّت کامل اور بے داغ ہے' اس لیے ضروری ہے کہ وہ رب کامل اور بے عیب ہو۔

زیادہ واضح لفظوں میں اسے یوں ادا کیا جا سکتا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں دنیا میں ہر چیز ایسی ہے کہ اسے پرورش کی احتیاج ہے اور اسے پرورش مل رہی ہے۔ پس ضروری ہے کہ کوئی پرورش کرنے والا بھی موجود ہو۔ یہ پرورش کرنے والا کون ہے؟ یقیناً وہ نہیں ہو سکتا جو خود پروردہ اور محتاج پروردگاری ہو' قرآن میں جہاں کہیں اس طرح کے مخاطبات ہیں' جیسا کہ سورہ واقعہ کی مندرجہ ذیل آیت میں ہے' وہ اسی استدلال پر مبنی ہیں:

اَفَرَءَ يْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ۝ ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ۝ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ۝ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ۝ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ۝ (۵۶۔۶۳ تا ۶۷)

''اچھا! تم نے اس بات پر غور کیا کہ جو کچھ تم کشت کاری کرتے ہو اسے تم اگاتے ہو یا ہم اگاتے ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اسے چورا چورا کر دیں اور تم صرف یہ کہنے کے لیے رہ جاؤ کہ ''افسوس! ہمیں تو اس نقصان کا تاوان ہی دینا پڑے گا بلکہ ہم تو اپنی محنت کے سارے فائدوں ہی سے محروم ہو گئے۔''

اَفَرَءَ يْتُمُ الْمَآءَ الَّذِیْ تَشْرَبُوْنَ ۝ ءَ اَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ۝ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْ لَا تَشْكُرُوْنَ ۝ اَفَرَءَ يْتُمُ النَّارَ الَّتِیْ تُوْرُوْنَ ۝ ءَ اَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُوْنَ ۝ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ ۝ (۵۶:۶۸۔۷۳)

''اچھا! تم نے یہ بات بھی دیکھی کہ یہ پانی جو تمھارے پینے میں آتا ہے

اسے کون برساتا ہے؟ تم برساتے ہو یا ہم برساتے ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اسے (سمندر کے پانی کی طرح) کڑوا کر دیں۔ پھر کیا اس نعمت کے لیے ضروری نہیں کہ تم شکر گزار ہو؟ اچھا! تم نے یہ بات بھی دیکھی کہ یہ آگ جو تم سلگاتے ہو تو اس کے لیے لکڑی تم نے پیدا کی ہے یا ہم پیدا کر رہے ہیں؟ ہم نے اسے یادگار اور مسافروں کے لیے فائدہ بخش بنایا۔"

نظم ربوبیّت سے توحید پر استدلال

اسی طرح وہ نظام ربوبیّت سے توحید الٰہی پر استدلال کرتا ہے جو رب العالمین تمام کائنات کی پرورش کر رہا ہے اور جس کی ربوبیّت کا اعتراف تمھارے دل کے ایک ایک ریشے میں موجود ہے۔ اس کے سوا کون اس کا مستحق ہوسکتا ہے کہ بندگی و نیاز کا سر اس کے آگے جھکایا جائے؟

يَاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَاءَ بِنَآءً وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ٥ (۲:۲۱-۲۲)

"اے افرادِ نسل انسانی! اپنے پروردگار کی عبادت کرو، اس پروردگار کی جس نے تمھیں پیدا کیا اور ان سب کو بھی پیدا کیا جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں اور اس لیے پیدا کیا تاکہ تم برائیوں سے بچو۔ وہ پروردگار عالم جس نے تمھارے لیے زمین فرش کی طرح بچھا دی اور آسمان چھت کی طرح بنا دیا اور آسمان سے پانی برسایا پھر اس سے طرح طرح کے پھل پیدا کر دیے تاکہ تمھارے لیے رزق کا سامان ہو۔ پس (جب خالقیت اسی کی خالقیّت ہے اور ربوبیّت اسی کی ربوبیت تو) ایسا نہ کرو کہ کسی دوسری ذات کو اس کا ہم پلہ ٹھہراؤ اور تم اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو!"

یا مثلاً سورۂ فاطر میں ہے:

یٰٓاَ یُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ○ (۳:۳۵)

''اے افرادِ نسلِ انسانی! اللہ نے اپنی جن نعمتوں سے تمھیں فیض یاب کیا ہے ان پر غور کرو! کیا اللہ کے سوا کوئی دوسرا بھی خالق ہے جو تمھیں زمین اور آسمان کی بخشائشوں سے رزق دے رہا ہے؟ نہیں کوئی معبود نہیں ہے مگر اسی کی ایک ذات! (پھر تم (اس سے روگردانی کر کے) کدھر بہکے چلے جا رہے ہو۔)''

نظامِ ربوبیّت سے وحی و رسالت کی ضرورت پر استدلال

اسی طرح وہ نظام ربوبیت کے اعمال سے انسانی سعادت و شقاوت کے معنوی قوانین اور وحی و رسالت کی ضرورت پر بھی استدلال کرتا ہے۔ جس رب العالمین نے تمھاری پرورش کے لیے ربوبیّت کا ایسا نظام قائم کر رکھا ہے' کیا ممکن ہے کہ اس نے تمھاری روحانی فلاح و سعادت کے لیے کوئی قانون' کوئی نظام' کوئی قاعدہ مقرر نہ کیا ہو؟ جس طرح تمھارے جسم کی ضرورتیں ہیں اسی طرح تمھاری روح کی بھی ضرورتیں ہیں۔ پھر کیونکر ممکن ہے کہ جسم کی نشو ونما کے لیے تو اس کے پاس سب کچھ ہو۔ لیکن روح کی نشو و نما کے لیے اس کے پاس کوئی پروردگاری نہ ہو؟

اگر وہ رب العالمین ہے اور اس کی ربوبیّت کے فیضان کا یہ حال ہے کہ ہر ذرہ کے لیے سیرابی اور ہر چیونٹی کے لیے کارسازی رکھتی ہے تو کیونکر باور کیا جا سکتا ہے کہ انسان کی روحانی سعادت کے لیے اس کے پاس کوئی سرچشمگی نہ ہو؟ اس کی پروردگاری اجسام کی پرورش کے لیے آسمان سے پانی برسائے لیکن ارواح کی پرورش کے لیے ایک قطرۂ فیض بھی نہ رکھے؟ تم دیکھتے ہو کہ جب زمین شادابی سے محروم ہو کر مردہ ہو جاتی ہے تو یہ اس کا قانون ہے کہ بارانِ رحمت نمودار ہوتی اور زندگی کی برکتوں سے زمین کے ایک ایک

ذرے کو مالا مال کر دیتی ہے۔ پھر کیا یہ ضروری نہیں کہ جب عالم انسانیت ہدایت وسعادت کی شادابیوں سے محروم ہو جائے تو اس کی بارانِ رحمت نمودار ہو کر ایک ایک روح کو پیامِ زندگی پہنچادے؟ روحانی سعادت کی یہ بارش کیا ہے؟ وہ کہتا ہے وحی الٰہی ہے۔ تم اس منظر پر کبھی متعجب نہیں ہوتے کہ پانی برسا اور مردہ زمین زندہ ہوگئی۔ پھر اس بات پر کیوں چونک اٹھو کہ وحی الٰہی ظاہر ہوئی اور مردہ روحوں میں زندگی کی جنبش پیدا ہوگئی۔

حٰمٓ تَنۡزِيۡلُ الۡكِتَابِ مِنَ اللّٰهِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَكِيۡمِ ٥ اِنَّ فِيۡ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰيٰتٍ لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ ٥ وَ فِيۡ خَلۡقِكُمۡ وَمَا يَبُثُّ مِنۡ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوۡمٍ يُّوۡقِنُوۡنَ ٥ وَاخۡتِلَافِ الَّيۡلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ رِّزۡقٍ فَاَحۡيَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَتَصۡرِيۡفِ الرِّيَاحِ اٰيٰتٌ لِّقَوۡمٍ يَّعۡقِلُوۡنَ ٥ تِلۡكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتۡلُوۡهَا عَلَيۡكَ بِالۡحَقِّ فَبِاَيِّ حَدِيۡثٍ بَعۡدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤۡمِنُوۡنَ ٥ (۴۵:۱-۶)

''یہ اللہ کی طرف سے کتاب (ہدایت) نازل کی جاتی ہے جو عزیز اور حکیم ہے۔ بلاشبہ ایمان رکھنے والوں کے لیے آسمانوں اور زمین میں (معرفت حق کی) بے شمار نشانیاں ہیں۔ نیز تمھاری پیدائش میں اور ان چارپایوں میں جنھیں اس نے زمین میں پھیلا رکھا ہے۔ ارباب یقین کے لیے بڑی ہی نشانیاں ہیں۔ اسی طرح رات اور دن کے یکے بعد دیگرے آتے رہنے میں اور اس سرمایہ رزق میں جسے وہ آسمان سے برساتا ہے اور زمین مرنے کے بعد پھر جی اٹھتی ہے اور ہواؤں کے ردّ و بدل میں ارباب دانش کے لیے بڑی ہی نشانیاں ہیں (اے پیغمبر!) یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو فی الحقیقت ہم تمھیں سنا رہے ہیں۔ پھر اللہ اور اس کی آیتوں کے بعد کون سی بات رہ گئی ہے۔ جسے سن کر یہ لوگ ایمان لائیں گے؟''

سورۂ انعام میں ان لوگوں کا جو وحی الٰہی کے نزول پر متعجب ہوتے ہیں ان لفظوں میں ذکر کیا ہے:

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ. (۹۱:۶)

''اور اللہ کے کاموں کی انہیں جو قدر شناسی کرنی تھی یقیناً انہوں نے نہیں کی جب انہوں نے یہ بات کہی کہ اللہ نے اپنے کسی بندے پر کوئی چیز نازل نہیں کی۔''

پھر تورات اور قرآن کے نزول کے ذکر کے بعد حسب ذیل بیان شروع ہو جاتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ط يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ مُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ط ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ٥ فَالِقُ الْاِصْبَاحِ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ط ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ٥ (الانعام۔۹۵۔۹۶)

''یقیناً یہ اللہ ہی کی کارفرمائی ہے کہ وہ دانے اور گٹھلی کو شق کرتا ہے (اور اس سے ہر چیز کا درخت پیدا کر دیتا ہے) وہ زندہ کو مردہ چیز سے نکالتا اور مردہ کو زندہ اشیاء سے نکالنے والا ہے۔ ہاں وہی تمھارا خدا ہے' پھر تم (اس سے روگردانی کر کے) کدھر کو بہکے چلے جا رہے ہو۔'' ہاں! وہی پردۂ شب چاک کر کے صبح کی روشنی نمودار کرنے والا ہے۔ وہی ہے جس نے رات کو راحت وسکون کا ذریعہ بنا دیا اور وہی ہے کہ اس نے سورج اور چاند کی گردش اس درستگی کے ساتھ قائم کر دی کہ حساب کا معیار بن گئی۔ یہ اس عزیز وعلیم کا ٹھہرایا ہوا اندازہ ہے۔''

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ط قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ٥ (۹۷:۶)

''اور پھر دیکھو وہی ہے جس نے تمھارے لیے ستارے پیدا کر دیے تاکہ
خشکی و تری کی تاریکیوں میں ان سے رہنمائی پاؤ۔ بلاشبہ ان لوگوں کے
لیے جو جاننے والے ہیں ہم نے دلیلیں کھول کھول کر بیان کر دی ہیں!''

یعنی جس پروردگارِ عالم کی ربوبیّت و رحمت کا یہ تمام فیضان شب و روز دیکھ رہے ہو' کیا یہ ممکن ہے کہ وہ تمھاری جسمانی پرورش و ہدایت کے لیے تو یہ سب کچھ کرے' لیکن تمھاری روحانی پرورش و ہدایت کے لیے اس کے پاس کوئی سر و سامان نہ ہو؟ وہ زمین کی موت کو زندگی سے بدل دیتا ہے۔ پھر کیا تمھاری روح کی موت کو زندگی سے نہیں بدل دے گا؟ وہ ستاروں کی روشن علامتوں سے خشکی و تری کی ظلمتوں میں رہ نمائی کرتا ہے' کیونکر ممکن ہے کہ تمھاری روحانی زندگی کی تاریکیوں میں رہ نمائی کی کوئی روشنی نہ ہو؟ تم جو کبھی اس پر متعجب نہیں ہوتے کہ زمین پر کھیت لہلہا رہے ہیں اور آسمان میں تارے چمک رہے ہیں کیوں اس بات پر متعجب ہوتے ہو کہ خدا کی وحی نوعِ انسانی کی ہدایت کے لیے نازل ہو رہی ہے؟ اگر تمھیں تعجب ہوتا ہے تو یہ اس بات کا نتیجہ ہے کہ تم نے خدا کو اس کی صفات میں اس طرح نہیں دیکھا ہے جس طرح دیکھنا چاہیے۔ تمھاری سمجھ میں یہ بات تو آ جاتی ہے کہ وہ ایک چیونٹی کی پرورش کے لیے یہ پورا کارخانۂ حیات سرگرم رکھے' مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ نوعِ انسانی کی ہدایت کے لیے سلسلۂ وحی و تنزیل قائم ہو۔

نظامِ ربوبیّت سے وجودِ معاد پر استدلال

اسی طرح وہ اعمالِ ربوبیّت سے معاد اور آخرت پر بھی استدلال کرتا ہے۔ جو چیز جتنی زیادہ نگرانی اور اہتمام سے بنائی جاتی ہے اتنا ہی زیادہ قیمتی استعمال اور اہم مقصد بھی رکھتی ہے۔ اور بہتر صنّاع وہی ہے جو اپنی صنعت گری کا بہتر استعمال اور مقصد رکھتا ہو۔ پس انسان جو کرۂ ارضی کی بہترین مخلوق اور اس کے تمام سلسلہ خلقت کا خلاصہ ہے اور جس کی جسمانی و معنوی نشو و نما کے لیے فطرت کائنات نے اس قدر اہتمام کیا ہے۔ کیونکر ممکن ہے کہ محض دنیا کی چند روزہ زندگی کے لیے ہی بنایا گیا ہو جو اس کے سوا کوئی بہتر استعمال

اور بلند تر مقصد نہ رکھتا ہو؟ پھر اگر خالق کائنات ''رب'' ہے اور کامل درجے کی ربوبیّت رکھتا ہے تو کیونکر باور کیا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنے ایک بہترین مربوب یعنی پروردہ ہستی کو محض اس لیے بنایا ہو کہ مہمل اور بے نتیجہ چھوڑ دے۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَo فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِo (۲۳:۱۱۵-۱۱۶)

''کیا تم نے ایسا سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تمھیں بغیر کسی مقصد و نتیجہ کے پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹنے والے نہیں؟ اللہ جو اس کائناتِ ہستی کا حقیقی حکمران ہے اس سے بہت بلند ہے کہ ایک بے کار و عبث فعل کرے۔ کوئی معبود نہیں ہے مگر وہ جو (جہاں داری کے) عرشِ بزرگ کا پروردگار ہے۔''

ہم نے یہ مطلب اسی سادہ طریقہ پر بیان کر دیا جو قرآن کے بیان و خطاب کا طریقہ ہے لیکن یہی مطلب علمی بحث و تقریر کے پیرائے میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ وجودِ انسانی کرۂ ارضی کے سلسلہ خلقت کی آخری اور اعلیٰ ترین کڑی ہے۔ اور اگر پیدائشِ حیات سے لے کر انسانی وجود کی تکمیل تک کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ایک ناقابل شمار مدت کے مسلسل نشو و ارتقاء کی تاریخ ہو گی۔ گویا فطرت نے لاکھوں کروڑوں برس کی کارفرمائی و صنّاعی سے کرۂ ارضی پر جو اعلیٰ ترین وجود تیار کیا ہے وہ انسان ہے۔

ماضی کے ایک نقطۂ بعید کا تصور کرو! جب ہمارا یہ کرّہ سورج کے ملتہب کرّے سے الگ ہوا تھا۔ نہیں معلوم کتنی مدت اس کے ٹھنڈے اور معتدل ہونے میں گزر گئی اور یہ اس قابل ہوا کہ زندگی کے عناصر اس میں نشو و نما پا سکیں۔ اس کے بعد وہ وقت آیا جب اس کی سطح پر نشو و نما کی سب سے پہلی داغ بیل پڑی اور پھر نہیں معلوم کتنی مدت کے بعد زندگی کا وہ اولین بیج وجود میں آ سکا جسے پروٹو پلازم Protoplasm کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا

ہے۔ پھر حیاتِ عضوی کے نشو ونما کا دور شروع ہوا اور نہیں معلوم کتنی مدت اس پر گزر گئی کہ اس دور نے بسیط سے مرکب تک اور ادنیٰ سے اعلیٰ درجے تک ترقی کی منزلیں طے کیں۔ یہاں تک کہ حیوانات کی ابتدائی کڑیاں ظہور میں آئیں اور پھر لاکھوں برس اس میں نکل گئے کہ یہ سلسلہ ارتقاء وجود انسانی تک مرتفع ہوا۔ پھر انسان کے جسمانی ظہور کے بعد اس کے ذہنی ارتقاء کا سلسلہ شروع ہوا اور ایک طول طویل مدت اس پر گزر گئی! بالآخر ہزاروں برس کے اجتماعی اور ذہنی ارتقاء کے بعد وہ انسان ظہور پذیر ہو سکا جو کرۂ ارضی کے تاریخی عہد کا متمدّن اور عقیل انسان ہے!

گویا زمین کی پیدائش سے لے کر ترقی یافتہ انسان کی تکمیل تک جو کچھ گزر چکا ہے اور جو کچھ بنتا سنورتا رہا ہے' وہ تمام تر انسان کی پیدائش و تکمیل ہی کی سرگزشت ہے!

سوال یہ ہے کہ جس وجود کی پیدائش کے لیے فطرت نے اس درجہ اہتمام کیا ہے' کیا یہ سب کچھ صرف اس لیے تھا کہ وہ پیدا ہو' کھائے پیئے اور مر کر فنا ہو جائے؟

فَتَعَالَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ٥ (۲۳:۱۱۶)

قدرتی طور پر یہاں ایک دوسرا سوال بھی پیدا ہو جاتا ہے' اگر وجود حیوانی اپنے ماضی میں ہمیشہ یکے بعد دیگرے متغیر ہوتا اور ترقی کرتا رہا ہے تو مستقبل میں بھی یہ تغیر و ارتقاء کیوں جاری نہ رہے۔ اگر اس بات پر ہمیں بالکل تعجب نہیں ہوتا کہ ماضی میں بے شمار صورتیں مٹیں اور نئی زندگیاں ظہور میں آئیں تو اس بات پر کیوں تعجب ہو کہ موجودہ زندگی کا مٹنا بھی بالکل مٹ جانا نہیں ہے' اس کے بعد بھی ایک اعلیٰ تر صورت اور زندگی ہے۔

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ٥ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ٥ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ٥ (۷۵:۳۶۔۳۸)

''کیا انسان خیال کرتا ہے کہ وہ مہمل چھوڑ دیا جائے گا۔ (اور اس زندگی کے بعد دوسری زندگی نہ ہوگی؟) کیا اس پر یہ حالت نہیں گزر چکی ہے کہ

پیدائش سے پہلے نطفہ تھا' پھر نطفہ سے علقہ ہوا (یعنی جونک کی سی شکل ہو گئی) پھر علقہ سے (اس کا ڈیل ڈول) پیدا کیا گیا' پھر (اس ڈیل ڈول کو) ٹھیک ٹھیک درست کیا گیا!''

سورۃ الذّاریات میں تمام تر ''دین'' یعنی جزا کا بیان ہے:۔

اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌo (۵۱:۵-۶)

اور پھر اس پر اعمال ربوبیت سے یعنی ہواؤں کے چلنے اور پانی برسنے کے مؤثرات سے استشہاد کیا گیا ہے: وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًاo (۵۱:۱-۴)

پھر آسمان اور زمین کی بخشایشوں پر اور خود وجود انسانی کی اندرونی شہادتوں پر توجہ دلائی ہے۔ وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَo وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَo وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ. (۵۱-۲۰-۲۲)

اس کے بعد فرمایا:

فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَo (۵۱:۲۳)

''آسمان اور زمین کے رب کی قسم (یعنی آسمان و زمین کے پروردگار کی پروردگاری شہادت دے رہی ہے) کہ بلاشبہ وہ معاملہ (یعنی جزا و سزا کا معاملہ) حق ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح یہ بات کہ تم گویائی رکھتے ہو۔''

اس آیت میں اثبات جزا کے لیے خدا نے خود اپنے وجود کی قسم کھائی ہے لیکن ''رب'' کے لفظ سے اپنے آپ کو تعبیر کیا ہے۔ عربی میں قسم کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی بات پر کسی بات سے شہادت لائی جائے۔ پس مطلب یہ ہوا کہ پروردگار عالم کی پروردگاری شہادت دے رہی ہے کہ یہ بات حق ہے۔ یہ شہادت کیا ہے؟ وہی ربوبیّت کی شہادت ہے۔ اگر دنیا میں پرورش موجود ہے، پروردہ موجود ہے، اور اس لیے پروردگار بھی

موجود ہے تو ممکن نہیں کہ جزا کا معاملہ بھی موجود نہ ہو اور وہ بغیر کسی نتیجہ کے انسان کو چھوڑ دے۔ چونکہ لوگوں کی نظر اس حقیقت پر نہ تھی اس لیے اس آیت میں قسم اور مقسم بہ کا ربط صحیح طور پر متعیّن نہ کر سکے۔

قرآنِ حکیم کے دلائل و براہین پر غور کرتے ہوئے یہ اصل ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اس کے استدلال کا طریقہ منطقی بحث وتقریر کا طریقہ نہیں ہے، جس کے لیے چند در چند مقدمات کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر اثباتِ مُدّعا کی شکلیں ترتیب دینی پڑتی ہیں۔ بلکہ وہ ہمیشہ براہ راست تلقین کا قدرتی اور سیدھا سادا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ عموماً اس کے دلائل اس کے اسلوب بیان و خطاب میں مضمر ہوتے ہیں۔ وہ یا تو کسی مطلب کے لیے اسلوب خطاب ایسا اختیار کرتا ہے کہ اسی سے استدلال کی روشنی نمودار ہو جاتی ہے یا پھر کسی مطلب پر زور دیتے ہوئے کوئی ایک لفظ ایسا بول جاتا ہے کہ اس کی تعبیر میں اس کی دلیل بھی موجود ہوتی ہے اور خود بخود مخاطب کا ذہن دلیل کی طرف پھر جاتا ہے۔ چنانچہ اس کی ایک واضح مثال یہی صفتِ ربوبیّت کا جا بجا استعمال ہے۔ جب وہ خدا کی ہستی کا ذکر کرتا ہوا اسے ''رب'' کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے تو یہ بات کہ وہ ''رب'' ہے، جس طرح اس کی ایک صفت ظاہر کرتی ہے اسی طرح اس کی دلیل بھی واضح کر دیتی ہے۔ وہ ''رب'' ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ اس کی ربوبیّت تمھیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے اور خود تمھارے دل کے اندر گھر بنائے ہوئے ہے، پھر کیونکر تم جرأت کر سکتے ہو کہ اس کی ہستی سے انکار کرو! وہ رب ہے اور رب کے سوا کون ہو سکتا ہے جو تمہاری بندگی و نیاز کا مستحق ہو؟

رحمت

قرآن کہتا ہے: کائناتِ ہستی میں جو کچھ بھی خوبی و کمال ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ رحمت الٰہی کا ظہور ہے۔ جب ہم کائناتِ ہستی کے اعمال و مظاہر پر غور کرتے ہیں تو سب سے پہلی حقیقت جو ہمارے سامنے نمایاں ہوتی ہے وہ اس کا نظام ربوبیّت ہے۔ کیونکہ فطرت سے ہماری پہلی شناسائی ربوبیّت ہی کے ذریعہ ہوتی ہے۔ لیکن جب علم و

ادراک کی راہ میں چند قدم آگے بڑھتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ربوبیّت سے بھی ایک زیادہ وسیع اور عام حقیقت یہاں کارفرما ہے اور خود ربوبیّت بھی اسی کے فیضان کا ایک گوشہ ہے۔

ربوبیّت اور اس کا نظام کیا ہے؟ کائنات ہستی کی پرورش ہے۔ لیکن کائنات ہستی میں صرف پرورش ہی نہیں ہے، پرورش سے بھی زیادہ بنانے، سنوارنے اور فائدہ پہنچانے کی ایک حقیقت کام کررہی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی فطرت میں بناؤ ہے، اس کے بناؤ میں خوبی ہے، اس کے مزاج میں اعتدال ہے، اس کے افعال میں خواص ہیں، اس کی صورت میں حسن ہے، اس کی صداؤں میں نغمہ ہے، اس کی بو میں عطر بیزی ہے اور اس کی کوئی بات نہیں جو اس کارخانے کی تعمیر و درستگی کے لیے مفید نہ ہو۔ پس یہ حقیقت جو اپنے بناؤ اور فیضان میں ربوبیّت سے بھی زیادہ وسیع اور عام ہے، قرآن کہتا ہے کہ رحمت ہے اور خالق کائنات کی رحمانیت اور رحیمیّت کا ظہور ہے۔

تعمیر و تحسین کائنات رحمتِ الٰہی کا نتیجہ ہے

زندگی اور حرکت کا یہ عالمگیر کارخانہ وجود ہی میں نہ آتا اگر اپنے ہر فعل میں بننے بنانے، سنورنے سنوارنے اور ہر طرح بہتر و واضح ہونے کا خاصہ نہ رکھتا۔ فطرتِ کائنات میں یہ خاصہ کیوں ہے؟ اس لیے کہ بناؤ ہو بگاڑ نہ ہو، درستگی ہو برہمی نہ ہو، لیکن کیوں ایسا ہوا کہ فطرت بنائے اور سنوارے، بگاڑے اور الجھائے نہیں؟ یہ کیا ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے، درست اور بہتر ہی ہوتا ہے، خراب اور بدتر نہیں ہوتا؟ انسان کے علم و دانش کی کاوشیں آج تک یہ عقدہ حل نہ کرسکیں۔ فلسفہ و دانش کا قدم جب بھی اس حد تک پہنچا دم بخود ہو کر رہ گیا لیکن قرآن کہتا ہے: یہ اس لیے ہے کہ فطرت کائنات میں رحمت ہے اور رحمت کا مقتضیٰ یہی ہے کہ خوبی اور درستگی ہو، بگاڑ اور خرابی نہ ہو۔

انسان کے علم و دانش کی کاوشیں بتلاتی ہیں کہ کائنات ہستی کا یہ بناؤ اور سنوار عناصر اوّلیہ کی ترکیب اور ترکیب کے اعتدال و تسویہ کا نتیجہ ہے۔ مادۂ عالم کی کمیّت میں بھی اعتدال ہے، کیفیت میں بھی اعتدال ہے پھر یہی اعتدال ہے جس سے سب کچھ بنتا ہے

اور جو کچھ بنتا ہے خوبی اور کمال کے ساتھ بنتا ہے۔ یہی اعتدال وتناسب دنیا کی تمام تعمیری اور ایجابی حقائق کی اصل ہے۔ وجود زندگی، تندرستی، حسن، خوشبو نغمہ بناؤ اور خوبی کے بہت سے نام ہیں، مگر حقیقت ایک ہی ہے اور وہ اعتدال ہے۔

لیکن فطرتِ کائنات میں یہ اعتدال وتناسب کیوں ہے؟ کیوں ایسا ہوا کہ عناصر کے دقائق جب ملیں تو اعتدال و تناسب کے ساتھ ملیں اور مادہ کا خاصہ یہی ٹھہرا کہ اعتدال و تناسب تو ہو مگر انحراف اور تجاوز نہ ہو؟ انسان کا علم دم بخود اور متحیر ہے لیکن قرآن کہتا ہے: یہ اس لیے ہوا کہ خالقِ کائنات میں رحمت ہے اور اس لیے کہ اس کی رحمت اپنا ظہور بھی رکھتی ہے۔ اور جس میں رحمت ہو اور اس کی رحمت ظہور بھی رکھتی ہو تو جو کچھ اس سے صادر ہوگا اس میں خوبی، بہتری ہی ہوگی، حسن و جمال ہی ہوگا اور اعتدال وتناسب ہی ہوگا، اس کے خلاف کچھ نہیں ہوسکتا۔

فلسفہ ہمیں بتاتا ہے کہ تعمیر اور تحسین فطرت کائنات کا خاصہ ہے۔ خاصۂ تعمیر چاہتا ہے کہ بناؤ ہو خاصۂ تحسین چاہتا ہے کہ جو کچھ بنے خوبی وکمال کے ساتھ بنے اور یہ دونوں خاصے ''قانونِ ضرورت'' کا نتیجہ ہیں۔ کائنات ہستی کے ظہور و تکمیل کے لیے ضرورت تھی کہ تعمیر ہو اور ضرورت تھی کہ جو کچھ تعمیر ہو حسن وخوبی کے ساتھ تعمیر ہو۔ یہی ''ضرورت'' بجائے خود ایک علت ہوگئی۔ اور اس لیے فطرت سے جو کچھ بھی ظہور میں آتا ہے۔ ویسا ہی ہوتا ہے جیسا ہونا ضروری تھا۔

لیکن اس تعلیل سے بھی تو یہ عقدہ حل نہیں ہوا، سوال جس منزل میں تھا اس سے صرف ایک منزل اور آگے بڑھ گیا۔ تم کہتے ہو یہ جو کچھ ہو رہا ہے اس لیے ہے کہ ضرورت کا قانون موجود ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ''ضرورت'' کا قانون کیوں موجود ہے؟ کیوں یہ ضروری ہوا کہ جو کچھ ظہور میں آئے ''ضرورت'' کے مطابق ہو اور ''ضرورت'' اسی بات کی مقتضی ہوئی کہ خوبی اور درستگی تو ہو لیکن بگاڑ اور برہمی نہ ہو؟ انسانی علم کی کاوشیں اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتیں۔ ایک مشہور فلسفی کے لفظوں میں جس جگہ سے یہ کیوں شروع ہو جائے سمجھ جاؤ

کہ فلسفہ کے غور و خوض کی سرحد ختم ہو گئی۔" لیکن قرآن اسی سوال کا جواب دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے یہ "ضرورت" رحمت اور فضل کی "ضرورت" ہے۔ رحمت چاہتی ہے کہ جو کچھ ظہور میں آئے بہتر اور نافع ہو اور اس لیے جو کچھ ظہور میں آتا ہے بہتر اور نافع ہوتا ہے۔

پھر یہ حقیقت بھی واضح رہے کہ دنیا میں زندگی اور بقاء کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے۔ جمال و زیبائش ان سے ایک زائد تر فیضان ہے۔ اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ جمال و زیبائش بھی یہاں موجود ہے۔ پس یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ سب کچھ "قانون ضرورت" ہی کا نتیجہ ہے۔ ضرورت، زندگی اور بقا کا سر و سامان چاہتی ہے، لیکن زندہ اور باقی رہنے کے لیے جمال و زیبائش کی کیا ضرورت ہے؟ اگر جمال و زیبائش بھی یہاں موجود ہے تو یقیناً یہ فطرت کا ایک مزید لطف و احسان ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فطرت صرف زندگی ہی نہیں بخشتی، بلکہ زندگی کو حسین ولطیف بھی بنانا چاہتی ہے۔ پس یہ محض زندگی کی ضرورت کا قانون نہیں ہو سکتا۔ یہ اس "ضرورت" سے بھی کوئی بالاتر "ضرورت" ہے جو چاہتی ہے کہ مرحمت اور فیضان ہو۔ قرآن کہتا ہے: یہ رحمت کی "ضرورت" ہے۔ اور رحمت کا مقتضیٰ یہی ہے کہ وہ سب کچھ ظہور میں آئے جو رحمت سے ظہور میں آنا چاہیے۔

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط قُلْ لِّلّٰهِ ط كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ط (۱۲:۶)

"(اے پیغمبر! ان لوگوں سے) پوچھو آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے، وہ کس کے لیے ہے؟ (اے پیغمبر!) کہہ دے، اللہ کے لیے ہے جس نے اپنے لیے ضروری ٹھہرا لیا ہے کہ رحمت ہو۔"

وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ط (۱۵۶:۷)

"اور میری رحمت دنیا کی ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔"

ہم دیکھتے ہیں کہ کائناتِ ہستی میں جو کچھ بھی موجود ہے اور جو کچھ بھی ظہور میں آتا

ہے اس میں سے ہر چیز کوئی نہ کوئی خاصہ رکھتی ہے اور ہر حادثہ کی کوئی نہ کوئی تاثیر ہے اور پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ یہ تمام خواص و مؤثرات کچھ اس طرح واقع ہوئے ہیں کہ ہر خاصہ ہماری کوئی نہ کوئی ضرورت پوری کرتا اور ہر تاثیر ہمارے لیے کوئی نہ کوئی فیضان رکھتی ہے۔ سورج' چاند' ستارے' ہوا' بارش' دریا' سمندر' پہاڑ' سب کے خواص و فوائد ہیں اور سب ہمارے لیے طرح طرح کی راحتوں اور آسائشوں کا سامان بہم پہنچا رہے ہیں:

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّکُمْ وَ سَخَّرَ لَکُمُ الْفُلْکَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ وَ سَخَّرَ لَکُمُ الْاَنْهَارَ وَ سَخَّرَ لَکُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ وَ سَخَّرَ لَکُمُ اللَّیْلَ وَالنَّهَارَ وَاٰتٰکُمْ مِّنْ کُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ط وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ط اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ کَفَّارٌo (۱۴:۳۲-۳۴)

''یہ اللہ ہی کی کارفرمائی ہے کہ اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی برسایا' پھر اس کی تاثیر سے طرح طرح کے پھل تمھاری غذا کے لیے پیدا کر دیے' اسی طرح اس نے یہ بات بھی ٹھہرا دی کہ سمندر میں جہاز تمھارے زیرِ فرمان رہتے اور حکم الٰہی سے چلتے رہتے ہیں اور اسی طرح دریا بھی تمھاری کاربرآریوں کے لیے مسخر کر دیے گئے۔ اور پھر اتنا ہی نہیں بلکہ غور کرو تو سورج اور چاند بھی تمھارے لیے مسخر کر دیے گئے ہیں کہ ایک خاص ڈھنگ پر گردش میں ہیں اور رات اور دن کا اختلاف بھی (تمھارے فائدہ ہی کے لیے) مسخر ہے۔ غرضیکہ جو کچھ تمھیں مطلوب تھا' وہ سب کچھ اس نے عطا کر دیا۔ اگر تم اللہ کی نعمتیں شمار کرنی چاہو تو وہ اتنی ہیں کہ ہرگز شمار نہ کر سکو گے۔ بلاشبہ انسان بڑا ہی ناانصاف' بڑا ہی ناشکرا ہے۔''

زمین کو دیکھو، اس کی سطح پھلوں اور پھولوں سے لدی ہوئی ہے، تہہ میں آب شیریں کی سوتیں بہہ رہی ہیں، گہرائی سے چاندی سونا نکل رہا ہے، وہ اپنی جسامت میں اگرچہ مدور ہے لیکن اس کا ہر حصہ اس طرح واقع ہوا ہے کہ معلوم ہوتا ہے ایک مسطح فرش بچھا دیا گیا ہے:

اَلَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ مَهۡدًا وَّ جَعَلَ لَکُمۡ فِیۡهَا سُبُلًا لَّعَلَّکُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ ﴿۱۰:۴۳﴾

''وہ پروردگار جس نے تمھارے لیے زمین اس طرح بنا دی کہ فرش کی طرح بچھی ہوئی ہے اور اس میں قطع مسافت کی (ہموار) راہیں پیدا کر دیں (تا کہ تم راہ پاؤ)''

وَهُوَ الَّذِیۡ مَدَّ الۡاَرۡضَ وَجَعَلَ فِیۡهَا رَوَاسِیَ وَ اَنۡهٰرًا ط وَمِنۡ کُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیۡهَا زَوۡجَیۡنِ اثۡنَیۡنِ یُغۡشِی الَّیۡلَ النَّهَارَ ط اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ ﴿۱۳۔۳﴾

''اور یہ اسی پروردگار کی پروردگاری ہے کہ اس نے زمین (تمھاری سکونت کے لیے) پھیلا دی اور اس میں پہاڑوں کے لنگر ڈال دیے اور نہریں بہا دیں، نیز ہر طرح کے پھلوں کی دو دو قسمیں پیدا کر دیں۔ اور پھر یہ اسی کی کارفرمائی ہے کہ (رات) اور دن یکے بعد دیگرے آتے رہتے ہیں اور رات کی تاریکی دن کی روشنی کو ڈھانپ لیتی ہے بلاشبہ ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرنے والے ہیں۔ اس میں (معرفت حقیقت کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں۔''

وَفِی الۡاَرۡضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّ جَنّٰتٌ مِّنۡ اَعۡنَابٍ وَّ زَرۡعٌ وَّ نَخِیۡلٌ صِنۡوَانٌ وَّ غَیۡرُ صِنۡوَانٍ یُّسۡقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَّ نُفَضِّلُ بَعۡضَهَا عَلٰی بَعۡضٍ فِی الۡاُکُلِ ط اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۳:۴﴾

''اور (پھر دیکھو!) زمین کی سطح اس طرح بنائی گئی ہے کہ اس میں ایک دوسرے سے قریب (آبادی کے) قطعات بن گئے اور انگوروں کے باغ' غلہ کی کھیتیاں' کھجوروں کے جھنڈ پیدا ہو گئے۔ ان درختوں میں بعض درخت زیادہ ٹہنیوں والے ہیں بعض اکہرے اور اگرچہ سب کو ایک ہی طرح کے پانی سے سینچا جاتا ہے' لیکن پھل ایک طرح کے نہیں۔ ہم نے بعض درختوں کو بعض درختوں پر پھلوں کے مزے میں برتری دے دی۔ بلاشبہ اربابِ دانش کے لیے اس میں (معرفت حقیقت کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں۔''

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ط قَلِيْلاً مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝ (۱۰:۷)

''اور (دیکھو) ہم نے زمین میں تمھیں طاقت وتصرّف کے ساتھ جگہ دی اور زندگی کے تمام سامان پیدا کر دیے (مگر افسوس) بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ تم (نعمت الٰہی کے) شکر گزار ہو۔''

سمندر کی طرف نظر اٹھاؤ! اس کی سطح پر جہاز تیر رہے ہیں' تہہ میں مچھلیاں اچھل رہی ہیں۔ قعر میں مرجان اور موتی نشو ونما پا رہے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَّ تَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ (۱۴:۱۶)

''اور (دیکھو!) یہ اسی کی کارفرمائی ہے کہ اس نے سمندر تمھارے لیے مسخر کر دیا' تاکہ اپنی غذا کے لیے تر و تازہ گوشت حاصل کرو اور زیور کی چیزیں نکالو۔ جنہیں (خوش نمائی کے لیے) پہنتے ہو۔ نیز تم دیکھتے ہو کہ جہاز سمندر میں موجیں چیرتے ہوئے چلے جا رہے ہیں اور سیر و سیاحت

کے ذریعہ اللہ کا فضل تلاش کرو تا کہ اس کی نعمت کے شکر گزار ہو!''

حیوانات کو دیکھو! زمین کے چار پائے' فضا کے پرند' پانی کی مچھلیاں' سب اسی لیے ہیں کہ اپنے اپنے وجود سے ہمیں فائدہ پہنچائیں۔ غذا کے لیے ان کا دودھ اور گوشت' سواری کے لیے ان کی پیٹھ' حفاظت کے لیے ان کی پاسبانی' پہننے کے لیے ان کی کھال اور اون' برتنے کے لیے ان کے جسم کی ہڈیاں تک مفید ہیں۔

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّ مَنَافِعُ وَ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَo وَ لَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيحُوْنَ حِيْنَ تَسْرَحُوْنَo وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ‌ط اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُ وْفٌ رَّحِيْمٌ o وَ الْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً‌ط وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَo (١٦:٥۔٨)

''اور چار پائے پیدا کر دیے ہیں جن میں تمھارے لیے جاڑے کا سامان اور طرح طرح کے منافع ہیں اور ان سے تم اپنی غذا بھی حاصل کرتے ہو۔ جب ان کے غول شام کو چر کر واپس آتے ہیں اور جب چراگاہوں کے لیے نکلتے ہیں تو (دیکھو!) ان کے منظر میں تمھارے لیے خوش نمائی رکھ دی ہے۔ اور انھیں میں وہ جانور بھی ہیں' جو تمھارا بوجھ اٹھا کر ان دور دراز شہروں تک پہنچا دیتے ہیں۔ جہاں تک تم بغیر سخت مشقت کے نہیں پہنچا سکتے تھے۔ بلاشبہ تمھارا پروردگار بڑا ہی شفقت رکھنے والا اور صاحب رحمت ہے۔ اور (دیکھو!) گھوڑے' خچر' گدھے پیدا کیے گئے تاکہ تم ان سے سواری کا کام لو اور خوش نمائی کا بھی موجب ہوں۔ وہ اسی طرح (طرح طرح کی چیزیں) پیدا کرتا ہے جن کا تمھیں علم نہیں۔''

وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً‌ط نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَo (١٦:٦٦)

''اور چار پایوں کے وجود میں تمھارے لیے (فہم وبصیرت کی) بڑی ہی عبرت ہے۔ انہی جانوروں کے جسم میں سے ہم خون اور کثافتوں کے درمیان پاک وصاف دودھ پیدا کر دیتے ہیں' جو پینے والوں کے لیے بے غل وغش مشروب ہوتا ہے۔''

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَ يَوْمَ اِقَامَتِكُمْ وَ مِنْ اَصْوَافِهَا وَ اَوْبَارِهَا وَ اَشْعَارِهَآ اَثَاثًا وَّ مَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ۝ (۱۶:۸۰)

''اور (دیکھو!) اللہ نے تمھارے گھروں کو تمھارے لیے سکونت کی جگہ بنایا' اور (جو لوگ شہروں میں نہیں بستے) ان کے لیے ایسا سامان کر دیا کہ چار پایوں کی کھال کے خیمے بنا دیے۔ سفر اور اقامت دونوں حالتوں میں انھیں ہلکا پاتے ہو۔ اسی طرح جانوروں کی اون' روؤں اور بالوں سے طرح طرح کی چیزیں پیدا کر دیں جن سے ایک خاص وقت تک تمھیں فائدہ پہنچتا ہے۔''

ایک انسان کتنی ہی محدود اور غیر متمدّن زندگی رکھتا ہو' لیکن اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتا' کہ اس کا گرد و پیش اسے فائدہ پہنچا رہا ہے۔ ایک لکڑ ہارا بھی اپنے جھونپڑے میں بیٹھا ہوا نظر اٹھاتا ہے تو گو اپنے احساس کے لیے بہتر تعبیر نہ پائے۔ لیکن یہ حقیقت ضرور محسوس کر لیتا ہے۔ وہ جب بیمار ہوتا ہے تو جنگل کی جڑی بوٹیاں کھا لیتا ہے۔ دھوپ تیز ہوتی ہے تو درختوں کے سایے میں بیٹھ جاتا ہے' بیکار ہوتا ہے تو پتوں کی سرسبزی اور پھولوں کی خوش نمائی سے آنکھیں سینکنے لگتا ہے۔ پھر یہی درخت ہیں جو اپنی شادابی میں اسے پھل بخشتے ہیں۔ پختگی میں لکڑی کے تختے بن جاتے ہیں۔ کہنگی میں آگ کے شعلے بھڑکا دیتے ہیں۔ ایک ہی مخلوق نباتی ہے جو اپنے منظر سے نزہت و سرور بخشتی ہے۔ اپنی بو سے ہوا کو معطر کرتی ہے' اپنے پھل میں طرح طرح کی غذائیں رکھتی ہے' اپنی لکڑی سے

سامان تعمیر مہیا کرتی ہے اور پھر خشک ہو جاتی ہے تو اس کے جلانے سے آگ بھڑکتی' چولھے گرم کرتی' موسم کو معتدل بناتی اور اپنی حرارت سے بے شمار اشیاء کے پکنے' پگھلنے اور تپنے کا ذریعہ بنتی ہے۔

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَا اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ٥ (۳۶:۸۰)

''(اور دیکھو!) وہ کار فرمائے قدرت جس نے سرسبز درخت سے تمھارے لیے آگ پیدا کر دی' اب تم اسی سے (اپنے چولھوں کی) آگ سلگا لیتے ہو۔''

اور پھر یہ وہ فوائد ہیں جو تمھیں اپنی جگہ محسوس ہو رہے ہیں' لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ فطرت نے یہ تمام چیزیں کن کن کاموں اور کن کن مصلحتوں کے لیے پیدا کی ہیں اور کار فرمائے عالم کارگاہ ہستی کے بنانے اور سنوارنے کے لیے ان سے کیا کیا کام نہیں لے رہا ہے؟

وَمَا یَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّکَ اِلَّا هُوَط (۷۴:۳۱)

''اور تمھارا پروردگار (اس کارزار ہستی کی کارفرمائیوں کے لیے) جو فوجیں رکھتا ہے ان کا حال اس کے سوا کون جانتا ہے؟''

پھر یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ فطرت نے کائنات ہستی کے افادہ و فیضان کا نظام کچھ اس طرح بنایا ہے کہ وہ بیک وقت ہر مخلوق کو یکساں طور پر نفع پہنچاتا اور ہر مخلوق کی یکساں طور پر رعایت ملحوظ رکھتا ہے۔ اگر ایک انسان اپنے عالی شان محل میں بیٹھ کر محسوس کرتا ہے کہ تمام کارخانہ ہستی صرف اسی کی کاربرآریوں کے لیے ہے تو ٹھیک اسی طرح ایک چیونٹی بھی اپنے بل میں کہہ سکتی ہے کہ فطرت کی ساری کارفرمائیاں صرف اسی کی کاربرآریوں کے لیے ہیں اور کون ہے جو اسے جھٹلانے کی جرأت کر سکتا ہے؟ کیا فی الحقیقت سورج اس لیے نہیں ہے کہ اس کے لیے حرارت بہم پہنچائے؟ کیا بارش اس لیے نہیں ہے کہ اس کے لیے رطوبت مہیا کرے؟ کیا ہوا اس لیے نہیں ہے کہ اس کی ناک تک شکر کی بو

پہنچا دے؟ کیا زمین اس لیے نہیں ہے کہ ہر موسم اور ہر حالت کے مطابق اس کے لیے مقام و منزل بنے؟ دراصل فطرت کی بخشایشوں کا قانون کچھ ایسا عام اور ہمہ گیر واقع ہوا ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں ایک ہی طریقہ سے ایک ہی نظام کے ماتحت ہر مخلوق کی نگہداشت کرتا اور ہر مخلوق کو یکساں طور پر فائدہ اٹھانے کا موقع دیتا ہے۔حتیٰ کہ ہر وجود اپنی جگہ محسوس کرسکتا ہے کہ یہ پورا کارخانۂ عالم صرف اسی کی کام جوئیوں اور آسائشوں کے لیے سرگرم کار ہے:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا طَائِرٍ یَطِیْرُ بِجَنَاحَیْهِ اِلَّا اُمَمٌ اَمْثَالُکُمْ ؀ (۳۸:۶)

''اور زمین کے تمام جانور اور (پردار) بازوؤں سے اڑنے والے تمام پرند دراصل تمھاری ہی طرح امتیں ہیں۔''

زینت و تفاخر، مال و متاع، آل و اولاد

اسی طرح، طرح طرح کی خواہشیں اور جذبے، زینت و تفاخر کے ولولے، مال و متاع کی محبت، آل اولاد کی دل بستگیاں، زندگی کی دل چسپی اور انہماک کے لیے پیدا کر دی گئی ہیں:

زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِیْنَ وَالْقَنَاطِیْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ وَالْخَیْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ط ذٰلِکَ مَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ؀ (۳:۱۴)

''انسان کے لیے مرد و عورت کے تعلق میں، اولاد میں، چاندی سونے کے اندوختوں میں، چنے ہوئے گھوڑوں میں، مویشیوں میں اور کھیتی باڑی میں دل بستگی پیدا کر دی گئی ہے اور یہ جو کچھ بھی ہے دنیوی زندگی کی پونجی ہے۔بہتر ٹھکانا تو اللہ ہی کے پاس ہے۔''

اختلافِ معیشت اور تزاحمِ حیات

اسی طرح معیشت کا اختلاف اور اس کی وجہ سے مختلف درجوں اور حالتوں کا پیدا ہو جانا بھی انہماک حیات کا ایک بہت بڑا محرک ہے، کیونکہ اس کی وجہ سے زندگی میں مزاحمت اور مسابقت کی حالت پیدا ہوگئی ہے اور اس میں لگے رہنے سے زندگی کی مشقتوں کا جھیلنا آسان ہوگیا ہے، بلکہ یہی مشقتیں سرتاسر راحت وسرور کا سامان بن گئی ہیں:

وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِىْ مَآ اٰتٰكُمْ ط اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ٥ (٦:١٦٥)

''اور یہ اسی (حکیم وقدیر) کی کارفرمائی ہے کہ اس نے تمھیں زمین میں (پچھلوں) کا جانشین بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض پر درجوں میں فوقیت دے دی، تا کہ جو کچھ تمھیں دیا گیا ہے اس میں تمھارے عمل کی آزمائش کرے بلاشبہ تمھارا پروردگار (پاداش عمل کی) سزا دینے میں تیز ہے (یعنی اس کا قانونِ مکافات نتائجِ عمل میں سست رفتار نہیں) لیکن ساتھ ہی بخشش دینے والا، رحمت رکھنے والا بھی ہے۔''

برہانِ فضل ورحمت

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جس طرح قرآن نے ربوبیّت کے اعمال و مظاہر سے استدلال کیا ہے، اسی طرح وہ رحمت کے آثار وحقائق سے بھی جا بجا استدلال کرتا ہے اور برہانِ ربوبیّت کی طرح برہانِ فضل ورحمت بھی اس کی دعوت وارشاد کا ایک عام اسلوب خطاب ہے۔ وہ کہتا ہے، کائنات خلقت کی ہر شے میں ایک مقررہ نظام کے ساتھ رحمت و فضل کے مظاہر کا موجود ہونا قدرتی طور پر انسان کو یقین دلا دیتا ہے کہ ایک رحمت رکھنے والی ہستی کی کارفرمائیاں یہاں کام کر رہی ہیں، کیونکہ ممکن نہیں فضل ورحمت کی یہ پوری کائنات

موجود ہو اور فضل و رحمت کا کوئی زندہ ارادہ موجود نہ ہو۔ چنانچہ وہ تمام مقامات جن میں کائنات خلقت کے افادہ و فیضان، زینت و جمال، موزونیت و اعتدال، تسویہ و قوام اور تکمیل و اتقان کا ذکر کیا گیا ہے، دراصل اسی استدلال پر مبنی ہیں:

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُo اِنَّ فِىْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِىْ تَجْرِىْ فِى الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّ تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَo (۲:۱۶۳-۱۶۴)

''اور (دیکھو!) تمھارا معبود وہی ایک معبود ہے، کوئی معبود نہیں مگر اسی کی ایک ذات رحمت والی اور اپنی رحمت کی بخشایشوں سے ہمیشہ فیض یاب کرنے والی! بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات دن کے ایک کے بعد ایک آتے رہنے میں اور کشتی میں جو انسان کی کار برآریوں کے لیے سمندر میں چلتی ہے، اور بارش میں جسے اللہ آسمان سے برساتا ہے اور اس (کی آب پاشی) سے زمین مرنے کے بعد پھر جی اٹھتی ہے اور اس بات میں کہ ہر قسم کے جانور زمین میں پھیلا دیے ہیں تیز ہواؤں کے (مختلف جانب) پھیرنے میں اور بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان (اپنی مقررہ جگہ کے اندر) بندھے رکے ہیں، عقل رکھنے والوں کے لیے (اللہ کی ہستی اور اس کے قوانین فضل و رحمت کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں!''

اسی طرح ان مقامات کا مطالعہ کرو جہاں خصوصیت کے ساتھ جمال فطرت سے استدلال کیا ہے:

اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَ زَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ

فُرُوْجٍ○ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِيْجٍ○ تَبْصِرَةً وَّ ذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ○ (۵۰:۶-۸)

''کیا کبھی ان لوگوں نے آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا نہیں کہ کس طرح ہم نے اسے بنایا ہے اور کس طرح اس کے منظر میں خوش نمائی پیدا کر دی ہے اور پھر یہ کہ کہیں بھی اس میں شگاف نہیں۔ اور اسی طرح زمین کو دیکھو! کس طرح ہم نے اسے فرش کی طرح پھیلا دیا اور پہاڑوں کے لنگر ڈال دیے اور پھر کس طرح قسم قسم کی خوب صورت نباتات اگا دیں! ہر اس بندے کے لیے جو حق کی طرف رجوع کرنے والا ہے اس میں غور کرنے کی بات اور نصیحت کی روشنی ہے!''

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ زَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ○ (۱۵:۱۶)

''اور (دیکھو!) ہم نے آسمان میں (ستاروں کی گردش کے لیے) برج بنائے اور دیکھنے والوں کے لیے ان میں خوشنمائی پیدا کر دی۔''

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ○ (۶۷:۵)

''اور (دیکھو!) ہم نے دنیا کے آسمان (یعنی کرہ ارضی کی فضا کو ستاروں کی قندیلوں سے خوش منظر بنا دیا!''

وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ○ (۱۶:۶)

''اور (دیکھو) تمھارے لیے چار پایوں کے منظر میں جب شام کے وقت چراگاہ سے واپس لاتے ہو اور جب صبح لے جاتے ہو ایک طرح کا حسن اور نظر افروزی ہے!''

موزونیّت و تناسب

جس چیز کو ہم ''جمال'' کہتے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے؟ موزونیّت اور تناسب۔ یہی موزونیت اور تناسب ہے جو بناؤ اور خوبی کے تمام مظاہر کی اصل ہے:

وَاَنۡۢبَتۡنَا فِيۡهَا مِنۡ كُلِّ شَىۡءٍ مَّوۡزُوۡنٍo (19:15)

اور (دیکھو!) ہم نے زمین میں ہر ایک چیز موزونیت اور تناسب رکھنے والی اگائی!

تسوّیہ

اسی معنی میں قرآن ''تسویہ'' کا لفظ بھی استعمال کرتا ہے۔ ''تسویہ'' کے معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کو اس طرح ٹھیک ٹھیک درست کر دینا کہ اس کی ہر بات خوبی و مناسبت کے ساتھ ہو:

اَلَّذِىۡ خَلَقَ فَسَوّٰىo وَالَّذِىۡ قَدَّرَ فَهَدٰىo (87:2-3)

''وہ پروردگار جس نے ہر چیز پیدا کی پھر ٹھیک ٹھیک خوبی و مناسبت کے ساتھ درست کر دی۔ اور وہ جس نے ہر وجود کے لیے ایک اندازہ ٹھہرا دیا' پھر اس پر (زندگی و معیشت) کی راہ کھول دی!''

اَلَّذِىۡ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَ فِىۡۤ اَىِّ صُوۡرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَo (82:7-8)

''وہ پروردگار جس نے تمھیں پیدا کیا پھر ٹھیک ٹھیک درست کر دیا' پھر (تمھارے ظاہری و باطنی قویٰ میں) اعتدال و تناسب ملحوظ رکھا: پھر جیسی صورت بنانی چاہی اسی کے مطابق ترکیب دے دی۔''

اتقان

یہی حقیقت ہے جسے قرآن نے ''اتقان'' سے بھی تعبیر کیا ہے' یعنی کائناتِ ہستی کی ہر چیز کا درستگی و استواری کے ساتھ ہونا کہ کہیں بھی اس میں خلل' نقصان' بے ڈھنگا پن' اونچ نیچ' ناہمواری نظر نہیں آ سکتی:

صُنۡعَ اللّٰهِ الَّذِىۡۤ اَتۡقَنَ كُلَّ شَىۡءٍ o (27:88)

''یہ اللہ کی کاریگری ہے جس نے ہر چیز درستگی و استواری کے ساتھ بنائی!''

مَاتَرٰى فِىۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ ؕ فَارۡجِعِ الۡبَصَرَ هَلۡ

تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍo ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ کَرَّ تَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْکَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّ ھُوَ حَسِیْرٌo (۶۷:۳-۴)

''تم الرحمٰن کی بناوٹ میں (کیونکہ اس یہ اس کی رحمت ہی کا ظہور ہے) کبھی کوئی اونچ نیچ نہیں پاؤ گے (اچھا نظر اٹھاؤ اور اس نمائش گاہِ صنعت کا مطالعہ کرو!) ایک بار نہیں بار بار دیکھو! کیا تمھیں کوئی دراڑ دکھائی دیتی ہے؟ تم اسی طرح یکے بعد دیگرے دیکھتے رہو! تمھاری نگاہ اٹھے گی اور عاجز و درماندہ ہو کر واپس آ جائے گی لیکن کوئی نقص نہ نکال سکے گی۔''

''فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ'' یعنی یہ خوبی واتقان اس لیے ہے کہ رحمت رکھنے والے کی کاریگری ہے اور رحمت کا مقتضیٰ یہی تھا کہ حسن وخوبی ہو، اتقان وکمال ہو نقص وناہمواری نہ ہو۔

رحمت سے معاد پر استدلال

خدا کی ہستی اور اس کی توحید وصفات کی طرح آخرت کی زندگی پر بھی وہ رحمت سے استدلال کرتا ہے اگر رحمت کا مقتضیٰ یہ ہوا کہ دنیا میں اس خوبی وکمال کے ساتھ زندگی کا ظہور ہو تو کیونکر یہ بات باور کی جا سکتی ہے کہ دنیا کی چند روزہ زندگی کے بعد اس کا فیضان ختم ہو جائے اور خزانۂ رحمت میں انسان کی زندگی اور بناؤ کے لیے کچھ باقی نہ رہے؟

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلاً لَّا رَیْبَ فِیْهِ ط فَاَبَی الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا کُفُوْرًاo قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِکُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّیْٓ اِذًا لَّاَمْسَکْتُمْ خَشْیَةَ الْاِنْفَاقِ ط (۱۷:۹۹-۱۰۰)

''کیا ان لوگوں نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ اللہ جس نے آسمان و زمین پیدا کیے ہیں، یقیناً اس بات سے عاجز نہیں ہو سکتا۔ کہ ان جیسے (آدمی دوبارہ) پیدا کر دے، اور یہ کہ ان کے لیے اس نے ایک مقررہ وقت ٹھہرا دیا ہے جس میں کسی طرح کا شک و شبہ نہیں؟ افسوس ان کی

شقاوت پر!) اس پر بھی ان ظالموں نے اپنے لیے کوئی راہ پسند نہ کی مگر حقیقت سے انکار کرنے کی! (اے پیغمبر! ان سے) کہہ دو اگر میرے پروردگار کی رحمت کے خزانے تمھارے قبضے میں ہوتے' تو اس حالت میں یقیناً تم خرچ ہو جانے کے ڈر سے ہاتھ روکے رکھتے (لیکن یہ اللہ ہے جس کے خزائن رحمت نہ تو کبھی ختم ہو سکتے ہیں نہ اس کی بخشایشِ رحمت کی کوئی انتہا ہے)''

رحمت سے وحی وتنزیل کی ضرورت پر استدلال

اسی طرح وہ رحمت سے وحی وتنزیل کی ضرورت پر استدلال کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے جو رحمت کارخانۂ ہستی کے ہر گوشے میں افادہ و فیضان کا سرچشمہ ہے' کیوں کر ممکن تھا کہ انسان کی معنوی ہدایت کے لیے اس کے پاس کوئی فیضان نہ ہوتا اور وہ انسان کو نقصان و ہلاکت کے لیے چھوڑ دیتی؟ اگر تم دس گوشوں میں فیضانِ رحمت محسوس کر رہے ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ گیارھویں گوشے میں اس سے انکار کر دو۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے جابجا نزولِ وحی' ترسیلِ کتب اور بعثت انبیاء کو رحمت سے تعبیر کیا ہے:

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَکَ بِهٖ عَلَیْنَا وَکِیْلاً اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّکَ اِنَّ فَضْلَهٗ کَانَ عَلَیْکَ کَبِیْرًاo (۱۷:۸۶-۸۷)

''اور (اے پیغمبر!) اگر ہم چاہیں تو جو کچھ تم پر وحی کے ذریعے بھیجا گیا ہے اسے اٹھا لے جائیں (یعنی سلسلہ تنزیل و وحی باقی نہ رہے) اور تمھیں کوئی بھی ایسا کارساز نہ ملے جو ہم پر زور ڈال سکے' لیکن جو سلسلہ وحی جاری ہے تو یہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تمھارے پروردگار کی رحمت ہے اور یقین کرو! تم پر اس کا بڑا ہی فضل ہے۔''

تَنْزِیْلَ الْعَزِیْزِ الرَّحِیْمِ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآءُ هُمْ فَهُمْ

غٰفِلُوْنَ٥ (٣٦:٥-٦)

''(یہ قرآن) عزیز ورحیم کی طرف سے نازل کیا گیا ہے' تا کہ ان لوگوں کو جن کے آباؤ اجداد کسی پیغمبر کی زبانی متنبہ نہیں کیے گئے ہیں اور اس لیے غفلت میں پڑے ہوئے ہیں' تم متنبہ کرو۔''

تورات وانجیل اور قرآن کی نسبت جا بجا تصریح کی کہ ان کا نزول ''رحمت'' ہے۔

وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتَابُ مُوْسٰى اِمَامًا وَّ رَحْمَةً ط (١١-١٧)

''اور اس سے پہلے (یعنی قرآن سے پہلے) موسیٰ کی کتاب (امت کے لیے) پیشوا' اور رحمت!''

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ٥ وَهُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ٥ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ط هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ٥ (١٠:٥٧-٥٨)

''اے افرادِ نسل انسانی! یقیناً یہ تمھارے پروردگار کی طرف سے موعظت ہے جو تمھارے لیے آ گئی ہے اور ان تمام بیماریوں کے لیے جو انسان کے دل کی بیماریاں ہیں' نسخۂ شفا ہے' اور رہنمائی اور رحمت ہے۔ ایمان رکھنے والوں کے لیے (اے پیغمبر! ان لوگوں سے) کہہ دو (کہ یہ جو کچھ ہے) اللہ کے فضل اور رحمت سے ہے' پس چاہیے کہ (اپنی فیض یابی پر خوش ہو۔ یہ اپنی برکتوں میں) ان تمام چیزوں سے بہتر ہے جنہیں تم (زندگی کی کامرانیوں کے لیے) فراہم کرتے ہو۔''

هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ٥ (٤٥:٢٠)

''یہ (قرآن) لوگوں کے لیے واضح دلیلوں کی روشنی ہے اور ہدایت و رحمت ہے یقین رکھنے والوں کے لیے۔''

اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ اِنَّ فِي

ذٰلِکَ لَرَحۡمَةً وَّ ذِکۡرٰی لِقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ٥ (۵۱:۲۹)

''کیا ان لوگوں کے لیے یہ نشانی کافی نہیں کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی ہے جو انھیں (برابر) سنائی جا رہی ہے؟ جو لوگ یقین رکھنے والے ہیں بلاشبہ ان کے لیے اس (نشانی) میں سرتاسر رحمت اور فہم و بصیرت ہے۔''

چنانچہ اسی بنا پر اس نے داعی اسلام کے ظہور کو بھی فیضانِ رحمت سے تعبیر کیا ہے:

وَمَا اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ٥ (۲۱:۱۰۷)

''(اے پیغمبر!) ہم نے تمھیں نہیں بھیجا ہے مگر اس لیے کہ تمام جہان کے لیے ہماری رحمت کا ظہور ہے!''

مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ

''ربوبیّت'' اور ''رحمت'' کے بعد جس صفت کا ذکر کیا گیا ہے وہ ''عدالت'' ہے اور اس کے لیے ''مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ'' کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔

اَلدِّیۡنِ

سامی زبانوں کا ایک قدیم مادہ ''دان'' اور ''دین'' ہے۔ جو بدلے اور مکافات کے معنوں میں بولا جاتا تھا۔

اور پھر آئین و قانون کے معنوں میں بھی بولا جانے لگا۔ چنانچہ عبرانی اور آرامی میں اس کے متعدّد مشتقات ملتے ہیں' آرامی زبان ہی سے غالبًا یہ لفظ قدیم ایران میں بھی پہنچا اور پہلوی میں ''دیپہ'' نے شریعت و قانون کا مفہوم پیدا کر لیا۔ خورداوستا میں ایک سے زیادہ مواقع پر یہ لفظ مستعمل ہوا ہے اور زردشتیوں کی قدیم ادبیات میں انشاء و کتابت کے آئین و قواعد کو بھی ''دین دبیرہ'' کے نام سے موسوم کیا ہے۔ علاوہ بریں زردشتیوں کی ایک مذہبی کتاب کا نام ''دین کارت'' ہے جو غالبًا نویں صدی مسیحی میں عراق کے ایک موبد نے مرتب کی تھی۔

بہرحال عربی میں ''الدین'' کے معنی بدلے اور مکافات کے ہیں' خواہ اچھائی کا ہو یا برائی کا:

ستعلم لیلی ای دین تداینت

وای غریم فی التقاضی غریمها

پس "ملک یوم الدین" کے معنی ہوئے: وہ جو جزا کے دن کا حکمران ہے یعنی روز قیامت کا اس سلسلے میں کئی باتیں قابل غور ہیں:

دین کے لفظ نے جزا کی حقیقت واضح کر دی

اولاً' قرآن نے نہ صرف اس موقع پر بلکہ عام طور پر جزا کے لیے "الدین" کا لفظ اختیار کیا ہے اور اسی لیے وہ قیامت کو بھی عموماً "یوم الدین" سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ تعبیر اس لیے اختیار کی گئی کہ جزا کے بارے میں جو اعتقاد پیدا کرنا چاہتا تھا' اس کے لیے یہی تعبیر سب سے زیادہ موزوں اور واقعی تعبیر تھی۔ وہ جزا کو اعمال کا قدرتی نتیجہ اور مکافات قرار دیتا ہے۔

نزولِ قرآن کے وقت پیروانِ مذاہب کا عالمگیر اعتقاد یہ تھا کہ جزا محض خوشنودی اور اس کے قہر وغضب کا نتیجہ ہے۔ اعمال کے نتائج کو اس میں دخل نہیں۔ الوہیت اور شاہیت کا تشابہ تمام مذہبی تصورات کی طرح اس معاملے میں بھی گمراہی فکر کا موجب ہوا تھا۔ لوگ دیکھتے تھے کہ ایک مطلق العنان بادشاہ کبھی خوش ہو کر انعام و اکرام دینے لگتا ہے کبھی بگڑ کر سزائیں دینے لگتا ہے' اس لیے خیال کرتے تھے کہ خدا کا بھی ایسا ہی حال ہے۔ وہ کبھی ہم سے خوش ہو جاتا ہے کبھی غیظ و غضب میں آ جاتا ہے۔ طرح طرح کی قربانیوں اور چڑھاووں کی رسم اسی اعتقاد سے پڑی تھی۔ لوگ دیوتاؤں کا جوش غضب ٹھنڈا کرنے کے لیے قربانیاں کرتے اور ان کی نظرِ التفات حاصل کرنے کے لیے نذریں چڑھاتے۔

یہودیوں اور عیسائیوں کا عام تصور دیوبانی تصوّرات سے بلند ہو گیا تھا' لیکن جہاں تک اس معاملے کا تعلق ہے' ان کے تصوّر نے بھی کوئی وقیع ترقی نہیں کی تھی۔ یہودی بہت سے دیوتاؤں کی جگہ خاندان اسرائیل کا ایک خدا مانتے تھے' لیکن پرانے دیوتاؤں کی طرح یہ خدا بھی شاہی اور مطلق العنانی کا خدا تھا۔ وہ کبھی خوش ہو کر انھیں اپنی چہیتی قوم بنا لیتا۔ کبھی جوشِ انتقام میں آ کر بربادی و ہلاکت کے حوالے کر دیتا۔ عیسائیوں کا اعتقاد تھا کہ آدم کے

گناہ کی وجہ سے اس کی پوری نسل مغضوب ہوگئی اور جب تک خدا نے اپنی صفت ابنیت کو بشکل مسیح علیہ السلام قربان نہیں کر دیا' اس کے نسلی گناہ اور مغضوبیت کا کفارّہ نہ ہوسکا۔

مجازات عمل کا معاملہ بھی دنیا کے عالمگیر قانون فطرت کا ایک گوشہ ہے

لیکن قرآن نے جزا وسزا کا اعتقاد ایک دوسری ہی شکل ونوعیت کا پیش کیا ہے' وہ اسے خدا کا کوئی ایسا فعل نہیں قرار دیتا ہے۔ جو کائنات ہستی کے عام قوانین ونظام سے الگ ہو۔ بلکہ اسی کا ایک قدرتی گوشہ قرار دیتا ہے وہ کہتا ہے؟ کائنات ہستی کا عالمگیر قانون یہ ہے کہ ہر حالت کوئی نہ کوئی اثر رکھتی ہے اور ہر چیز کا کوئی نہ کوئی خاصہ ہے۔ ممکن نہیں یہاں کوئی شئے اپنا وجود رکھتی ہو اور اثرات ونتائج کے سلسلہ سے باہر ہو۔ پس جس طرح خدا نے اجسام ومواد میں خواص ونتائج رکھے ہیں' اسی طرح اعمال میں بھی خواص و نتائج ہیں۔ اور جس طرح جسم انسانی کے قدرتی انفعالات ہیں۔ اسی طرح روح انسانی کے لیے بھی قدرتی انفعالات ہیں۔ جسمانی مؤثرات جسم پر مرتب ہوتے ہیں معنوی مؤثرات سے روح متاثر ہوتی ہے۔ اعمال کے یہی قدرتی خواص ونتائج ہیں جنھیں جزاء وسزا سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اچھے عمل کا نتیجہ اچھائی ہے اور یہ ثواب ہے جبکہ برے عمل کا نتیجہ برائی ہے اور یہ عذاب ہے۔ ثواب اور عذاب کے ان اثرات کی نوعیت کیا ہوگی؟ وحی الٰہی نے ہماری فہم واستعداد کے مطابق اس کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس نقشہ میں ایک مرقع بہشت کا ہے اور ایک دوزخ کا۔ بہشت کے نعائم ان کے لیے ہیں جن کے اعمال بہشتی ہوں گے' دوزخ کی عقوبتیں ان کے لیے ہیں جن کے اعمال دوزخی ہوں گے:

لَا يَسْتَوِىٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ط اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝ (۵۹:۲۰)

''اصحاب جنت اور اصحاب دوزخ اپنے اعمال ونتائج میں یکساں نہیں ہو سکتے۔ کامیاب انسان وہی ہیں جو اصحاب جنت ہیں!''

جس طرح مادیات میں خواص ونتائج ہیں اسی طرح معنویات میں بھی ہیں

وہ کہتا ہے: تم دیکھتے ہو کہ فطرت ہر گوشۂ وجود میں اپنا قانون مکافات رکھتی ہے۔ ممکن نہیں کہ اس میں تغیر یا تساہل ہو۔ اب سوزش وتپش فطرت کی وہ مکافات ہوگئی جو ہر اس انسان کے لیے ہے جو آگ کے شعلوں میں ہاتھ ڈال دے گا۔ ممکن نہیں کہ تم آگ میں کودو اور اس فعل کے مکافات سے بچ جاؤ۔ پانی کا خاصہ ٹھنڈک اور رطوبت ہے۔ یعنی ٹھنڈک اور رطوبت وہ مکافات ہے جو فطرت نے پانی میں ودیعت کر دی ہے۔ اب ممکن نہیں کہ تم دریا میں اترو اور اس مکافات سے بچ جاؤ۔ پھر جو فطرت کائنات ہستی کی ہر چیز اور ہر حالت میں مکافات رکھتی ہے، کیونکر ممکن ہے کہ انسان کے اعمال کے لیے مکافات نہ رکھے؟ یہی مکافات جزا وسزا ہے۔

آگ جلاتی ہے، پانی ٹھنڈک پیدا کرتا ہے، سنکھیا کھانے سے موت، دودھ سے طاقت آتی ہے، کونین سے بخار رک جاتا ہے۔ جب اشیاء کی ان تمام مکافات پر تمھیں تعجب نہیں ہوتا، کیونکہ یہ تمہاری زندگی کی یقینیات ہیں تو پھر اعمال کے مکافات پر کیوں تعجب ہوتا ہے؟ افسوس تم پر! تم اپنے فیصلوں میں کتنے ناہموار ہو۔

تم گیہوں بوتے ہو اور تمہارے دل میں کبھی یہ خدشہ نہیں گزرتا کہ گیہوں پیدا نہیں ہوگا۔ اگر کوئی تم سے کہے کہ ممکن ہے گیہوں کی جگہ جوار پیدا ہو جائے تو تم اسے پاگل سمجھو گے۔ کیوں؟ اس لیے کہ فطرت کے قانون مکافات کا یقین تمھاری طبیعت میں راسخ ہو گیا ہے۔ تمھارے وہم وگمان میں بھی یہ خطرہ نہیں گزر سکتا کہ فطرت گیہوں لے کر اس کے بدلے میں جوار دے دے گی۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ تم یہ بھی نہیں مان سکتے کہ اچھے قسم کا گیہوں لے کر برے قسم کا گیہوں دے دے گی۔ تم جانتے ہو کہ وہ بدلا دینے میں قطعی اور شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ پھر بتاؤ! جو فطرت گیہوں کے بدلے میں گیہوں اور جوار کے بدلے جوار دے رہی ہے، کیونکر ممکن ہے کہ اچھے عمل کے بدلے اچھا اور برے عمل کے بدلے برا نتیجہ نہ رکھتی ہو؟ اَمۡ حَسِبَ الَّذِیۡنَ اجۡتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنۡ نَّجۡعَلَهُمۡ کَالَّذِیۡنَ

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ وَ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ o وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ o

(۴۵:۲۱۔۲۲)

''جولوگ برائیاں کرتے ہیں' کیا وہ سمجھتے ہیں ہم انھیں ان لوگوں جیسا کر دیں گے جو ایمان رکھتے ہیں اور جن کے اعمال اچھے ہیں؟ دونوں برابر ہو جائیں' زندگی میں بھی اور موت میں بھی؟ (اگر ان لوگوں کی فہم و دانش کا یہی فیصلہ ہے تو) افسوس ان کے فیصلے پر اور اللہ نے آسمان و زمین کو (بے کار اور عبث نہیں بنایا ہے بلکہ) حکمت و مصلحت کے ساتھ بنایا ہے' اور اس لیے بنایا ہے کہ ہر جان کو اس کی کمائی کے مطابق بدلا ملے اور یہ بدلا ٹھیک ٹھیک ملے گا کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔''

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جزاوسزا کے لیے ''الدین'' کا لفظ اختیار کیا کیونکہ مکافاتِ عمل کا مفہوم ادا کرنے کے لیے سب سے زیادہ موزوں لفظ یہی تھا۔

اصطلاح قرآنی میں ''کسب''

اور پھر یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں اس نے اچھے برے کام کرنے کو جابجا ''کسب'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ ''کسب'' کے معنی عربی میں ٹھیک ٹھیک وہی ہیں جو اردو میں کمائی کے ہیں' یعنی ایسا کام جس کے نتیجے سے تم کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہو۔ اگرچہ فائدے کی جگہ نقصان بھی ہو جائے۔ مطلب یہ ہوا کہ انسان کے لیے جزا اور سزا خود انسان ہی کی کمائی ہے' جیسی کسی کی کمائی ہوگی ویسا ہی نتیجہ پیش آئے گا۔ اگر ایک انسان نے اچھے کام کر کے اچھی کمائی کر لی ہے تو اس کے لیے اچھائی ہے۔ اگر کسی نے برائی کر کے برائی کمائی ہے تو اس کے لیے برائی ہے۔

كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ o (۵۲:۲۱)

''ہر انسان اس نتیجے کے ساتھ جو اس کی کمائی ہے' بندھا ہوا ہے۔''

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ط (۲۸۶:۲)

''(ہر انسان کے لیے وہی ہے جیسی کچھ اس کی کمائی ہو گی) جو کچھ اسے پانا ہے وہ بھی اس کی کمائی ہے اور جس کے لیے اسے جواب دہ ہونا ہے وہ بھی اس کی کمائی ہے۔''

اسی طرح قوموں اور جماعتوں کی نسبت بھی ایک عام قاعدہ بتا دیا:

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ٥ (۱۳۴:۲)

''یہ ایک امت تھی جو گزر چکی۔ اس کے لیے وہ نتیجہ تھا جو اس نے کمایا اور تمھارے لیے وہ نتیجہ ہے جو تم کماؤ گے۔ تم سے اس کی پوچھ گچھ نہیں ہو گی کہ ان لوگوں کے اعمال کیسے تھے۔''

علاوہ بریں صاف صاف لفظوں میں جا بجا یہ حقیقت واضح کر دی کہ اگر دین الٰہی نیک عملی کی ترغیب دیتا ہے اور بد عملی سے روکتا ہے تو یہ صرف اس لیے ہے کہ انسان نقصان و ہلاکت سے بچے اور نجات و سعادت حاصل کرے۔ یہ بات نہیں ہے کہ خدا کا غضب و قہر اسے عذاب دینا چاہتا ہو اور اس سے بچنے کے لیے مذہبی ریاضتوں اور عبادتوں کی ضرورت ہو۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ط وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ٥ (۴۶:۴۱)

''جس کسی نے نیک کام کیا تو اپنے لیے کیا اور جس کسی نے برائی کی تو خود اسی کے آگے آئے گی۔ اور ایسا نہیں ہے کہ تمہارا پروردگار اپنے بندوں کے لیے ظلم کرنے والا ہو!''

ایک مشہور حدیث قدسی میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے:

یَا عِبَادِیْ لو ان اولکم و اخرکم و انسکم و جنکم کانوا علی اَتْقٰی قلب رجل واحد منکم مازاد فی ملکی شیئاً یا عبادی! لو ان اولکم و اخرکم وانسکم و جنکم کانوا علی افجر قلب رجل واحد منکم' ما نقص ذلک من ملکی شیئاً. یا عبادی! لوان اولکم و اخرکم و انسکم و جنکم قاموافی صعید واحد فسألونی فاعطیت کل انسان مسألَته مانقص ذلک مما عندی الاکما ینقص المخیط اذا ادخل البحر یا عبادی! انما ھی اعمالکم احصیھا لکم ثم اوفیکم ایاھا فمن وجد خیرا فَلْیَحْمَدِ اللّٰه' و من وجد غیر ذلک فلا یلومن الانفسهٗ (مسلم عن ابی ذر رضی اللّٰه عنه)[1]

''اے میرے بندو! اگر تم میں سے سب انسان جو پہلے گزر چکے اور وہ سب جو بعد کو پیدا ہوں گے۔ اور تمام انس اور تمام جن اس شخص کی طرح نیک ہو جاتے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے تو یاد رکھو! اس سے میری خداوندی میں کچھ بھی اضافہ نہ ہوتا۔ اے میرے بندو! اگر وہ سب جو پہلے گزر چکے اور وہ سب جو بعد کو پیدا ہوں گے اور تمام انس اور تمام جن اس شخص کی طرح بدکار ہو جاتے جو تم میں سب سے بدکار ہے تو اس سے میری خداوندی میں کچھ بھی نقصان نہ ہوتا۔ اے میرے بندو! اگر وہ سب جو پہلے گزر چکے اور وہ سب جو بعد کو پیدا ہوں گے۔ ایک مقام پر جمع ہو کر مجھ سے سوال کرتے اور میں ہر انسان کو اس کی منہ مانگی مراد بخش دیتا تو میری رحمت و بخشش کے خزانے میں اس سے زیادہ کمی نہ ہوتی جتنی کمی سوئی کے ناکے جتنا پانی نکل جانے سے سمندر میں ہو سکتی ہے۔ اے میرے بندو! یاد رکھو! یہ تمھارے اعمال ہی ہیں جنہیں میں تمھارے لیے

انضباط اور نگرانی میں رکھتا ہوں اور پھر انہیں کے نتائج بغیر کسی کمی بیشی کے تمہیں واپس دے دیتا ہوں۔ پس جو کوئی تم میں اچھائی پائے چاہیے کہ اللہ کی حمد و ثنا کرے۔ اور جس کسی کو برائی پیش آئے تو چاہیے کہ خود اپنے وجود کے سوا اور کسی کو ملامت نہ کرے۔'' (مسلم شریف)

یہاں یہ خدشہ کسی کے دل میں واقع نہ ہو کہ خود قرآن نے بھی تو جا بجا خدا کی خوشنودی اور نارضامندی کا ذکر کیا ہے۔ بلاشبہ کیا ہے؟ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ انسان کی نیک عملی کا اعلیٰ درجہ یہی قرار دیتا ہے کہ جو کچھ کرے' صرف اللہ کی خوشنودی ہی کے لیے کرے۔ لیکن خدا کے جس رضا و غضب کا وہ اثبات کرتا ہے، وہ جزا اور سزا کی علت نہیں' بلکہ جزا و سزا کا قدرتی نتیجہ ہے' یعنی یہ نہیں کہتا کہ جزا و سزا محض خدا کی خوشنودی اور ناراضی کا نتیجہ ہے' نیک و بد اعمال کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ وہ کہتا ہے جزا و سزا تمام تر انسان کے اعمال کا نتیجہ ہے' اور خدا نیک عملی سے خوشنود ہوتا ہے' بد عملی ناپسند کرتا ہے' ظاہر ہے کہ یہ تعلیم قدیم اعتقاد سے نہ صرف مختصر ہے' بلکہ یکسر متضاد ہے۔

بہر حال جزا و سزا کی اس حقیقت کے لیے ''الدین'' کا لفظ نہایت موزوں لفظ ہے اور ان تمام گمراہیوں کی راہ بند کر دیتا ہے جو اس بارے میں پھیلی ہوئی تھیں۔ سورہ فاتحہ میں مجرّد اس لفظ کے استعمال نے جزا و سزا کی اصلی حقیقت آشکارا کر دی۔

الدین بمعنی قانون و مذہب

ثانیاً یہی وجہ ہے کہ مذہب اور قانون کے لیے بھی ''الدین'' کا لفظ استعمال کیا گیا' کیونکہ مذہب کا بنیادی اعتقاد مکافات عمل کا اعتقاد ہے اور قانون کی بنیاد بھی تعزیر و سیاست پر ہے۔ سورہ یوسف میں جہاں یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے چھوٹے بھائی کو اپنے پاس روک لیا تھا' وہاں فرمایا:

مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّا اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (۱۲:۷۶)

یہاں بادشاہ مصر کے دین سے مقصود اس کا قانون ہے۔

"مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْن" میں عدالت الٰہی کا اعلان ہے

ثالثاً یہاں ربوبیّت و رحمت کے بعد صفاتِ قہر وجلال میں سے کسی صفت کا ذکر نہیں کیا گیا۔ بلکہ "مٰلک یوم الدین" کی صفت بیان کی گئی جس سے عدالت الٰہی کا تصور ہمارے ذہن میں پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن نے خدا کی صفات کا جو تصور قائم کیا ہے اس میں قہر و غضب کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ البتہ عدالت ضرور ہے اور صفات قہریہ جس قدر بیان کی گئی ہیں دراصل اسی کے مظاہر ہیں۔

فی الحقیقت صفات الٰہی کے تصوّر کا یہی مقام ہے جہاں فکر انسانی نے ہمیشہ ٹھوکر کھائی۔ یہ ظاہر ہے کہ فطرتِ کائنات' ربوبیّت و رحمت کے ساتھ اپنے مجازات بھی رکھتی ہے اور اگر ایک طرف اس میں پرورش و بخشش ہے تو دوسری طرف مواخذہ و مکافات بھی ہے۔ فکرِ انسانی کے لیے فیصلہ طلب سوال یہ تھا کہ فطرت کے مجازات اس کے قہر و غضب کا نتیجہ ہیں یا عدل و قسط کے؟ اس کا فکر نارسا عدل و قسط کی حقیقت معلوم نہ کر سکا۔ اس نے مجازات کو قہر و غضب پر محمول کر لیا اور یہیں سے خدا کی صفات میں خوف و دہشت کا تصور پیدا ہو گیا۔ حالانکہ اگر وہ فطرتِ کائنات کو زیادہ قریب ہو کر دیکھ سکتا تو معلوم کر لیتا کہ جن مظاہر کو قہر و غضب پر محمول کر رہا ہے وہ قہر و غضب کا نتیجہ نہیں ہیں' بلکہ عین مقتضاء رحمت ہیں۔ اگر فطرت کائنات میں مکافات کا مواخذہ نہ ہوتا یا تعمیر کی تحسین و تکمیل کے لیے تخریب نہ ہوتی تو میزان عدل قائم نہ رہتا اور تمام نظامِ ہستی درہم برہم ہو جاتا۔

تصورِ الٰہی کی تمام تصویروں میں (قرآن) کی تصویر جامع اور بلند تر ہے۔ اس سلسلے میں حسب ذیل امور قابل غور ہیں۔

تنزیہ کی تکمیل:

اولاً تجسم اور تنزیہہ کے لحاظ سے قرآن کا تصورِ الٰہی، تنزیہہ کی ایسی تکمیل ہے جس کی کوئی نمود اس وقت دنیا میں موجود نہیں تھی۔ قرآن سے پہلے تنزیہہ کا بڑے سے بڑا مرتبہ جس کا ذہن انسانی متحمل ہو سکا تھا، یہ تھا کہ اصنام پرستی کی جگہ ایک ان دیکھے خدا کی پرستش

کی جائے، لیکن جہاں تک صفاتِ الٰہی کا تعلق ہے، انسانی اوصاف و جذبات کی مشابہت اور جسم و ہیئت کے تمثل سے کوئی تصوّر بھی خالی نہ تھا۔ ہندوستان اور یونان کا حال ہم دیکھ چکے ہیں۔ یہودی تصور جس نے اصنام پرستی کی کوئی شکل بھی جائز نہیں رکھی تھی، وہ بھی اس طرح کے تشبہ و تمثّل سے یکسر آلودہ ہے۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا خدا کو ممرے کے بلوطوں میں دیکھنا، خدا کا حضرت یعقوب (علیہ السلام) سے کشتی لڑنا، کوہ طور پر شعلوں کے اندر نمودار ہونا، حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا خدا کو پیچھے سے دیکھنا، خدا کا جوشِ غضب میں آ کر کوئی کام کر بیٹھنا اور پھر پچھتانا۔ بنی اسرائیل کو اپنی چہیتی بیوی بنا لینا اور پھر اس کی بدچلنی پر ماتم کرنا، ہیکل کی تباہی پر اس کا نوحہ، اس کی انتڑیوں میں درد کا اٹھنا اور کلیجے میں سوراخ پڑ جانا تورات کا عام اسلوبِ بیان ہے۔

اصل یہ ہے کہ قرآن سے پہلے فکر انسانی اس درجہ بلند نہیں ہوا تھا کہ تمثیل کا پردہ ہٹا کر صفاتِ الٰہی کا جلوہ دیکھ لیتا۔ اس لیے ہر تصور کی بنیاد تمام تر تمثیل و تشبیہہ ہی پر رکھنی پڑی۔ مثلاً تورات میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف زبور کے ترانوں اور یشعیا کی کتاب میں خدا کے لیے شائستہ صفات کا تخیل موجود ہے۔ لیکن دوسری طرف خدا کا کوئی مخاطبہ ایسا نہیں جو سرتاسر انسانی اوصاف و جذبات کی تشبیہہ سے مملو نہ ہو۔ حضرت مسیح نے جب چاہا کہ رحمتِ الٰہی کا عالمگیر تصور پیدا کریں تو وہ بھی مجبور ہوئے کہ خدا کے لیے باپ کی تشبیہہ سے کام لیں۔ اسی تشبیہہ سے ظاہر پرستوں نے ٹھوکر کھائی اور ابنیّتِ مسیح کا عقیدہ پیدا کر لیا۔

لیکن ان تمام تصورات کے بعد جب ہم قرآن کی طرف رُخ کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اچانک فکر و تصور کی ایک نئی دنیا سامنے آ گئی۔ یہاں تمثیل و تشبیہہ کے تمام پردے بہ یک دفعہ اٹھ جاتے ہیں، انسانی اوصاف و جذبات کی مشابہت مفقود ہو جاتی ہے، ہر گوشے میں مجاز کی جگہ حقیقت کا جلوہ نمایاں ہو جاتا ہے اور تجسّم کا شائبہ تک باقی نہیں رہتا۔ تنزیہہ اس مرتبۂ کمال تک پہنچ جاتی ہے کہ:

لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡءٌ (۴۲:۱۱)

''اس کے مثل کوئی شے نہیں' کسی چیز سے بھی تم اسے مشابہ نہیں ٹھہرا سکتے۔''

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ. (٦: ١٠٣)

''انسان کی نگاہیں اسے نہیں پا سکتیں' لیکن وہ انسان کی نگاہوں کو دیکھ رہا ہے (اور وہ بڑا ہی باریک بین (اور) باخبر ہے۔)''

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ لَمْ يَلِدْ ۚ وَلَمْ يُوْلَدْ ۚ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۚ (١١٢: ١-٤)

''اللہ کی ذات یگانہ ہے' بے نیاز ہے۔ اسے کسی کی احتیاج نہیں۔ نہ تو اس سے کوئی پیدا ہوا' نہ وہ کسی سے پیدا ہوا' اور نہ کوئی ہستی اس کے درجے اور برابری کی ہوئی۔''

تورات اور قرآن کے جو مقامات مشترک ہیں' دقّتِ نظر کے ساتھ ان کا مطالعہ کرو۔ تورات میں جہاں کہیں خدا کی براہِ راست نمود کا ذکر کیا گیا ہے' قرآن وہاں خدا کی تجلّی کا ذکر کرتا ہے۔ تورات میں جہاں یہ پاؤ گے کہ خدا متشکّل ہو کر اترا' قرآن اس موقع کی یوں تعبیر کرے گا کہ خدا کا فرشتہ متشکّل ہو کر نمودار ہوا۔ بطور مثال کے صرف ایک مقام پر نظر ڈال لی جائے تورات میں ہے:

''خداوند نے کہا: اے موسیٰ دیکھ! یہ جگہ میرے پاس ہے تو اس چٹان پر کھڑا رہ اور یوں ہوگا کہ جب میرے جلال کا گزر ہوگا تو میں تجھے اس چٹان کی دراڑ میں رکھوں گا اور جب تک نہ گزر لوں گا' تجھے اپنی ہتھیلی سے ڈھانپے رہوں گا۔ پھر ایسا ہوگا کہ میں ہتھیلی اٹھا لوں گا اور تو میرا پیچھا دیکھ لے گا' لیکن تو میرا چہرہ نہیں دیکھ سکتا۔ (خروج ۳۳: ۲۱-۲۳)

''تب خداوند بدلی کے ستون میں ہو کر اترا اور خیمے کے دروازے پر کھڑا رہا...... اس نے کہا کہ میرا بندہ موسیٰ اپنے خداوند کی شبیہ دیکھے گا۔'' (گنتی ۱۲: ۵-۸)

اسی معاملے کی تعبیر قرآن نے یوں کی ہے:

قَالَ رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْکَ ط قَالَ لَنْ تَرٰنِیْ وَلٰکِنِ انْظُرْ اِلَی الْجَبَلِ (۷:۱۴۳)

''موسیٰ نے کہا: اے پروردگار! مجھے اپنا جلوہ دکھا تا کہ میں تیری طرف نگاہ کر سکوں۔ فرمایا نہیں، تو کبھی مجھے نہیں دیکھے گا۔ لیکن ہاں اس پہاڑ کی طرف دیکھ!''

تنزیہہ اور تعطیل کا فرق:

البتہ یاد رہے کہ تنزیہہ اور تعطیل میں فرق ہے۔ تنزیہہ سے مقصود یہ ہے کہ جہاں تک عقل بشری کی پہنچ ہے، صفاتِ الٰہی کو مخلوقات کی مشابہت سے پاک اور بلند رکھا جائے۔ تعطیل کے معنی یہ ہیں کہ تنزیہہ کے منع و نفی کو اس حد تک پہنچا دیا جائے کہ فکرِ انسانی کے تصوّر کے لیے کوئی بات باقی ہی نہ رہے۔ قرآن کا تصور تنزیہہ کی تکمیل ہے، تعطیل کی ابتدا نہیں ہے۔

جس طرح اثباتِ صفات میں غلو تشبہ کی طرف لے جاتا ہے، اسی طرح نفیٔ صفات میں غلو تعطیل تک پہنچا دیتا ہے اور دونوں میں تصورِ انسانی کے لیے ٹھوکر ہوئی۔ اگر تشبّہ اسے حقیقت سے ناآشنا کر دیتا ہے تو تعطّل اسے عقیدے کی روح سے محروم کر دیتا ہے۔ پس یہاں ضروری ہوا کہ افراط اور تفریط دونوں سے قدم روکے جائیں اور تشبّہ اور تعطیل دونوں کے درمیان راہ نکالی جائے۔ چنانچہ قرآن نے جو راہ اختیار کی ہے وہ دونوں راہوں کے درمیان جاتی ہے اور دونوں انتہائی سمتوں کے میلان سے بچتی ہوئی نکل گئی ہے۔

اگر خدا کے تصوّر کے لیے صفات و افعال کی کوئی صورت ایسی باقی نہ رہے جو فکر انسانی کی پکڑ میں آ سکتی ہے تو کیا نتیجہ نکلے گا؟ یہی نکلے گا کہ تنزیہہ کے معنی نفی وجود کے ہو جائیں گے، یعنی اگر کہا جائے ''ہم خدا کے لیے کوئی ایجابی صفت قرار نہیں دے سکتے، کیونکہ جو صفت بھی قرار دیں گے، اس میں مخلوق کے اوصاف سے مشابہت کی جھلک آ جائے گی۔'' تو ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں فکر انسانی کے لیے کوئی سررشتۂ تصوّر باقی نہیں رہے گا اور وہ کسی ایسی ذات کا تصور ہی نہیں کر سکے گا اور جب تصوّر نہیں کر سکے گا تو ایسا عقیدہ اس کے اندر کوئی پکڑ اور لگاؤ بھی پیدا نہیں کر سکے گا۔ ایسا تصوّر اگرچہ اثباتِ وجود کی

کوشش کرے لیکن فی الحقیقت وہ نفیِ وجود کا تصور ہوگا کیونکہ صرف سلبی تصور کے ذریعے ہم ہستی کو نیستی سے جدا نہیں کر سکتے۔

خدا کی ہستی کا اعتقاد انسانی فطرت کے اندرونی تقاضوں کا جواب ہے۔ اسے حیوانی سطح سے بلند ہونے اور انسانیتِ اعلیٰ کے درجے تک پہنچنے کے لیے بلندی کے ایک نصب العین کی ضرورت ہے اور اس نصب العین کی طلب بغیر کسی ایسے تصوّر کے پوری نہیں ہو سکتی۔ جو کسی نہ کسی شکل میں اس کے سامنے آئے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ مطلق کا تصوّر سامنے آ نہیں سکتا۔ وہ جبھی آئے گا کہ ایجابی صفتوں کے تشخّص کا کوئی نہ کوئی نقاب چہرے پر ڈال لے۔ چنانچہ ہمیشہ اس نقاب ہی کے ذریعے جمالِ حقیقت کو دیکھنا پڑا۔ یہ کبھی بھاری ہوا، کبھی ہلکا، کبھی پُرخوف رہا، کبھی دل آویز، مگر اترا کبھی نہیں۔

آہ ازاں حوصلۂ تنگ و ازاں حسن بلند
کہ دلم راگلہ از حسرت دیدار تو نیست

جمالِ حقیقت بے نقاب ہے، مگر ہماری نگاہوں میں یارائے دید نہیں۔ ہم اپنی نگاہوں پر نقاب ڈال کر اسے دیکھنا چاہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس کے چہرے پر نقاب پڑ گیا۔

ہر چہ ہست از قامتِ ناساز و بی اندام ماست
ورنہ تشریف تو بر بالائے کس دشوار نیست

غیر صفاتی تصور کو انسان پکڑ نہیں سکتا اور طلب اسے ایسے مطلوب کی ہوئی جو اس کی پکڑ میں آ سکے۔ وہ ایک ایسا جلوۂ محبوبی چاہتا ہے، جس کے عشق میں اس کا دل اٹک سکے، جس کے حسنِ گریزاں کے پیچھے وہ والہانہ دوڑ سکے، جس کا دامنِ کبریائی پکڑنے کے لیے ہمیشہ اپنا دستِ عجز و نیاز بڑھاتا رہے۔ جو اگرچہ زیادہ سے زیادہ بلندی پر ہو لیکن پھر بھی اسے ہر دم جھانک لگائے تاک رہا ہو کہ اِنَّ رَبَّکَ لَبِا لْمِرْصَادِ ۝ (۱۴:۸۹) اور وَاِذَا سَأَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ط اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (۱۸۶:۲)

در پردهٔ و برہمہ کس پردہ می دری
با ہر کسی و با تو کسی را وصال نیست

غیر صفاتی تصور محض نفی وسلب ہوتا ہےاوراس سے انسانی طلب کی پیاس نہیں بجھ سکتی۔ ایسا تصور ایک فلسفیانہ تخیل ضرور پیدا کردے گا، لیکن دلوں کا زندہ اور سرگرم عقیدہ نہیں بن سکے گا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جو راہ اختیار کی وہ ایک طرف تو تنزیہہ کو اس کے کمال درجے تک پہنچا دیتی ہے، دوسری طرف تعطیل سے بھی تصور کو بچالے جاتی ہے۔ وہ فرداً فرداً تمام صفات وافعال کا اثبات کرتا ہے۔ مگر ساتھ ہی مشابہت کی قطعی نفی بھی کرتا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے: خدا حسن وخوبی کی ان تمام صفتوں سے جو انسانی فکر میں آ سکتی ہیں متصف ہے۔ وہ زندہ ہے، قدرت والا ہے، پالنے والا ہے، رحمت والا ہے، دیکھنے والا، سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔ اور پھر اتنا ہی نہیں، بلکہ انسان کی بول چال میں قدرت واختیار اور ارادہ و فعل کی جتنی شائستہ تعبیرات ہیں، انہیں بھی بلا تامل استعمال کرتا ہے۔ مثلاً خدا کے ہاتھ تنگ نہیں: بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوْطَتَانِ (۵:۶۴) اس کے تحت حکومت و کبریائی کے احاطے سے کوئی گوشہ باہر نہیں: وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۲:۲۵۵) لیکن یہ بھی صاف صاف اور بے لچک لفظوں میں کہہ دیتا ہے کہ اس سے مشابہ کوئی چیز نہیں جو تمہارے تصور میں آ سکتی۔ وہ عدیم المثال ہے۔ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (۴۲:۱۱) تمہاری نگاہ اسے پا ہی نہیں سکتی: لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ (۶:۱۰۳) تم اس کے لیے اپنے تخیل سے مثالیں نہ گھڑو: فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ (۱۶:۷۴) پس ظاہر ہے کہ اس کا زندہ ہونا ہمارے زندہ ہونے کی طرح نہیں ہو سکتا۔ اس کی پروردگاری ہماری پروردگاری کی طرح نہیں ہوسکتی۔ اس کا دیکھنا، سننا، جاننا ویسا نہیں ہوسکتا جس طرح کے دیکھنے، سننے اور جاننے کا ہم تصوّر کر سکتے ہیں۔ اس کی قدرت و بخشش کا ہاتھ اور جلال واحاطے کا عرش ضرور ہے، لیکن یقیناً اس کا مطلب وہ نہیں ہوسکتا جو ان الفاظ کے مدلولات سے ہمارے ذہن میں متشکل ہونے لگتا ہے۔

قرآن کے تصوّر الٰہی کا یہ پہلو فی الحقیقت اس راہ کی تمام درماندگیوں کا ایک ہی حل

ہے اور ساری عمر کی سرگردانیوں کے بعد بالآخر اسی منزل پر پہنچ کر دم لینا پڑتا ہے۔ انسانی فکر جتنی بھی کاوشیں کرے گا' اس کے سوا اور کوئی حل پیدا نہیں کر سکے گا۔ یہاں ایک طرف بامِ حقیقت کی بلندی اور فکرِ کوتاہ کی نارسائیاں ہوئیں' دوسری طرف ہماری فطرت کا اضطرابِ طلب اور ہمارے دل کا تقاضائے دید ہوا۔ بام اتنا بلند کہ نگاہِ تصوّر تھک تھک کے رہ جاتی ہے۔ تقاضائے دید اتنا سخت کہ بغیر کسی کا جلوہ سامنے لائے چین نہیں پا سکتا۔

نہ بہ اندازۂ بازوست کمندم ہیہات
ورنہ باگوشۂ بامیم سروکاری ہست

ایک طرف راہ کی اتنی دشواریاں، دوسری طرف طلب کی اتنی سہل اندیشیاں وَلَنِعْمَ مَا قِيْلَ.

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

اگر تنزیہہ کی طرف زیادہ جھکتے ہیں تو تعطیل میں جا گرتے ہیں۔ اگر اثباتِ صفات کی صورت آرائیوں میں دور نکل جاتے ہیں تو تشبّہ اور تجسّم میں کھوئے جاتے ہیں۔ پس نجات کی راہ صرف یہی ہوئی کہ دونوں کے درمیان قدم سنبھالے رکھیں۔ اثبات کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹے' تنزیہہ کی باگ بھی ڈھیلی نہ پڑنے پائے۔ اثبات اس کی دل آویز صفتوں کا مرقع کھینچے گا' تنزیہہ تشبہ کی پرچھائیں بچھاتی رہے گی۔ ایک کا ہاتھ حسنِ مطلق کو صورت صفات میں جلوہ آراء کر دے گا' دوسرے کا ہاتھ اسے اتنی بلندی پر تھامے رہے گا کہ تشبّہ کا گرد و غبار اسے چھونے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔

بر چہرۂ حقیقت اگر ماند پردۂ
جرمِ نگاہ دیدۂ صورت پرست ماست

صفات رحمت و جمال:

ثانیاً' تنزیہہ کی طرح صفاتِ رحمت و جمال کے لحاظ سے بھی قرآن کے تصوّر پر نظر ڈالی جائے تو اس کی شان تکمیل نمایاں ہے۔ نزول قرآن کے وقت یہودی تصوّر میں قہر و

غضب کا عنصر غالب تھا' مجوسی تصوّر نے نور و ظلمت کی دو مساویانہ قوتیں الگ الگ بنالی تھیں' مسیحی تصوّر نے رحم و محبت پر زور دیا تھا' لیکن جزا کی حقیقت مستور ہو گئی تھی۔ اسی طرح پیروانِ بدھ نے بھی صرف رحم و محبت پر زور دیا' عدالت نمایاں نہیں ہوئی۔ گویا جہاں تک رحمت و جمال کا تعلق ہے یا تو قہر و غضب کا عنصر غالب تھا' یا مساوی تھا' یا پھر رحمت و محبت آئی تھی تو اس طرح آئی تھی کہ عدالت کے لیے کوئی جگہ باقی نہیں رہی تھی۔

لیکن قرآن نے ایک طرف تو رحمت و جمال کا ایک ایسا کامل تصوّر پیدا کر دیا کہ قہر و غضب کے لیے کوئی جگہ ہی نہ رہی' دوسری طرف جزائے عمل کا سر رشتہ بھی ہاتھ سے نہیں دیا' کیونکہ جزاء کا اعتقاد قہر و غضب کی بناء پر نہیں' بلکہ عدالت کی بناء پر قائم کر دیا۔ چنانچہ صفاتِ الٰہی کے بارے میں اس کا عام اعلان یہ ہے:

قُلِ ادْعُو اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنِ ؕ اَيًّامَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ؕ (۱۷:۱۱۰)

"اے پیغمبر! ان سے کہہ دو تم خدا کو اللہ کے نام سے پکارو۔ یا رحمٰن کہہ کر پکارو' جس صفت سے بھی پکارو اس کی ساری صفتیں حسن و خوبی کی صفتیں ہیں۔"

یعنی وہ خدا کی تمام صفتوں کو "اسمائے حسنٰی" قرار دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خدا کی کوئی صفت ایسی نہیں جو حسن و خوبی کی صفت نہ ہو۔ یہ صفتیں کیا کیا ہیں؟ قرآن نے پوری وسعت کے ساتھ انھیں جا بجا بیان کیا ہے۔ ان میں ایسی صفتیں بھی ہیں جو بظاہر قہر و جلال کی صفتیں ہیں' مثلاً جبار' قہار۔ لیکن قرآن کہتا ہے وہ بھی "اسمائے حسنٰی" ہیں' کیونکہ ان میں قدرت و عدالت کا ظہور ہوا ہے۔ اور قدرت و عدالت حسن و خوبی ہے' خونخواری و خوفناکی نہیں ہے۔ چنانچہ سورۂ حشر میں صفاتِ رحمت و جمال کے ساتھ قہر و جلال کا بھی ذکر کیا ہے اور پھر متصلاً ان سب کو "اسمائے حسنٰی" قرار دیا ہے۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِىْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ؕ سُبْحَانَ اللّٰهِ

عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ٥ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ؕ يُسَبِّحُ لَهُ مَافِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ٥ (۵۹:۲۳-۲۴)

''وہ اللہ ہے' اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ الملک ہے' القدوس ہے' السلام ہے' المومن ہے' المہیمن ہے' العزیز الجبار ہے' المتکبر ہے اور اس ساجھے سے پاک ہے جو لوگوں نے اس کی معبودیّت میں بنا رکھے ہیں۔ وہ الخالق ہے' الباری ہے' المصوّر ہے (غرض کہ) اس کے لیے حسن و خوبی کی صفتیں ہیں۔ آسمان و زمین میں جتنی بھی مخلوقات ہیں سب اس کی پاکی اور عظمت کی شہادت دے رہی ہیں اور بلاشبہ وہی ہے جو حکمت کے ساتھ غلبہ وتوانائی بھی رکھنے والا ہے!''

اسی طرح سورۂ اعراف میں ہے:

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۖ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ؕ (۷:۱۸۰)

''اور اللہ کے لیے حسن وخوبی کی صفتیں ہیں' سو چاہیے کہ ان صفتوں سے اسے پکارو اور جن لوگوں کا شیوہ یہ ہے کہ اس کی صفتوں میں کج اندیشیاں کرتے ہیں انھیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔''

چنانچہ اسی لیے سورۂ فاتحہ میں صرف تین صفتیں نمایاں ہوئیں: ربوبیّت' رحمت اور عدالت۔ اور قہر وغضب کی کسی صفت کو یہاں جگہ نہ دی گئی۔

اشرا کی تصورات کا کُلّی انسداد:

ثالثاً' جہاں تک توحید و اشراک کا تعلق ہے قرآن کا تصوّر اس درجہ کامل اور بے لچک ہے کہ اس کی کوئی نظیر پچھلے تصوّرات میں نہیں مل سکتی۔

اگر خدا اپنی ذات میں یگانہ ہے تو ضروری ہے کہ وہ اپنی صفات میں بھی یگانہ ہو'

کیونکہ اس کی یگانگت کی عظمت قائم نہیں رہ سکتی اگر کوئی دوسری ہستی اس کے صفات میں شریک وسہیم مان لی جائے۔قرآن سے پہلے توحید کے ایجابی پہلو پر تو تمام مذاہب نے زور دیا تھا لیکن سلبی پہلو نمایاں نہیں ہو سکا تھا۔ ایجابی پہلو یہ ہے کہ خدا ایک ہے، سلبی یہ ہے کہ اس کی طرح کوئی نہیں۔ اور جب اس کی طرح کوئی نہیں تو ضروری ہے کہ جو صفتیں اس کے لیے ٹھہرا دی گئی ہیں ان میں کوئی دوسری ہستی شریک نہ ہو۔ پہلی بات توحید فی الذات سے اور دوسری توحید فی الصفات سے تعبیر کی گئی ہے۔قرآن سے پہلے اقوام عالم کی استعداد اس درجہ بلند نہیں ہوئی تھی کہ توحید فی الصفات کی نزاکتوں اور بندشوں کی متحمل ہو سکتی، اس لیے مذاہب نے تمام تر زور توحید فی الذات ہی پر دیا، توحید فی الصفات اپنی ابتدائی اور سادہ حالت میں چھوڑ دی گئی۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں باوجودیکہ تمام مذاہب قبل از قرآن میں عقیدۂ توحید کی تعلیم موجود تھی، لیکن کسی نہ کسی صورت میں شخصیت پرستی، عظمت پرستی اور اصنام پرستی نمودار ہوتی رہی اور راہ نمایانِ مذاہب اس کا دروازہ بند نہ کر سکے۔ ہندوستان میں تو غالباً اول روز ہی سے یہ بات تسلیم کر لی گئی تھی کہ عوام کی تشفی کے لیے دیوتاؤں اور انسانی عظمت کی پرستاری ناگزیر ہے اور اس لیے توحید کا مقام صرف خواص کے لیے مخصوص ہونا چاہیے۔ فلاسفۂ یونان کا بھی یہی خیال تھا۔ یقیناً وہ اس بات سے بے خبر نہ تھے کہ کوہ اولیمپس کے دیوتاؤں کی کوئی اصلیت نہیں، تاہم سقراط کے علاوہ کسی نے بھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ عوام کے اصنامی عقائد میں خلل انداز ہو۔ وہ کہتے تھے: ''اگر دیوتاؤں کی پرستش کا نظام قائم نہ رہا تو عوام کی مذہبی زندگی درہم برہم ہو جائے گی۔'' فیثا غورث کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ جب اس نے اپنا مشہور حسابی قاعدہ معلوم کیا تھا تو اس کے شکرانے میں سو بچھڑوں کی قربانی دیوتاؤں کی نذر کی تھی۔

اس بارے میں سب سے زیادہ نازک معاملہ معلّم و رہنما کی شخصیت کا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ کوئی تعلیم عظمت و رفعت حاصل نہیں کر سکتی جب تک معلّم کی شخصیّت میں بھی

عظمت کی شان پیدا نہ ہو۔ لیکن شخصیّت کی عظمت کے حدود کیا ہیں؟ یہیں آ کر سب کے قدموں نے ٹھوکر کھائی۔ وہ اس کی ٹھیک ٹھیک حد بندی نہ کر سکے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کبھی شخصیّت کو خدا کا اوتار بنا دیا، کبھی ابن اللہ سمجھ لیا، کبھی شریک و سہیم ٹھہرا دیا اور اگر یہ نہیں کیا تو کم از کم اس کی تعظیم میں بندگی و نیاز کی سی شان پیدا کر دی۔ یہودیوں نے اپنے ابتدائی عہد کی گمراہیوں کے بعد کبھی ایسا نہیں کیا کہ پتھر کے بت تراش کران کی پوجا کی ہو، لیکن اس بات سے وہ بھی نہ بچ سکے کہ اپنے نبیوں کی قبروں پر ہیکل تعمیر کر کے انہیں عبادت گاہوں کی سی شان و تقدیس دے دیتے تھے۔ گوتم بدھ کی نسبت معلوم ہے کہ اس کی تعلیم میں اصنام پرستی کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس کی آخری وصیّت جو ہم تک پہنچی ہے یہ ہے ''ایسا نہ کرنا کہ میری نعش کی راکھ کی پوجا شروع کر دو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو یقین کرو، نجات کی راہ تم پر بند ہو جائے گی۔''[1]

لیکن اس وصیّت پر جیسا کچھ عمل کیا گیا وہ دنیا کے سامنے ہے۔ نہ صرف بدھ کی خاک اور یادگاروں پر معبد تعمیر کئے گئے، بلکہ مذہب کی اشاعت کا ذریعہ ہی یہ سمجھا گیا کہ اس کے مجسّموں سے زمین کا کوئی گوشہ خالی نہ رہے۔ یہ واقعہ ہے کہ دنیا میں کسی معبود کے بھی اتنے مجسّمے نہیں بنائے گئے جتنے گوتم بدھ کے بنائے گئے ہیں۔ اسی طرح ہمیں معلوم ہے کہ مسیحیّت کی حقیقی تعلیم سرتاسر توحید کی تعلیم تھی، لیکن ابھی اس کے ظہور پر پورے سو برس بھی نہیں گزرے تھے کہ الوہیّتِ مسیح کا عقیدہ نشو و نما پا چکا تھا۔

توحید فی الصفات:

لیکن قرآن نے توحید فی الصفات کا ایسا کامل نقشہ کھینچ دیا کہ اس طرح کی لغزشوں کے تمام دروازے بند ہو گئے۔ اس نے صرف توحید ہی پر زور نہیں دیا، بلکہ شرک کی راہیں بھی بند کر دیں اور یہی اس باب میں اس کی خصوصیّت ہے۔

وہ کہتا ہے ''ہر طرح کی عبادت اور نیاز کی مستحق صرف خدا ہی کی ذات ہے۔ پس اگر تم نے عابدانہ عجز و نیاز کے ساتھ کسی دوسری ہستی کے سامنے سر جھکایا تو توحید الٰہی کا

اعتقاد باقی نہ رہا۔" وہ کہتا ہے "یہ اسی کی ذات ہے جو انسانوں کی پکار سنتی اور ان کی دعائیں قبول کرتی ہے۔ پس اگر تم نے اپنی دعاؤں اور طلب گاریوں میں کسی دوسری ہستی کو بھی شریک کرلیا تو گویا تم نے اسے خدا کی خدائی میں شریک کرلیا" وہ کہتا ہے: دعا، استعانت، رکوع، سجود، عجز و نیاز، اعتماد و توکّل اور اس طرح کے تمام عبادت گزارانہ اور نیاز مندانہ اعمال وہ اعمال ہیں جو خدا اور اس کے بندوں کا باہمی رشتہ قائم کرتے ہیں۔ پس اگر ان اعمال میں تم نے کسی دوسری ہستی کو بھی شریک کرلیا تو خدا کے رشتۂ معبودیّت کی یگانگی باقی نہ رہی۔ اسی طرح عظمتوں، کبریائیوں، کارسازیوں اور بے نیازیوں کا جو اعتقاد تمہارے اندر خدا کی ہستی کا تصور پیدا کرتا ہے، وہ صرف خدا ہی کے لیے مخصوص ہونا چاہیے۔ اگر تم نے ویسا ہی اعتقاد کسی دوسری ہستی کے لیے بھی پیدا کرلیا تو تم نے اسے خدا کا ندّ یعنی شریک ٹھہرالیا اور توحید کا اعتقاد درہم برہم ہوگیا۔

یہی وجہ ہے کہ سورۂ فاتحہ میں اِیَّاکَ نَعْبُدُوَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْن کی تلقین کی گئی۔ اس میں اول تو عبادت کے ساتھ استعانت کا بھی ذکر کیا گیا، پھر دونوں جگہ مفعول کو مقدّم کیا جو مفیدِ حصر ہے۔ یعنی "صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھی سے مدد طلب کرتے ہیں۔" اس کے علاوہ تمام قرآن میں اس کثرت کے ساتھ توحید فی الصفات اور ردّ اشراک پر زور دیا گیا ہے کہ شاید ہی کوئی سورت بلکہ کوئی صفحہ اس سے خالی ہو۔

مقامِ نبوت کی حد بندی:

سب سے زیادہ اہم مسئلہ مقامِ نبوّت کی حد بندی کا تھا، یعنی معلّم کی شخصیّت کو اس کی اصلی جگہ میں محدود کردینا، تاکہ شخصیّت پرستی کا ہمیشہ کے لیے سدّ باب ہوجائے۔ اس بارے میں قرآن نے جس طرح صاف اور قطعی لفظوں میں جابجا پیغمبرِ اسلام کی بشریّت اور بندگی پر زور دیا ہے محتاجِ بیان نہیں۔ ہم یہاں صرف ایک بات کی طرف توجہ دلائیں گے۔ اسلام نے اپنی تعلیم کا بنیادی کلمہ جو قرار دیا ہے، وہ سب کو معلوم ہے۔ اَشْھَدُ اَنْ لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ. یعنی "میں اقرار کرتا ہوں کہ خدا

کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اقرار کرتا ہوں کہ محمد ﷺ خدا کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔'' اس اقرار میں جس طرح خدا کی توحید کا اعتراف کیا گیا ہے' ٹھیک اسی طرح پیغمبر اسلام کی بندگی اور درجۂ رسالت کا بھی اعتراف ہے۔ غور کرنا چاہیے کہ ایسا کیوں کیا گیا؟ صرف اس لیے کہ پیغمبر اسلام کی بندگی اور درجۂ رسالت کا اعتقاد اسلام کی اصل واساس بن جائے اور اس کا کوئی موقع ہی باقی نہ رہے کہ عبدیّت کی جگہ معبودیّت کا اور رسالت کی جگہ اوتار کا تخیّل پیدا ہو۔ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ اس معاملہ کا تحفظ کیا کیا جا سکتا تھا؟ کوئی شخص دائرۂ اسلام میں داخل ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ خدا کی توحید کی طرح پیغمبر اسلام کی بندگی کا بھی اقرار نہ کر لے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں' پیغمبر اسلام ﷺ کی وفات کے بعد مسلمانوں میں بہت سے اختلافات پیدا ہوئے' لیکن ان کی شخصیت کے بارے میں کبھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوا۔ ابھی ان کی وفات پر چند گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے برسرِ منبر اعلان کر دیا تھا۔

مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَاِنْ مُحَمَّدًا قَدْمَاتَ وَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ يَعْبُدُ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ حَيٌّ لَّا يَمُوْتُ ط (بخاری)

''جو کوئی تم میں محمد (ﷺ) کی پرستش کرتا تھا' سو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ محمد (ﷺ) نے وفات پائی' اور جو کوئی تم میں سے اللہ کی پرستش کرتا تھا تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کی ذات ہمیشہ زندہ ہے' اس کے لیے موت نہیں۔''

عوام اور خاص دونوں کے لیے ایک تصویر:

رابعاً قرآن سے پہلے علوم وفنون کی طرح مذہبی عقائد میں بھی خاص و عام کا امتیاز ملحوظ رکھا جاتا تھا اور خیال کیا جاتا تھا کہ خدا کا ایک تصوّر تو حقیقی ہے اور خواص کے لیے ہے' ایک تصوّر مجازی ہے اور عوام کے لیے ہے۔ لیکن قرآن نے حقیقت ومجاز یا خاص و عام کا کوئی امتیاز باقی نہ رکھا۔ اس نے سب کو خدا پرستی کی ایک ہی راہ دکھائی اور سب کے لیے

صفاتِ الٰہی کا ایک ہی تصوّر پیش کر دیا۔ وہ حکماء و عرفاء سے لے کر جہاؔل و عوام تک سب کو حقیقت کا ایک ہی جلوہ دکھاتا ہے اور سب پر اعتقاد و ایمان کا ایک ہی دراز ہ کھولتا ہے۔ اس کا تصوّر جس طرح ایک حکیم و عارف کے لیے سرمایۂ تفکّر ہے‘ اسی طرح ایک چرواہے اور دہقان کے لیے سرمایۂ تسکین۔

بہر حال قرآن کے تصوّرِ الٰہی کی ایک بنیادی خصوصیّت یہ ہے کہ اس نے کسی طرح کی اعتقادی مفاہمت اس بارے میں جاری نہیں رکھی۔ وہ اپنے توحیدی اور تنزیہی تصور میں سرتاسر بے میل اور بے لچک رہا۔ اس کی یہ مضبوط جگہ کسی طرح بھی ہمیں روادارانہ طرز عمل سے روکنا نہیں چاہتی‘ البتہ اعتقادی مفاہمتوں کے تمام دروازے بند کر دیتی ہے۔

خامساً، قرآن نے تصوّرِ الٰہی کی بنیاد انسان کے عالمگیر وجدانی احساس پر رکھی ہے۔ یہ نہیں کیا ہے کہ اسے نظر و فکر کی کاوشوں کا ایک ایسا معمّہ بنا دیا ہو جسے کسی خاص طبقے کا ذہن ہی حل کر سکے۔ انسان کا عالمگیر وجدانی احساس کیا ہے؟ یہ ہے کہ کائنات ہستی خود بخود پیدا نہیں ہوگئی‘ پیدا کی گئی ہے‘ اور اس لیے ضروری ہے کہ ایک صانع ہستی موجود ہو۔ پس قرآن بھی اس بارے میں عام طور پر جو کچھ بتلاتا ہے‘ وہ اتنا ہی ہے۔ اس سے زیادہ جو کچھ ہے‘ وہ مذہبی عقیدے کا معاملہ نہیں ہے‘ انفرادی اور ذاتی تجربے و احوال کا معاملہ ہے۔ اس لیے وہ اس کا بوجھ جماعت کے افکار پر نہیں ڈالتا‘ اسے اصحاب جہد و طلب کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَاؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (۲۹:۶۹)

’’اور جو لوگ ہم تک پہنچنے کے لیے کوشش کریں گے تو ہم بھی ضرور ان پر راہ کھول دیں گے۔ اور اللہ نیک کرداروں سے الگ کب ہے؟ وہ تو ان کے ساتھ ہے۔‘‘

وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ۝ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا

تُبۡصِرُوۡنَ○ (۵۱:۲۰-۲۱)

''اوران لوگوں کے لیے جو یقین رکھتے ہیں' زمین میں کتنی ہی حقیقت کی نشانیاں ہیں' اور خود تمہارے اندر بھی' پھر کیا تم دیکھتے نہیں؟''

....

بار ہا مجھے خیال ہوا کہ ہم خدا کی ہستی کا اقرار کرنے پر اس لیے بھی مجبور ہیں کہ اگر نہ کریں تو کارخانۂ ہستی کے معمے کا کوئی حل باقی نہیں رہتا اور ہمارے اندر ایک حل کی طلب ہے جو ہمیں مضطرب رکھتی ہے:

آں کہ ایں نامۂ سربستہ نوشتہ است نخست
گرہے سخت بہ سررشتہ مضمون زدہ است

اگر ایک الجھا ہوا معاملہ ہمارے سامنے آتا ہے اور ہمیں اس کے حل کی جستجو ہوتی ہے تو ہم کیا کرتے ہیں؟ ہمارے اندر بالطبع یہ بات موجود ہے اور منطق اور ریاضی نے اسے راہ پر لگایا ہے کہ ہم الجھاؤ پر غور کریں گے۔ ہر الجھاؤ اپنے حل کے لیے ایک خاص طرح کے تقاضے کا جواب چاہتا ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ ایک کے بعد ایک، طرح طرح کے حل سامنے لائیں اور دیکھیں اس تقاضا کا جواب ملتا ہے یا نہیں؟ پھر جونہی ایک حل ایسا نکل آئے گا جو الجھاؤ کے سارے تقاضوں کا جواب دے دے گا اور معاملہ کی ساری کلیں ٹھیک ٹھیک بیٹھ جائیں گی۔ ہمیں پورا پورا یقین ہو جائے گا کہ الجھاؤ کا صحیح حل نکل آیا اور صورتِ حال کی یہ اندرونی شہادت ہمیں اس درجہ مطمئن کر دے گی کہ پھر کسی بیرونی شہادت کی احتیاج باقی نہیں رہے گی۔ اب کوئی ہزار شبہے نکالے' ہمارا یقین متزلزل ہونے والا نہیں۔

فرض کیجیے، کپڑے کے تھان کا ایک ٹکڑا کسی نے پھاڑ لیا ہو اور ٹکڑا پھٹا ہوا اس طرح ٹیڑھا ترچھا اور دندانہ دار ہو کر کہ جب تک ویسے ہی الجھاؤ کا ایک ٹکڑا وہاں آ کر بیٹھتا نہیں' تھان کی خالی جگہ بھرتی نہیں۔ اب اسی کپڑے کے بہت سے ٹکڑے ہمیں مل جاتے ہیں اور ہر ٹکڑا وہاں بٹھا کر ہم دیکھتے ہیں کہ اس خلاء کی نوعیّت کا تقاضا پورا ہوتا ہے یا نہیں۔ مگر کوئی

ٹکڑا ٹھیک بیٹھتا نہیں۔ اگر ایک گوشہ میل کھاتا ہے تو دوسرے گوشے جڑنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اچانک ایک ٹکڑا ایسا نکل آتا ہے کہ ٹیڑھے ترچھے کٹاؤ کے سارے تقاضے پورے کر دیتا ہے اور صاف نظر آ جاتا ہے کہ صرف اسی ٹکڑے سے یہ خلا بھرا جا سکتا ہے۔ اب اگرچہ اس کی تائید میں کوئی خارجی شہادت موجود نہ ہو، لیکن ہمیں پورا یقین ہو جائے گا کہ یہی ٹکڑا یہاں سے پھاڑا گیا تھا اور اس درجہ کا یقین ہوجائے گا کہ "**لو کشف الخطاء لم ازددت یقینا.**"

اس مثال سے ایک قدم اور آگے بڑھایئے اور گورکھ دھندے کی مثال سامنے لایئے۔ بیشمار طریقوں سے ہم اسے مرتّب کرنا چاہتے ہیں مگر ہوتا نہیں۔ بالآخر ایک خاص ترتیب ایسی نکل آتی ہے کہ اس کے ہر جز کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے اور اس کی چول ٹھیک ٹھیک بیٹھ جاتی ہے۔ اب گو کوئی خارجی دلیل اس ترتیب کی صحت کی موجود نہ ہو لیکن یہ بات کہ صرف اسی ایک ترتیب سے اس کا الجھاؤ دور ہوسکتا ہے، بجائے خود ایک ایسی فیصلہ کن دلیل بن جائے گی کہ پھر ہمیں کسی اور دلیل کی احتیاج باقی ہی نہیں رہے گی۔ الجھاؤ کا دور ہو جانا اور ایک نقش کا نقش بن جانا بجائے خود ہزاروں دلیلوں کی ایک دلیل ہے!

اب علم تیقّن کی راہ میں ایک قدم اور آگے بڑھایئے اور ایک تیسری مثال سامنے لایئے۔ آپ نے حرفوں کی ترتیب سے کھلنے والے قفل دیکھے ہوں گے۔ انہیں پہلے قفل ابجد کے نام سے پکارتے تھے۔ ایک خاص لفظ کے بننے سے وہ کھلتا ہے اور وہ ہمیں معلوم نہیں۔ اب ہم طرح طرح کے الفاظ بناتے جائیں گے اور دیکھیں گے کہ کھلتا ہے یا نہیں؟ فرض کیجیے ایک خاص لفظ کے بنتے ہی کھل گیا۔ اب کیا ہمیں اس بات کا یقین نہیں ہو جائے گا کہ اسی لفظ میں اس قفل کی کنجی پوشیدہ تھی؟ جستجو جس حل کی تھی، وہ قفل کا کھلنا تھا۔ جب ایک لفظ نے قفل کھول دیا تو پھر اس کے بعد باقی کیا رہا جس کی مزید جستجو ہو!

ان مثالوں کو سامنے رکھ کر اس طلسمِ ہستی کے معمّے پر غور کیجیے جو خود ہمارے اندر اور ہمارے چاروں طرف پھیلا ہوا ہے۔ انسان نے جب سے ہوش و آگہی کی آنکھیں کھولی

ہیں، اس معمّہ کا حل ڈھونڈ رہا ہے۔ لیکن اس پرانی کتاب کا پہلا اور آخری ورق کچھ اس طرح کھویا گیا ہے کہ نہ تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ شروع کیسے ہوئی تھی، نہ اسی کا کچھ سراغ ملتا ہے کہ ختم کہاں جا کر ہوگی اور کیونکر ہوگی؟

اول و آخر ایں کہنہ کتاب افتادست

زندگی اور حرکت کا یہ کارخانہ کیا ہے اور کیوں ہے؟ اس کی کوئی ابتدا بھی ہے یا نہیں؟ یہ کہیں جا کر ختم بھی ہوگا یا نہیں؟ خود انسان کیا ہے؟ یہ جو ہم سوچ رہے ہیں کہ "انسان کیا ہے؟" تو خود یہ سوچ اور سمجھ کیا چیز ہے؟ اور پھر حیرت اور درماندگی کے ان تمام پردوں کے پیچھے کچھ ہے بھی یا نہیں؟

مُردم درانتظار و دریں پردہ راہ نیست
یاہست، و پردہ‌دار نشانم نمی دہد

اس وقت سے لے کر جب کہ ابتدائی عہد کا انسان پہاڑوں کے غاروں سے سر نکال نکال کر سورج کو طلوع و غروب ہوتے دیکھتا تھا، آج تک، جبکہ وہ علم کی تجربہ گاہوں سے سر نکال کر فطرت کے بے شمار چہرے بے نقاب دیکھ رہا ہے، انسان کے فکر و عمل کی ہزاروں باتیں بدل گئیں مگر یہ معمّہ معمّہ ہی رہا۔

اسرارِ ازل را نہ تو دانی و نہ من
ویں حرفِ معمہ نہ تو خوانی نہ من
ہست ازپسِ پردہ گفتگوئے من و تو
چوں پردہ برافتد، نہ تو مانی و نہ من

ہم اس الجھاؤ کو نئے نئے حل نکال کر سلجھانے کی جتنی کوششیں کرتے ہیں وہ اور زیادہ الجھتا جاتا ہے۔ ایک پردہ سامنے دکھائی دیتا ہے اسے ہٹانے میں نسلوں کی نسلیں گزار دیتے ہیں لیکن جب وہ ہٹتا ہے تو معلوم ہوتا ہے سو پردے اور اس کے پیچھے پڑے تھے اور جو پردہ ہٹا تھا وہ فی الحقیقت پردے کا ہٹنا نہ تھا بلکہ نئے نئے پردوں کا نکل آنا تھا۔ ایک سوال کا جواب

ابھی حل نہیں چکتا، کہ دس نئے سوال سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک راز ابھی حل نہیں ہو چکتا کہ سو نئے راز چشمک کرنے لگتے ہیں:

دریں میدان پر نیرنگ حیران ست دانائی
کہ یک ہنگامہ آرائی وصد کشورتماشائی!

''آ ئن سٹائن'' (Einstein) نے اپنی ایک کتاب میں سائنس کی جستجوئے حقیقت کی سرگرمیوں کو شرلاک ہومز کی سراغ رسانیوں سے تشبیہ دی ہے اور اس میں شک نہیں کہ نہایت معنی خیز تشبیہ دی ہے۔ علم کی یہ سراغ رسانی فطرت کی غیر معلوم گہرائیوں کا کھوج لگانا چاہتی تھی، مگر قدم قدم پر نئے نئے مرحلوں اور نئی نئی دشواریوں سے دو چار ہوتی رہی۔ ڈی مقراطیس (Democritus) کے زمانہ سے لے کر جس نے چار سو برس قبل مسیح مادہ کے سالمات (Atoms) کی نقش آرائی کی تھی، آج تک، جبکہ نظریۂ مقادیر عنصری (Quantum Theory) کی رہنمائی میں ہم سالمات کا از سر نو تعاقب کر رہے ہیں، علم کی ساری کدّ و کاوش کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ نکلا کہ پچھلی گتھیاں سلجھتی گئیں، نئی نئی گتھیاں پیدا ہوتی گئیں۔ اس ڈھائی ہزار برس کی مسافرت میں ہم نے بہت سی نئی منزلوں کا سراغ پالیا جو اثنائے سفر میں نمودار ہوتی رہیں، لیکن حقیقت کی وہ آخری منزلِ مقصود جس کے سراغ میں علم کا مسافر نکلا تھا، آج بھی اسی طرح غیر معلوم ہے، جس طرح ڈھائی ہزار برس پہلے تھی۔ ہم جس قدر اس سے قریب ہونا چاہتے ہیں، اتنا ہی وہ دور ہوتی جاتی ہے:

بامن آویزشِ او الفتِ موج ست و کنار
دمبدم بامن و ہرلحظہ گریزاں ازمن

دوسری طرف ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے اندر ایک نہ بجھنے والی پیاس کھول رہی ہے جو اس معمۂ ہستی کا کوئی حل چاہتی ہے۔ ہم کتنا ہی اسے دبانا چاہیں، مگر اس کی تپش لبوں پر آ ہی جائے گی۔ ہم بغیر ایک حل کے سکونِ قلب نہیں پا سکتے۔ بسا اوقات ہم اس دھوکے

میں پڑ جاتے ہیں کہ کسی تشفّی بخش حل کی ہمیں ضرورت نہیں لیکن یہ محض ایک بناوٹی تخیّل ہوتا ہے اور جونہی زندگی کے قدرتی تقاضوں سے ٹکراتا ہے' پاش پاش ہو کر رہ جاتا ہے۔

یورپ اور امریکہ کے مفکرّوں کے تازہ ترین مآثر کا مطالعہ کیجیے اور دیکھیے، موجودہ جنگ نے ان تمام دماغوں میں جو کل تک اپنے آپ کو مطمئن تصوّر کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ کیسا تہلکہ مچا رکھا ہے؟ ابھی چند دنوں کی بات ہے کہ پروفیسر جوڈ (Joad) کا ایک مقالہ میری نظر سے گزرا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ ان تمام فیصلوں پر جو ہم نے مذہب اور خدا کی ہستی کے بارے میں کیے تھے، اب ازسرِ نو غور کرنا چاہیے۔ یہ پروفیسر جوڈ کا بعداز جنگ کا اعلان ہے۔ لیکن پروفیسر جوڈ کے قبل از جنگ کے اعلانات کس درجہ اس سے مختلف تھے؟ برٹرینڈ رسل (BertrandRussell) نے بھی گزشتہ سال ایک مطوّل مقالہ میں جو بعض امریکی رسائل میں شائع ہوا' ایسی ہی رائے ظاہر کی تھی۔

مگر جس وقت یہ معمّہ انسانی دماغ کے سامنے نیا نیا ابھرا تھا' اسی وقت اس کا حل بھی ابھر آیا تھا۔ ہم اس حل کی جگہ دوسرا حل ڈھونڈنا چاہتے ہیں اور یہیں سے ہماری تمام بے حاصلیاں سر اٹھانا شروع کر دیتی ہیں۔

اچھا، اب غور کیجیے، اس معمّہ کے حل کی کاوش بالآخر ہمیں کہاں سے کہاں لے جا کر کھڑا کر دیتی ہے۔ یہ پورا کارخانۂ ہستی اپنے ہر گوشہ اور اپنی ہر نمود میں سرتاسر ایک سوال ہے۔ سورج سے لے کر اس کی روشنی کے ذرّوں تک' کوئی نہیں جو یک قلم پرسش و تقاضا نہ ہو "یہ سب کچھ کیا ہے؟" "یہ سب کچھ کیوں ہے؟" "یہ سب کچھ کس لیے ہے؟" ہم عقل کا سہارا لیتے ہیں اور اس روشنی میں جسے ہم نے علم کے نام سے پکارا ہے' جہاں تک راہ ملتی ہے چلتے چلے جاتے ہیں لیکن ہمیں کوئی حل ملتا نہیں جو اس الجھاؤ کے تقاضوں کی پیاس بجھا سکے۔ روشنی گل ہو جاتی ہے، آنکھیں پتھرا جاتی ہیں اور عقل و ادراک کے سارے سہارے جواب دے دیتے ہیں لیکن پھر جونہی ہم پرانے حل کی طرف لوٹتے ہیں اور اپنی معلومات میں صرف اتنی بات بڑھا دیتے ہیں کہ "ایک صاحبِ ادراک و ارادہ قوت پس پردہ موجود

ہے'' تو اچانک صورتِ حال یک قلم منقلب ہو جاتی ہے اور ایسا معلوم ہونے لگتا ہے جیسے اندھیرے سے نکل کر یکا یک اجالے میں آ کھڑے ہوئے ہیں۔ اب جس طرف بھی دیکھتے ہیں' روشنی ہی روشنی ہے۔ ہر سوال نے اپنا جواب پالیا' ہر تقاضے کی طلب پوری ہوگئی، ہر پیاس کو سیرابی مل گئی۔ گویا یہ سارا الجھاؤ ایک قفل تھا جو اس کنجی کے چھوتے ہی کھل گیا۔

چنداں کہ دست وپا زدم، آشفتہ تر شدم
ساکن شدم، میانۂ دریا کنار شد

اگر ایک ذی عقل ارادہ پسِ پردہ موجود ہے تو یہاں جو کچھ ہے' کسی ارادہ کا نتیجہ ہے اور کسی معیّن اور طے شدہ مقصد کے لیے ہے۔ جونہی یہ حل سامنے رکھ کر ہم اس گورکھ دھندے کو ترتیب دیتے ہیں معاً اس کی ہر کج پیچ نکل جاتی ہے اور ساری چولیں اپنی اپنی جگہ ٹھیک آ کر بیٹھ جاتی ہیں۔ کیونکہ ہر ''کیا ہے؟'' اور ''کیوں ہے؟'' کو ایک معنی خیز جواب مل جاتا ہے۔ گویا اس معمّہ کے حل کی ساری روح ان چند لفظوں کے اندر سمٹی ہوئی تھی۔ جونہی یہ سامنے آئے معمّہ معمّہ نہ رہا' ایک معنی خیز داستان بن گیا۔ پھر جونہی یہ الفاظ سامنے سے ہٹنے لگتے ہیں تمام معانی واشارات غائب ہو جاتے ہیں اور ایک خنک اور بے جان چیستان باقی رہ جاتی ہے۔

اگر جسم میں روح بولتی ہے اور لفظ میں معنی ابھرتا ہے تو حقائقِ ہستی کے اجسام بھی اپنے اندر کوئی روحِ معنی رکھتے ہیں۔ یہ حقیقت کہ معمّۂ ہستی کے بے جان اور بے معنی جسم میں صرف اسی ایک حل سے روحِ معنی پیدا ہو سکتی ہے' ہمیں مجبور کر دیتی ہے کہ اس حل کو حل تسلیم کر لیں۔

اگر کوئی ارادہ اور مقصد پردے کے پیچھے نہیں ہے تو یہاں تاریکی کے سوا اور کچھ نہیں ہے لیکن اگر ایک ارادہ اور مقصد کام کر رہا ہے تو پھر جو کچھ بھی ہے' روشنی ہی روشنی ہے۔ ہماری فطرت میں روشنی کی طلب ہے۔ ہم اندھیرے میں کھوئے جانے کی جگہ روشنی میں چلنے کی طلب رکھتے ہیں اور ہمیں یہاں روشنی کی راہ صرف اسی ایک حل سے مل سکتی ہے۔

فطرتِ کائنات میں ایک مکمل مثال (Pattern) کی نموداری ہے۔ ایسی مثال جو عظیم بھی ہے اور جمالی (Aesthetics) بھی۔ اس کی عظمت ہمیں مرعوب کرتی ہے۔ اس کا جمال ہم میں محویّت پیدا کرتا ہے۔ پھر کیا ہم فرض کر لیں کہ فطرت کی یہ نمود بغیر کسی مُدرک (Intelligent) قوّت کے کام کر رہی ہے؟ ہم چاہتے ہیں کہ فرض کر لیں مگر نہیں کر سکتے۔ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ایسا فرض کر لینا ہماری دماغی خودکشی ہوگی۔

اگر غور کیجیے تو اس حل پر یقین کرتے ہوئے ہم اسی طریقِ نظر سے کام لینا چاہتے ہیں جو ریاضیات کے اعدادی اور پیمائشی حقائق سے ہمارے دماغوں میں کام کرتا رہتا ہے۔ ہم کسی عددی اور پیمائشی الجھاؤ کا حل صرف اسی حل کو تسلیم کریں گے جس کے ملتے ہی الجھاؤ دور ہو جائے۔ الجھاؤ کا دور ہو جانا ہی حل کی صحت کی اٹل دلیل ہوتی ہے۔ بلاشبہ دونوں صورتوں میں الجھاؤ اور حل کی نوعیت ایک طرح کی نہیں ہوتی' اعدادی مسائل میں الجھاؤ عددی ہوتا ہے یہاں عقلی ہے۔ وہاں عددی حل عددی حقائق کا یقین پیدا کرتا ہے۔ یہاں عقلی حل عقلی اذعان کی طرف رہنمائی کرتا ہے تاہم طریقِ نظر کا سانچا دونوں جگہ ایک ہی طرح کا ہوا۔ دونوں راہیں ایک ہی طرح کھلتی اور ایک ہی طرح بند ہوتی ہیں۔

اگر کہا جائے' حل کی طلب ہم اس لیے محسوس کرتے ہیں کہ اپنے محسوسات وتعقل کے محدود دائرے میں اس کے عادی ہو گئے ہیں اور اگر اس حل کے سوا اور کسی حل سے ہمیں تشفّی نہیں ملتی تو یہ بھی اسی لیے ہے کہ ہم حقیقت تولنے کے لیے اپنے محسوسات ہی کا ترازو ہاتھ میں لیے ہوئے ہیں تو اس کا جواب بھی صاف ہے۔ ہم اپنے آپ کو اپنے فکرونظر کے دائرے سے باہر نہیں لے جا سکتے۔ ہم مجبور ہیں کہ اسی کے اندر رہ کر سوچیں اور حکم لگائیں اور یہ جو ہم کہہ رہے ہیں کہ ''ہم مجبور ہیں کہ سوچیں اور حکم لگائیں'' تو

ایں سخن نیز بہ اندازۂ ادراکِ من ست

مسئلہ کا ایک اور پہلو بھی ہے جو اگر غور کریں تو فوراً ہمارے سامنے نمایاں ہو جائے گا۔ انسان کے حیوانی وجود نے مرتبۂ انسانیت میں پہنچ کر نشوؤارتقاء کی تمام پچھلی منزلیں

بہت پیچھے چھوڑ دی ہیں اور بلندی کے ایک ایسے ارفع مقام پر پہنچ گیا ہے جو اسے کرۂ ارضی کی تمام مخلوقات سے الگ اور ممتاز کر دیتا ہے۔ اب اسے اپنی لا محدود ترقیوں کے لیے ایک لا محدود بلندی کا نصب العین چاہیے جو اسے برابر اوپر ہی کی طرف کھینچتا رہے۔ اس کے اندر بلند سے بلند تر ہوتے رہنے کی طلب ہمیشہ ابلتی رہتی ہے اور وہ اونچی سے اونچی بلندی تک اڑ کر بھی رکنا نہیں چاہتی۔ اس کی نگاہیں ہمیشہ اوپر ہی کی طرف لگی رہتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ لامحدود بلندیوں کا نصب العین کیا ہوسکتا ہے؟ ہمیں بلا تامل تسلیم کر لینا پڑے گا کہ خدا کی ہستی کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ اگر یہ ہستی اس کے سامنے سے ہٹ جائے تو پھر اس کے لیے اوپر کی طرف دیکھنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہے گا۔

کرۂ ارضی کی موجودات میں جتنی چیزیں ہیں، سب انسان سے نچلے درجے کی ہیں، ان کی طرف نظر نہیں اٹھا سکتا۔ اس کے اوپر اجرامِ سماوی کی موجودات پھیلی ہوئی ہیں لیکن ان میں بھی کوئی ہستی ایسی نہیں جو اس کے لیے نصب العین بن سکے۔ وہ سورج کو اپنا نصب العین نہیں بنا سکتا۔ وہ چمکتے ہوئے ستاروں سے عشق نہیں کر سکتا۔ سورج اس کے جسم کو گرمی بخشتا ہے لیکن اس کی مخفی قوتوں کی امنگوں کو گرم نہیں کر سکتا۔ ستارے اس کی اندھیری راتوں میں قندیلیں روشن کر دیتے ہیں لیکن اس کے دل و دماغ کے نہاں خانہ کو روشن نہیں کر سکتے۔ پھر وہ کون سی ہستی ہے جس کی طرف وہ اپنی بلند پروازیوں کے لیے نظر اٹھا سکتا ہے؟

یہاں اس کے چاروں طرف پستیاں ہی پستیاں ہیں جو اسے انسانیّت کی بلندی سے پھر حیوانیّت کی پستیوں کی طرف لے جانا چاہتی ہیں حالانکہ وہ اوپر کی طرف اڑنا چاہتا ہے۔ وہ عناصر کے درجہ سے بلند ہو کر نباتاتی زندگی کے درجہ میں آیا۔ نباتات سے بلند تر ہو کر حیوانی زندگی کے درجہ میں پہنچا۔ پھر حیوانی مرتبہ سے اڑ کر انسانیت کی شاخ بلند پر اپنا آشیانہ بنایا۔ اب وہ اس بلندی سے پھر نیچے کی طرف نہیں دیکھ سکتا، اگرچہ حیوانیت کی پستی اسے برابر نیچے ہی کی طرف کھینچتی رہتی ہے۔ وہ فضا کی لاانتہا بلندیوں کی طرف آنکھ اٹھاتا ہے:

نہ باندازۂ بازوست کمندم ہیہات
ورنہ باگوشۂ بامیم سروکارے ہست!

اسے بلندیوں لامحدود بلندیوں کا ایک بام رفعت چاہیے جس کی طرف وہ برابر دیکھتا رہے اور جو اسے ہر دم بلند سے بلند تر ہوتے رہنے کا اشارہ کرتا رہے:

ترا زکنگرۂ عرش مے زنند صفیر
ندانمت کہ دریں دامگہ چہ افتادست

اسی حقیقت کو ایک جرمن فلسفی ریل (Riehl) نے ان لفظوں میں ادا کیا تھا ''انسان تن کر سیدھا کھڑا نہیں رہ سکتا جب تک کوئی ایسی چیز اس کے سامنے موجود نہ ہو جو خود اس سے بلند تر ہے۔ وہ کسی بلند چیز کے دیکھنے ہی کے لیے سر اوپر کر سکتا ہے''!

بلندی کا یہ نصب العین خدا کی ہستی کے تصور کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ اگر یہ بلندی اس کے سامنے سے ہٹ جائے تو پھر اسے نیچے کی طرف دیکھنے کے لیے جھکنا پڑے گا اور جونہی اس نے نیچے کی طرف دیکھا' انسانیت کی بلندی پستی میں گرنے لگی۔

یہی صورت حال ہے جو ہمیں یقین دلاتی ہے کہ خدا کی ہستی کا عقیدہ انسان کی ایک فطری احتیاج کے تقاضے کا جواب ہے اور چونکہ فطری تقاضے کا جواب ہے' اس لیے اس کی جگہ انسان کے اندر پہلے سے موجود ہونی چاہیے۔ بعد کی بنائی ہوئی بات نہیں ہوئی۔

زندگی کے ہر گوشہ میں انسان کے فطری تقاضے ہیں۔ فطرت نے فطری تقاضوں کے فطری جواب دیئے ہیں اور دونوں کا دامن اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ باندھ دیا ہے کہ اب اس کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ دونوں میں سے کون پہلے ظہور میں آیا تھا تقاضے پہلے پیدا ہوئے تھے یا ان کے جوابوں نے پہلے سر اٹھایا تھا؟ چنانچہ جب کبھی ہم کوئی فطری تقاضا محسوس کرتے ہیں تو ہمیں پورا پورا یقین ہوتا ہے کہ اس کا فطری جواب بھی ضرور موجود ہوگا۔ اس حقیقت میں ہمیں کبھی شبہ نہیں ہوتا۔

مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کے بچہ کی دماغی نشوونما اور اس کی قوتِ محاکات کے

ابھرنے کے لیے مثالوں اور نمونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ مثالوں اور نمونوں کے بغیر اپنی فطری قوتوں کو ان کی اصلی چال چلا نہیں سکتا۔ حتیٰ کہ بات کرنا بھی نہیں سیکھ سکتا جو اس کے مرتبۂ انسانیت کا امتیازی وصف ہے اور چونکہ یہ اس کی ایک فطری طلب ہے اس لیے ضروری تھا کہ خود فطرت ہی نے اوّل روز سے اس کا جواب بھی مہیا کر دیا ہوتا۔ چنانچہ یہ جواب پہلے ماں کی ہستی میں ابھرتا ہے۔ پھر باپ کے نمونے میں سر اٹھاتا ہے۔ پھر روز بروز اپنا دامن پھیلاتا جاتا ہے۔ اب غور کیجیے کہ اس صورتِ حال کا یقین کس طرح ہمارے دماغوں میں بسا ہوا ہے؟ ہم کبھی اس میں شک کر ہی نہیں سکتے۔ ہمارے دماغوں میں یہ سوال اٹھتا ہی نہیں کہ بچے کے لیے والدین کا نمونہ ابتدا سے کام دیتا آیا ہے یا بعد کو انسانی بناوٹ نے پیدا کیا ہے؟ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ ایک فطری مطالبہ ہے اور فطرت کے تمام مطالبے جبھی سر اٹھاتے ہیں، جب ان کے جواب کا بھی سروسامان مہیا ہوتا ہے۔

ٹھیک اسی طرح اگر ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی دماغ کی نشوونما ایک خاص درجہ تک پہنچ کر ان تمام نمونوں سے آگے بڑھ جاتی ہے جو اس کے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں اور اپنے عروج و ارتقاء کی پرواز جاری رکھنے کے لیے اوپر کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو جاتی ہے تو ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ یہ اس کی ہستی کا ایک فطری مطالبہ ہے اور اگر فطری مطالبہ ہے تو ضروری ہے کہ اس کا فطری جواب بھی خود اس کی ہستی کے اندر ہی موجود ہو اور اس کے ہوش و خرد نے آنکھیں کھولتے ہی اسے اپنے سامنے دیکھ لیا ہو۔ یہ جواب کیا ہو سکتا ہے؟ جس قدر جستجو کرتے ہیں، خدا کی ہستی کے سوا اور کوئی دکھائی نہیں دیتا۔

آسٹریلیا کے وحشی قبائل سے لے کر تاریخی عہد کے متمدّن انسانوں تک کوئی بھی اس تصور کی امنگ سے خالی نہیں رہا۔ رگ وید کے زمزموں کا فکری مواد اس وقت بننا شروع ہوا تھا جب تاریخ کی صبح بھی پوری طرح طلوع نہیں ہوئی تھی اور حتّیوں (Hittites) اور عیلامیوں نے جب اپنے تعبدانہ تصوّرات کے نقش و نگار بنائے تھے تو انسانی تمدّن کی طفولیّت نے ابھی ابھی آنکھیں کھولی تھیں۔ مصریوں نے ولادت مسیح سے ہزاروں سال پہلے اپنے خدا کو طرح

طرح کے ناموں سے پکارا۔ کالڈیا کے صنعت گروں نے مٹی کی پکی ہوئی اینٹوں پر حمد وثنا کے وہ ترانے کندہ کیے جو گزری ہوئی قوموں سے انہیں ورثہ میں ملے تھے:

در ہیچ پردہ نیست نہ باشد نوائے تو
عالم پرست از توؤ خالیست جائے تو

ابوالفضل نے عبادت گاہِ کشمیر کے لیے کیا خوب کتبہ تجویز کیا تھا۔ ''الٰہی' بہ ہر خانہ کہ می نگرم جویائے تواند' وبہر زباں کہ می شنوم' گویائے تو۔''

اے تیرِ غمت را دلِ عشاق نشانہ
خلقے بتو مشغول تو غائب زمیانہ
گہ معتکف دیرم و گہ ساکن کعبۂ
یعنے کہ ترامی طلبم خانہ بخانہ

غور وفکر کی یہی منزل ہے جو ہمیں ایک دوسری حقیقت کی طرف بھی متوجہ کر دیتی ہے۔ یہ کیا بات ہے کہ انسان خدا کے ماورائے تعقّل اور غیر شخصی تصور پر قانع نہ رہ سکا اور کسی نہ کسی شکل میں اپنے فکر واحساسات کے مطابق ایک شخصی تصور پیدا کرتا رہا؟ میں ''شخصی'' تصور یہاں اس معنی میں بول رہا ہوں جس معنی میں ''پرسنل گاڈ'' (Personal God) کی اصطلاح بولی جاتی ہے۔ شخصی تصور کے مختلف مدارج ہیں، ابتدائی درجہ تو شخصِ محض کا ہوتا ہے جو صرف شخصیت کا اثبات کرتا ہے۔ لیکن پھر آگے چل کر یہ شخصیت خاص خاص صفتوں اور فعالیتوں کا جامہ پہن لیتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ جامہ ناگزیر کیوں ہوا؟ اس کی علت بھی یہی ہے کہ انسان کی فطرت کو بلندی کے ایک نصب العین کی ضرورت ہے اور اس ضرورت کی پیاس بغیر ایک مشخص اور علائق نواز تصور کے بجھ نہیں سکتی۔ حقیقت کچھ ہی ہو، لیکن یہ تصور جب کبھی اس کے سامنے آئے گا تو تشخص کی ایک نقاب چہرہ پر ضرور ڈال لے گا۔ یہ نقاب کبھی بھاری رہی، کبھی ہلکی ہوگئی، کبھی ڈرانے والی رہی، کبھی لبھانے والی بن گئی، لیکن چہرہ سے اتری کبھی نہیں۔ اور یہیں سے ہمارے دیدۂ صورت پرست کی

ساری درماندگیاں شروع ہو گئیں:

بر چہرہ حقیقت اگر ماند پردہ
جرم نگاہ دیدہ صورت پرست ماست!

دنیا میں وحدت الوجود (Pantheism) کے عقیدہ کا سب سے قدیم سر چشمہ ہندوستان ہے۔ غالبًا یونان اور اسکندریہ میں بھی یہیں سے یہ عقیدہ پہنچا اور مذہبِ افلاطون جدید (Neoplatonism) نے (جسے غلطی سے عربوں نے افلاطون کا مذہب خیال کیا تھا) اس پر اپنی اشراقی عمارتیں استوار کیں۔ یہ عقیدہ حقیقت کے تصور کو ہر طرح کے تصوّری تشخصات سے منزّہ کر کے ایک کامل مطلق ہستی کا محض تصوّر قائم کر دیتا ہے۔ اس تصوّر کے ساتھ صفات متشکل نہیں ہو سکتیں اور اگر ہوتی بھی ہیں تو تعینات اور مظاہر کے اعتبار سے۔ نہ کہ ذات مطلق کی ہستی کے اعتبار سے اس عقیدہ کا روشناس اس کی ذات کے بارے میں بجز اس کے ''کہ ہے'' اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہاں تک کہ اشارہ بھی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اگر ہم اپنے اشارات کی پرچھائیں بھی اس پر پڑنے دیتے ہیں تو ذاتِ مطلق، مطلق نہیں رہتی، تشخص اور حدود کے غبار سے آلودہ ہو جاتی ہے۔ بابا فغانی نے دو مصرعوں کے اندر سب کچھ کہہ دیا ہے:

مشکل حکایتے ست کہ ہر ذرہ عین اوست
امانہ می تواں کہ اشارت باو کنند!

یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے اوپنیشدوں نے نفیِ صفات کی راہ اختیار کی اور تنزیہہ کی ''نیتی نیتی'' کو بہت دور تک لے گئے، لیکن پھر دیکھیے اسی ہندوستان کو اپنی پیاس اس طرح بجھانی پڑی کہ نہ صرف برہما (ذات مطلق) کو ایشور (ذات متصف و متشخص) کی نمود میں دیکھنے لگے بلکہ پتھر کی مورتیاں بھی تراش کر سامنے رکھ لیں کہ دل کے اٹکاؤ کا کوئی ٹھکانا تو سامنے رہے:۔

کرے کیا کعبہ میں جو سرِ بت خانہ سے آگاہ ہے
یہاں تو کوئی صورت بھی ہے واں تو اللہ ہی اللہ ہے!

یہودیوں نے خدا کو ایک قاہر و جابر شہنشاہ کی صورت میں دیکھا' اور اسرائیل کے گھرانے سے اس کا رشتہ ایسا ہوا جیسا ایک غیور شوہر کا اپنی چہیتی بیوی کے ساتھ ہوتا ہے۔ شوہر اپنی بیوی کی ساری خطائیں معاف کر دے گا مگر اس کی بے وفائی کبھی معاف نہیں کرے گا۔ کیونکہ اس کی غیرت گوارا نہیں کرتی کہ اس کی محبت کے ساتھ کسی دوسرے کی محبت بھی شریک ہو۔ اِنَّ اللّٰهَ لاَ یَغْفِرُ اَنْ یُشْرَکَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذَالِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ (۴۔۴۸) چنانچہ تورات کے احکام عشرہ میں ایک حکم یہ تھا تو کسی چیز کی مورتی نہ بنائیو' نہ اس کے آگے جھکیو' کیونکہ میں خداوند تیرا خدا ایک غیور خدا ہوں۔ لیکن پھر زمانہ جوں جوں بڑھتا گیا' یہ تصور بھی زیادہ وسعت اور رقت پیدا کرتا گیا یہاں تک کہ یسعیاہ ثانی (Isaiah)[۱۲] کے زمانہ میں اس تصور کی بنیادیں پڑنے لگیں جو آگے چل کر مسیحی تصور کی شکل اختیار کرنے والا تھا۔ چنانچہ مسیحیت نے شوہر کی جگہ باپ[۱۳] کو دیکھا۔ کیونکہ باپ اپنے بچوں کے لیے سرتاسر رحم و شفقت اور یک قلم عفوو درگزر ہوتا ہے۔

من بد کنم و توبد مکافات دہی
پس فرق میان من و تو چیست بگو!

اسلام نے اپنے عقیدہ کی بنیاد سرتاسر تنزیہہ پر رکھی۔ لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ میں تشبیہ کی ایسی عام اور قطعی نفی کر دی کہ ہمارے تصوری تشخص کے لیے کچھ بھی نہیں رہا۔ فَلَا تَضْرِبُوا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ (۱۶:۷۴) نے تمثیلوں کے سارے دروازے بند کر دیے لَا تُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ (۶۔۱۰۳) اور لَنْ تَرَانِیْ وَلٰکِنِ انْظُرْ اِلَی الْجَبَلِ (۷۔۱۴۳) نے ادراکِ حقیقت کی کوئی امید باقی نہ چھوڑی۔

زباں ببند و نظر باز کن کہ منع کلیم
اشارت از ادب آموزی تقاضائی ست!

تاہم انسان کے نظارۂ تصور کے لیے اسے بھی صفات کی ایک صورت آرائی کرنی ہی پڑی' اور تنزیہہ مطلق نے صفاتی تشخص کا جامہ پہن لیا وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی

فَادْعُوْهُ بِهَا (۷۔۱۸۰) اور پھر صرف اتنے ہی پر معاملہ نہیں رکا' جا بجا مجازات کے جھروکے بھی کھولنے پڑے بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوْطَتَانُ (۵۔۶۴) اور يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ (۴۸۔۱۰) اور مَارَمَيْتَ اِذْرَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (۸۔۱۷) اور اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى (۲۰۔۵) اور اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ (۸۹۔۱۴) اور كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ! (۵۵۔۲۹)

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر!

اس سے معلوم ہوا کہ بلندی کے ایک نصب العین کی طلب انسان کی فطرت کی طلب ہے' اور وہ بغیر کسی ایسے تصور کے پوری نہیں ہو سکتی جو کسی نہ کسی شکل میں اس کے سامنے آئے' اور سامنے جبھی آ سکتا ہے کہ اس کے مطلق اور غیر مشخص چہرہ پر کوئی نہ کوئی نقاب تشخص کی پڑ گئی ہو۔

آہ ازاں حوصلہ تنگ و ازاں حسن بلند
کہ دلم راگلہ از حسرتِ دیدار تو نیست!

غیر صفاتی تصور کو انسانی دماغ پکڑ نہیں سکتا۔ اور طلب اسے ایسے مطلوب کی ہوئی جو اس کی پکڑ میں آ سکے۔ وہ ایک ایسا جلوۂ محبوبی چاہتا ہے جس میں اس کا دل اٹک سکے، جس کے حسن گریزاں کے پیچھے والہانہ دوڑ سکے، جس کا دامن کبریائی پکڑنے کے لیے اپنا دست عجز و نیاز بڑھا سکے' جس کے ساتھ راز و نیازِ محبت کی راتیں بسر کر سکے' جو اگر چہ زیادہ سے زیادہ بلندی پر ہو' لیکن پھر بھی اسے ہر دم جھانک لگائے تاک رہا ہو کہ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ [14] (۸۹۔۱۴) اور وَاِذَاسَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ' فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ. اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَادَعَانِ. [15] (۲۔۱۸۶)

در پردہ و برہمہ کس پردہ می دری
با ہر کسی وبا تو کسے راوصال نیست!

غیر صفاتی تصور محض نفی و سلب ہوتا ہے' مگر صفاتی تصور نفی تشبہ کے ساتھ ایک ایجابی

صورت بھی متشکّل کر دیتا ہے۔ اسی لیے یہاں صفات کی نقش آرائیاں ناگزیر ہوئیں اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں علمائے سلف اور اصحابِ حدیث نے تفویض کا مسلک اختیار کیا اور تاویلِ صفات سے گریزاں رہے اور اسی بناء پر انہوں نے جہمیہ کے انکارِ صفات کو تعطّل سے تعبیر کیا اور معتزلہ و متکلمین کی تاویلوں میں بھی تعطیل کی بو سونگھنے لگے۔ متکلمین نے اصحاب حدیث کو تشبّہ اور تجسّم (Anthropomorphism) کا الزام دیا تھا۔ مگر وہ کہتے تھے کہ تمہارے تعطّل سے تو ہمارا نام نہاد تشبّہ ہی بہتر ہے۔ کیونکہ یہاں تصور کے لیے ایک ٹھکانا تو باقی رہتا ہے۔ تمھاری سلب و نفی کی کاوشوں کے بعد تو کچھ بھی باقی نہیں رہتا!

ہندوستان کے اوپنشدوں نے ذات مطلق کو ذات متصف میں اتارتے ہوئے جن تنزلات کا نقشہ کھینچا ہے، مسلمان صوفیوں نے اس کی تعبیر ''احدّیت'' اور ''واحدّیت'' کے مراتب میں دیکھی۔ ''احدیت'' کا مرتبہ یکتائی محض کا ہوا، لیکن ''واحدیت'' کی جگہ اوّل کی ہوئی، اور اوّلیت کا مرتبہ چاہتا ہے کہ دوسرا، تیسرا، چوتھا بھی ہو۔ " كُنْتُ كَنْزاً مَخْفِياً فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ" اگرچہ حدیث قدسی نہیں ہے، مگر جس کسی کا بھی قول ہے اس میں شک نہیں کہ ایک بڑے ہی گہرے تفکّر کی خبر دیتا ہے:۔

دل کشتۂ یکتائے حُسن ست، وگرنہ
درپیش تو آئینہ شکستن ہنرے بود!

ترجمان القرآن جلد اول میں بہ ضمن تفسیر سورہ فاتحہ اور جلد دوم میں بہ ضمن تفسیر وَلاَ تَضْرِبُوا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ اس مبحث کی طرف اشارات کیے گئے ہیں اور مبحث ایسا ہے کہ اگر پھیلایا جائے تو بہت دور تک پھیل سکتا ہے۔

تلقین درسِ اہل نظر یک اشارت ست
کردم اشارتے و مکرر نمی کنم!

اس سلسلہ میں ایک اور مقام بھی نمایاں ہوتا ہے، اور اس کی وسعت بھی ہمیں دور دور تک پہنچا دیتی ہے۔ اگر یہاں مادہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے تو پھر مرتبۂ انسانی میں ابھرنے

والی وہ قوت جسے ہم فکر و ادراک کے نام سے پکارتے ہیں' کیا ہے؟ کس انگیٹھی سے یہ چنگاری اڑی؟ یہ کیا ہے جو ہم میں یہ جوہر پیدا کر دیتی ہے کہ ہم خود مادہ کی حقیقت میں غور و خوض کرنے لگتے ہیں اور اس پر طرح طرح کے احکام لگاتے ہیں؟ یہ سچ ہے کہ موجودات کی ہر چیز کی طرح یہ جوہر بھی بتدریج اس درجہ تک پہنچا۔ وہ عرصہ تک نباتات میں سوتا رہا' حیوانات میں کروٹ بدلنے لگا اور پھر انسانیت کے مرتبہ میں پہنچ کر جاگ اٹھا' لیکن صورت حال کا یہ علم ہمیں اس گتھی کے سلجھانے میں کچھ مدد نہیں دیتا۔ یہ بیج فوراً برگ و بار لے آیا ہو یا مدتوں کے نشو و ارتقاء کے بعد اس درجہ تک پہنچا ہو' بہر حال مرتبۂ انسانیت کا جوہر و خلاصہ ہے اور اپنی نمود و حقیقت میں تمام مجمع موجودات سے اپنی جگہ الگ اور بالاتر رکھتا ہے۔ یہی مقام ہے جہاں پہنچ کر انسان حیوانیت کی پچھلی کڑیوں سے جدا ہو گیا اور کسی آئندہ کڑی تک مرتفع ہونے کی استعداد اس کے اندر سر اٹھانے لگی۔ وہ زمین کی حکمرانی کے تخت پر بیٹھ کر جب اوپر کی طرف نظر اٹھاتا ہے تو فضا کے تمام اجرام اسے اس طرح دکھائی دینے لگتے ہیں جیسے وہ بھی صرف اسی کی کار براریوں کے لیے بنائے گئے ہوں۔ وہ ان کی بھی پیمائشیں کرتا ہے اور ان کے خواص و افعال پر بھی حکم لگاتا ہے۔ اسے کارخانۂ قدرت کی لاانتہائیوں کے مقابلہ میں اپنی درماندگیوں کا قدم قدم پر اعتراف کرنا پڑتا ہے لیکن درماندگیوں کے اس احساس سے اس کی سعی و طلب کی امنگیں پژمردہ نہیں ہو جاتیں بلکہ اور زیادہ شگفتگیوں کے ساتھ ابھرنے لگتی ہیں اور اسے مزید بلندیوں کی طرف اڑا لے جانا چاہتی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ فکر و ادراک کی یہ فضائے لامتناہی جو انسان کو اپنی آغوش پرواز میں لیے ہوئے اڑ رہی ہے' کیا ہے؟ کیا اس کے جواب میں اس قدر کہہ دینا کافی ہوگا کہ یہ محض ایک اندھی بہری قوت ہے جو اپنے طبعی خواص اور طبعی اعمال و ظروف سے ترقی کرتی ہوئی فکر و ادراک کا شعلۂ جوالہ بن گئی؟ جو لوگ مادّیت کے دائرے سے باہر دیکھنے کے عادی نہیں ہیں' وہ بھی اس کی جرأت بہت کم کر سکے کہ اس سوال کا جواب بلاتامل اثبات میں دے دیں۔

میں ابھی اس انقلاب کی طرف اشارہ کرنا نہیں چاہتا جو انیسویں صدی کے آخر میں

رونما ہونا شروع ہوا اور جس نے بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی کلاسیکل طبیعیات کے تمام بنیادی مسلّمات یک قلم متزلزل کر دیے۔ میں ابھی اس سے الگ رہ کر ایک عام نقطہ نگاہ سے مسئلہ کا مطالعہ کر رہا ہوں۔

اور پھر خود وہ صورت حال جسے ہم نشو وارتقاء (Evolution) سے تعبیر کرتے ہیں' کیا ہے؟ اور کیوں ہے؟ کیا وہ ایک خاص رخ کی طرف انگلی اٹھائے اشارہ نہیں کر رہی ہے؟ ہم نے سینکڑوں برس کی سراغ رسانیوں کے بعد یہ حقیقت معلوم کی کہ تمام موجوداتِ ہستی آج جس شکل ونوعیّت میں پائی جاتی ہیں' یہ بیک دفعہ ظہور میں نہیں آ گئیں یعنی کسی براہ راست تخلیقی عمل نے انھیں یکا یک یہ شکل ونوعیت نہیں دے دی بلکہ ایک تدریجی تغیّر کا عالمگیر قانون یہاں کام کرتا رہا ہے اور اس کی اطاعت وانقیاد میں ہر چیز درجہ بدرجہ بدلتی رہتی ہے اور ایک ایسی آہستہ چال سے جسے ہم فلکی اعداد وشمار کی مدتوں سے بھی بہ مشکل اندازہ میں لا سکتے ہیں، نیچے سے اوپر کی طرف بڑھتی چلی آتی ہے۔ ذرات سے لے کر اجرام سماوی تک' سب نے اسی قانون تغیّر وتحوّل کے ماتحت اپنی موجودہ شکل ونوعیت کا جامہ پہنا ہے۔ یہی نیچے سے اوپر کی طرف چڑھتی ہوئی رفتارِ فطرت ہے جسے ہم نشو وارتقاء کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی ایک معین، طے شدہ' ہم آہنگ اور منظّم' ارتقائی تقاضا ہے جو تمام کارخانہ ہستی پر چھایا ہوا ہے اور اسے کسی خاص رخ کی طرف اٹھائے اور بڑھائے لیے جا رہا ہے۔ ہر نچلی کڑی بتدریج اپنے سے اوپر کی کڑی کا درجہ پیدا کرے گی اور ہر اوپر کا درجہ نچلے درجہ کی رفتار حال پر ایک خاص طرح کا اثر ڈالتے ہوئے اسے ایک خاص سانچے میں ڈھالتا رہے گا۔ یہ ارتقائی صورت حال خود توضیح (Self Explanatory) نہیں ہے یہ اپنی ایک توضیح چاہتی ہے لیکن اس کی کوئی مادی توضیح ہمیں نہیں ملتی۔ سوال یہ ہے کہ کیوں صورت حال ایسی ہی ہوئی کہ یہاں ایک ارتقائی تقاضا موجود ہوا اور وہ ہر تخلیقی ظہور کو نچلی حالتوں سے اٹھاتا ہوا بلند تر درجوں کی طرف بڑھائے لیے جائے؟ کیوں فطرت وجود میں رفعت طلبیوں کا ایسا تقاضا پیدا ہوا کہ سلسلۂ اجسام کی

ایک مرتب سیڑھی نیچے سے اوپر تک اٹھتی ہوئی چلی گئی جس کا ہر درجہ اپنے مابعد سے اوپر مگر اپنے ماسبق سے نیچے واقع ہوا ہے؟ کیا یہ صورت حال بغیر کسی معنی اور حقیقت کے ہے؟ کیا یہ سیڑھی بغیر کسی بالا خانہ کی موجودگی کے بن گئی اور یہاں کوئی بام رفعت نہیں جس تک یہ ہمیں پہنچانا چاہتی ہے۔

یاراں خبر دہید کہ ایں جلوہ گاہ کیست!

زمانۂ حال کے علمائے علم الحیات میں پروفیسر لائیڈ مارگن (Liayd Morgan) نے اس مسئلہ کا علم الحیاتی (Biological) نقطہ خیال سے گہرا مطالعہ کیا ہے لیکن بالآخر اسے بھی اسی نتیجہ تک پہنچنا پڑا کہ اس صورت حال کی کوئی مادی توضیح نہیں کی جا سکتی۔ وہ لکھتا ہے کہ جو حاصلات (Resultants) یہاں کام کر رہی ہیں، ہم ان کی توضیح اس اعتبار سے تو کر سکتے ہیں کہ انھیں موجودہ احوال وظروف کا نتیجہ قرار دیں لیکن ارتقائی تقاضا کا فجائی ظہور (Emergence) جس طرح ابھرتا رہا ہے۔ مثلاً زندگی کی نمود، ذہن وادراک کی جلوہ طرازی، ذہنی شخصیت اور معنوی انفرادیت کا ڈھلاؤ ان کی کوئی توضیح بغیر اس کے نہیں کی جا سکتی کہ ایک الٰہی قوت کی کارفرمائی یہاں تسلیم کر لی جائے۔ ہمیں یہ صورت حال بالآخر مجبور کر دیتی ہے کہ فطرت کائنات میں ایک تخلیقی (Creative principle) کی کار فرمائی کے اعتقاد سے گریز نہ کریں۔ ایک ایسی تخلیقی اصل جو اس کارخانۂ ظرف وزماں میں ایک لازماں (Timeless) حقیقت ہے۔

حقائق ہستی کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو ایک خاص بات فوراً ہمارے سامنے ابھرنے لگتی ہے۔ یہاں فطرت کا ہر نظام کچھ اس طرح کا واقع ہوا ہے کہ جب تک اسے اس کی سطح سے بلند ہو کر نہ دیکھا جائے، اس کی حقیقت بے نقاب نہیں ہو سکتی یعنی فطرت کے ہر نظم کو دیکھنے کے لیے ہمیں ایک ایسا مقام نظر پیدا کرنا پڑتا ہے جو خود اس سے بلند تر جگہ پر واقع ہو۔ عالم طبیعات کے غوامض علم الحیاتی (Biological) عالم میں کھلتے ہیں۔ علم الحیاتی غوامض نفسیاتی (Psychologcal) عالم میں نمایاں ہوتے ہیں۔ نفسیاتی

غوامض کے لیے ہمیں منطقی بحث و تحلیل کے عالم میں آنا پڑتا ہے لیکن منطقی بحث و تحلیل کے معمّوں کو کس مقام سے دیکھا جائے؟ اس سے اوپر بھی کوئی مقام نظر ہے یا نہیں جو حقیقت کی کسی آخری منزل تک ہمیں پہنچا سکتا ہو؟

ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ اس سے اوپر بھی ایک مقام نظر ہے لیکن وہ اس سے بلند تر ہے کہ عقلی نظر و تعلیل سے اس کی نقش آرائی کی جا سکے۔ وہ ماورائے محسوسات (Super Sensible) ہے اگر چہ محسوسات سے معارض نہیں۔ وہ ایک ایسی آگ ہے جو دیکھی نہیں جا سکتی۔ البتہ اس کی گرمی سے ہاتھ تاپ لیے جا سکتے ہیں۔ وَمَنْ لَمْ یَذُقْ، لَمْ یَدْرِ.

تو نظر باز نہ، ورنہ تغافل نگہ ست
تو زباں فہم نہ، ورنہ خموشی سخن ست!

کائنات ساکن نہیں ہے متحرک ہے اور ایک خاص رخ پر بنتی اور سنورتی ہوئی بڑھی چلی جا رہی ہے۔ اس کا اندرونی تقاضا ہر گوشہ میں تعمیر و تکمیل ہے۔ اگر کائنات کی اس عالمگیر ارتقائی رفتار کی کوئی مادی توضیح ہمیں نہیں ملتی تو ہم غلطی پر نہیں ہو سکتے۔ اگر اس معمہ کا حل روحانی حقائق میں ڈھونڈنا چاہتے ہیں۔

اس موقعہ پر یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ مادہ کی نوعیت کے بارے میں اٹھارویں اور انیسویں صدی نے جو عقائد پیدا کیے تھے وہ اس صدی کے شروع ہوتے ہی ہلنا شروع ہو گئے اور اب یکسر منہدم ہو چکے ہیں۔ اب ٹھوس مادہ کی جگہ مجرد قوت نے لے لی ہے اور الیکٹرون (Electron) کے خواص و افعال اور سالمات کے اعدادی و شماری انضباط کے مباحث نے معاملہ کو سائنس کے دائرہ سے نکال کر پھر فلسفہ کے صحرا میں گم کر دیا ہے۔ سائنس کو اپنی خارجیّت (Objective) کے علم و انضباط کا جو یقین تھا وہ اب یکسر متزلزل ہو چکا اور علم پھر داخلی ذہنیت (Subjective) کے اسی ذہنی اور کلیاتی مقام پر واپس لوٹ رہا ہے۔ جہاں سے نَشْأَۃِ جَدِیْدَہ کے دور کے بعد اس نے نئی مسافرت کے قدم اٹھائے تھے لیکن میں ابھی یہ داستان نہیں چھیڑوں گا کیونکہ بجائے خود یہ ایک مستقل بحث

ہے۔

یہ سچ ہے کہ یہ راہ محض استدلالی ذریعۂ علم سے طے نہیں کی جاسکتی۔ یہاں کی اصلی روشنی کشف و مشاہدہ کی روشنی ہے۔ لیکن اگر ہم کشف و مشاہدہ کے عالم کی خبر نہیں رکھنی چاہتے جب بھی حقیقت کی نشانیاں اپنے چاروں طرف دیکھ سکتے ہیں اور اگر غور کریں تو خود ہماری ہستی ہی سرتاسر نشان راہ ہے۔ وَلَقَدْ اَحْسَنَ مَنْ قَالَ:.

خلقے نشان دوست طلب می کنند و باز
از دوست غافل اند بچندیں نشاں کہ ہست!

حواشی

۱ یعنی ''خدایا! ایسا کر کہ تیری ہستی میں ہمارا تحیّر بڑھتا رہے' کیونکہ یہاں تحیّر جہل کا نہیں بلکہ معرفت کا نتیجہ ہے۔

۲ مفردات راغب اصفہانی

۳ Naked eye غیر مسلح آنکھ' یعنی ایسی آنکھ جو اپنی قدرتی نگاہ سے دیکھ رہی ہو' زیادہ قوت کے ساتھ دیکھنے کا کوئی آلہ مثلاً خوردبین اس کے ساتھ نہ ہو۔

۴ انسان میں ماں کی محبت بلوغ کے بعد بھی بدستور باقی رہتی ہے اور بعض حالتوں میں اس کے انفعالات اتنے شدید ہوتے ہیں کہ عہد طفولیت کی محبت میں اور اس محبت میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا' لیکن یہ صورت حال غالباً انسان کی مدنی و عقلی زندگی کے نشو ونما کا نتیجہ ہے' نہ کہ فطرت حیوانی کا۔ ابتدائی انسان میں بھی یہ علاقہ فطرۃً اسی حد تک ہوگا کہ بچہ سن تمیز تک پہنچ جائے۔ لیکن بعد کو نسل و خاندان کی تشکیل اور اجتماعی احساسات کی ترقی سے مادری رشتہ ایک دائمی رشتہ بن گیا۔

۵ اس موقع پر یہ اصل پیش نظر رکھنی چاہیے'' کہ جس طرح کائنات کی ہر چیز نظر واعتبار کے مختلف پہلو رکھتی ہے اسی طرح قرآن کا استشہاد بھی بہ یک وقت مختلف پہلوؤں سے تعلق رکھتا ہے البتہ خصوصیّت کے ساتھ زور کسی ایک ہی پہلو کے لیے ہوتا ہے' مثلاً شہد کی پیدائش اور شہد کی مکھی کے اعمال کے مختلف پہلو ہیں۔ یہ بات کہ ایک نہایت مفید اور لذیذ غذا پیدا ہو جاتی ہے' ربوبیّت ہے۔ یہ بات کہ ایک حقیر سا جانور اس دانش مندی دقت کے ساتھ یہ کام انجام دیتا ہے' ذہن و ادراک کی بخشش کا عجیب وغریب منظر ہے اور اس لیے حکمت وقدرت کا پہلو رکھتا ہے۔ ان آیات کا سیاق و سباق بتلاتا ہے کہ یہاں زیادہ تر توجہ ربوبیّت پر دلائی گئی ہے' لیکن ساتھ ہی حکمت وقدرت کے پہلوؤں پر بھی روشنی پڑ رہی ہے' اسی طرح اکثر مقامات میں ربوبیّت' رحمت' حکمت اور قدرت کے مشترک مظاہر بیان کیے گئے ہیں' لیکن خصوصیت کے ساتھ زور کسی ایک ہی پہلو پر ہے۔

۶ (صحیح مسلم' کتاب البر و الصلة والآداب' باب تحريم الظلم.م)

۷ یقیناً تمہارا پروردگار تمہیں گھات لگائے تاک رہا ہے۔

۸ اور جب میرا بندہ تجھ سے میری نسبت سوال کرتا ہے تو اس سے کہہ دے کہ میں اس سے دور کب

ہوں؟ میں تو بالکل اس کے پاس ہوں۔

۹ اس آیت میں ''الحاد فی الاسماء'' سے مقصود کیا ہے؟ الحاد ''لحد'' سے ہے' لحد کے معنی ''میلان عن الوسط'' کے ہیں' یعنی درمیان سے کسی ایک طرف کو ہٹا ہوا ہونا۔ اسی لیے ایسی قبر کو جس میں نعش کی جگہ ایک طرف کو ہٹی ہوئی ہوتی ہے ''لحد'' کہتے ہیں' جب یہ لفظ انسانی افعال کے لیے بولا جاتا ہے تو اس کے معنی راہِ حق سے ہٹ جانے کے ہوتے ہیں' کیونکہ وسط حق ہے اور جو اس سے منحرف ہو باطل ہے۔ الحد فلان ' ای مال عن الحق۔ پس یہاں الحاد فی الاسماء کا مطلب یہ ہوا کہ خدا کی صفات کے بارے میں جو راہِ حق ہے اس سے منحرف ہو جانا۔ امام راغب اصفہانی نے اس کی تشریح حسب ذیل لفظوں میں کی ہے:

''ان یوصف بما لا یصح و صفه به، اوان یتاول اوصافه علی مالا یلیق به'' (مفردات ۴۶۴)

یعنی خدا کے لیے کوئی ایسا وصف قرار دینا جو اس کا وصف نہیں ہونا چاہیے یا اس کی صفتوں کا ایسا مطلب ٹھہرانا جو اس کی شان کے لائق نہیں۔

۱۰ ارلی بدھ ازم۔

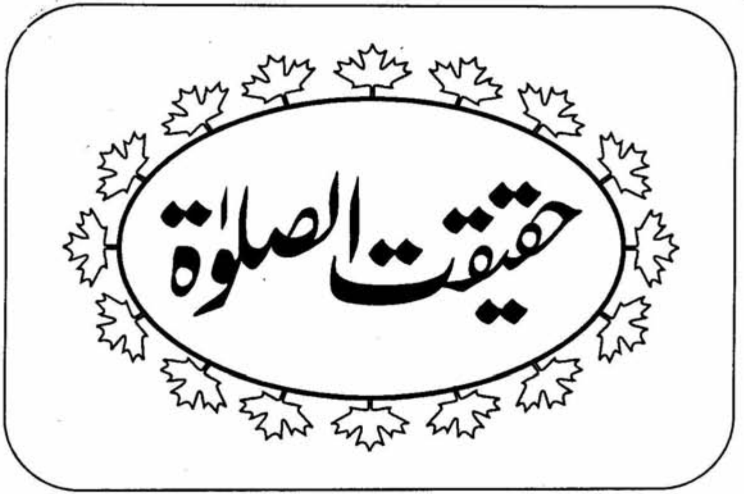
۱۱ باب مرض النبیؐ ووفاته۔

۱۲ انیسویں صدی میں بائبل کے نقدہ تدبر کا جو مسلک ''انتقاد اعلیٰ'' کے نام سے اختیار کیا گیا تھا' اس کے بعض فیصلے آج تک طے شدہ سمجھے جاتے ہیں۔ از انجملہ یہ کہ یسعیا نبی کے نام سے جو صحیفہ موجود ہے۔ وہ تین مختلف مصنفوں نے تین مختلف زمانوں میں مرتّب کیا ہوگا۔ باب اوّل سے باب ۳۹ تک ایک مصنف کا کلام ہے۔ باب ۴۰ سے باب ۵۵ آیت ۱۳ تک دوسرے مصنف کا اور اس کے بعد کا آخری حصہ تیسرے کا۔ ان تینوں مصنفوں کو امتیاز کے لیے یسعیا اول' ثانی اور ثالث سے موسوم کیا جاتا ہے۔

۱۳ ہندو تصوّر نے باپ کی جگہ ماں کی تمثیل اختیار کی تھی۔ کیونکہ ماں کی محبت باپ کی محبت سے بھی زیادہ گہری اور غیر متزلزل ہوتی ہے۔

۱۴ بلاشبہ تیرا پروردگار تجھے ہر دم جھانک لگائے تاک رہا ہے۔

۱۵ اے پیغمبر! جب میری نسبت میرے بندے تجھ سے دریافت کریں تو ان سے کہہ دے' میں ان سے دور کب ہوں؟ میں تو ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔


حقیقت الصلوٰۃ

عبادات میں نماز کو مرکز عمل ٹھہرایا جس کے ترک کر دینے کے بعد تمام دائرہ اعمال منہدم ہو جاتا ہے: **فمن اقامها اقام الدین ومن ترکها فقد هدم الدین.** اور اسی لیے یہ بات ہوئی کہ **کان اصحاب رسول الله صلعم لایرون شیئاً من الاعمال بترکه کفر غیر الصلوٰة** (ترمذی) یعنی صحابہ کرام کسی عمل کے ترک کر دینے کو کفر نہیں سمجھتے تھے مگر نماز کے ترک کو۔

نماز ہی وہ عمل عظیم ہے جو اسلام کے تمام عقائد واعمال کا جامع ترین نمونہ ہے۔ کس طرح سینکڑوں ہزاروں منتشر افراد مختلف مقاموں، مختلف جہتوں، مختلف شکلوں اور مختلف لباسوں میں آتے ہیں، لیکن یکا یک صدائے تکبیر سب کے انتشار کو ایک کامل اتحادی جسم میں تبدیل کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ ہزاروں اجزا کا یہ منتشر مواد بالکل ایک جسم واحد کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ سب کے وجود ایک ہی صف میں جڑے ہوئے، سب کے کاندھے ایک دوسرے سے ملے ہوئے، سب کے قدم ایک ہی سیدھ میں، سب کے چہرے ایک ہی جانب قیام کی حالت ہے تو سب ایک جسم واحد کی طرح کھڑے ہیں۔ جھکاؤ ہے تو تمام صفیں بیک وقت جھکی ہوئی ہیں۔ ظاہر کے ساتھ باطن بھی یکسر متحد وممزوج۔ سب کے دل ایک ہی کی یاد میں محو، سب کی زبانیں ایک ہی کے ذکر میں مترنم، پھر دیکھو، سب کے آگے صرف ایک ہی وجود امام کا نظر آتا ہے جس کے اختیار میں جماعت کے تمام اعمال و افعال کی باگ ہوتی ہے۔ جب چاہے سب کو جھکا دے جب چاہے سب کو اٹھا دے۔

فہرست حقیقت الصلوٰۃ

غرض و غایتِ نماز

معنی لفظ صلوٰۃ

پہلے معنی

ایمان بالغیب کے بعد قرآن کریم کی سب سے پہلی تعلیم اقامت صلوٰۃ ہے کہ نماز قائم کرو۔ ہم کو اس سے بحث نہیں کہ صلوٰۃ (نماز) کے احکام و اقسام کیا ہیں اور کیوں ہیں۔ ہمارے پیشِ نظر صرف نماز کی وہ خصوصیت ہے جس کو مسجد نشینوں میں نہ پا کر ایک اہلِ دل نے میکدہ کے دروازے کھٹکھٹائے تھے کہ:

باشد کہ دریں میکدھا دریابیم
آں نور کہ در صومعہا گم کردیم

اس ذیل میں متعدد اُمور بحث طلب ہیں۔

ادبیات عرب میں صلوٰۃ کسے کہتے ہیں؟

کلام جاہلیت میں یہ لفظ دُعا کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اعشیٰ کا قول ہے:

لَهَا حَارِسٌ لاَ يَبْرَحُ الدَّهْرُ بَيْتَهَا
وَاِنْ ذَبَحَتْ صَلَّى عَلَيْهَا وَزَمْزَمَهَا

''صَلَّى عَلَيْهَا'' یعنی ''بِذَالِكَ دَعَاهَا'' (اس کے لیے دُعا کی)

ایک اور جاہلی شاعر کا شعر ہے۔

وَقَابَلَهَا الرِّيْحُ صَفى دَفَّهَا
وَصَلَّى عَلَى دَنِّهَا وَارْتَسَمِ

یہاں بھی دُعا ہی کے معنی ہیں۔

ایک اور قصیدے میں ہے:

عَلَيْکَ مِثْلُ الَّذِیْ صَلَّيْتَ فَاغْتَصِمْی
عَيْنًا فِاِنَّ لِجَنْبِ الْمَرْءِ مُضْطَجِعًا

دوسرے معنی

صلوٰۃ کے دوسرے معنی لزوم کے تھے۔عہدِ جاہلیت کی ایک نظم کا یہ شعر مشہور ہے۔

لَمْ اَکُنْ مَنْ جَنَّاتِهَا عَلِمَ اللّٰهُ
وَاِنِّیْ بِحَرِّهَا الْيَوْمَ صَالِی

یہاں ''صَالِی'' کے معنی لزوم رکھنے والے کے ہیں۔

تیسرے معنی

کسی شخص کے پیرو کو ''مُصَلِّی'' کہتے تھے اور اس پیروی واتباع کا نام صلوٰۃ تھا۔

چوتھے معنی

اصل میں مُصَلِّی کا لفظ اُس گھوڑے کے لیے موضوع تھا جو کسی دوسرے گھوڑے کے پیچھے پیچھے چلتا ہو۔ بعد میں تخصیص جاتی رہی، معنی میں تعمیم آ گئی اور ہر قسم کی پیروی کو صلوٰۃ اور پیرو کو مُصَلِّی کہنے لگے۔

مشرکین عرب کی نماز

یہ تو صلوٰۃ کے عام معنی ہوئے، لیکن مشرکین عرب میں صلوٰۃ کا ایک خاص طریقہ تھا، جس کی تشریح قرآن کریم نے کی ہے۔سورہ انفعال میں ہے:

وَمَا کَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُکَآءً وَّتَصْدِيَةً فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا کُنْتُمْ تَکْفُرُوْنَ o (۸:۳۵)

''خانہ کعبہ کے پاس ان کی نماز کیا تھی؟ تالی بجانی اور سیٹی دینی، تم جو کفر کیا کرتے تھے۔اب اس کے بدلے عذاب کا مزہ چکھو۔''

روایات وآثار سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ایک روایت میں ہے۔

مَا کَانَ صَلَاتُھُمُ الَّتِیْ یَزْعُمُوْنَ اِنَّھَا یَدُوْمُ اِلَّا مُکَآءً وَّتَصْدِیَۃً[1]

''صلوٰۃ (نماز) جس کی نسبت مشرکین عرب کا زعم تھا کہ یہی عبادت ان کے کام آئے گی اوران کے لیے اجروثواب کا باعث ہوگی۔ وہ صرف تالی بجانا اور سیٹی بجانا تھی۔''

اسلام نے اس غیر مہذب طریقہ کی اصلاح کی، اس کو مذموم بتایا، نماز کی ایک خاص ہیئت مقرر کردی اور ایسی مقرر کردی جو انسانی اخلاقِ ملکوتی کی ترقی کا بہترین ذریعہ ہوسکتی ہے۔

اسلام کی خصوصیت

یہودیوں اور نصرانیوں میں بھی نماز کا رواج تھا۔ ایرانیوں میں مغوں، موبدوں اور بادشاہوں کی تعظیم کو نماز کہتے تھے، مگر یہ خاص طریق خشوع کہیں نہ تھا اور نہ عبودیت الٰہی کی حقیقت سے کسی کو واقفیت تھی۔ یہ خصوصیت اسلام کی ہے، وہ خود نماز کے تذکرہ میں اس پر زور دیتا ہے۔

فَاذْکُرُوْا اللّٰہَ کَمَا عَلَّمَکُمْ مَّالَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ (۲:۲۳۹)

''خدا کو اس طریق پر یاد کرو (اور اس شکل سے نماز پڑھو) جس کی خدا نے تمہیں تعلیم دی ہے اور جس سے پہلے تم ناواقف تھے۔''

معنی لفظ سجدہ

جزو اعظم نماز

نماز کا جزو اعظم سجدہ ہے، جس کے اصلی معنی اہلِ لغت نے کمال اطاعت و انقیاد اور خضوع کے لکھے ہیں۔ کلامِ عرب میں بھی یہی معنی متبادر تھے۔ ایک مشہور مصرع ہے:

تَرَی الْاَکَمَ فِیْھَا سُجَّدًا لِلْحَوَافِرِ

یعنی گھوڑے کی سرعت رفتار کا یہ عالم تھا کہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اس کے سموں کی مطیع نظر آتی تھیں۔ قرآن کریم کی متعدد آیتوں میں یہی معنی مراد ہیں مثلاً:

وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ یَسْجُدَانِ (۵۵۔۶) اور کُلٌّ لَہٗ یَسْجُدُوْنَ وَنَحْوِھِمَا

لغوی معنی

امام رازی سجدہ کے لغوی واصطلاحی معنی کی نسبت لکھتے ہیں:

اِنَّ السُّجُوْدَ لَا شَکَّ اِنَّهُ فِیْ عُرْفِ الشَّرْعِ عِبَارَةٌ عَنْ وَضْعِ الْجَبْهَةِ عَلَى الْاَرْضِ فَوَجَبَ اَنْ يَّكُوْنَ فِیْ اَصْلِ اللُّغَةِ كَذٰلِكَ لِاَنَّ الْاَصْلَ عَدَمُ التَّغَيُّرِ [2]

''کوئی شک نہیں کہ شریعت میں سجدہ کے معنی زمین پر پیشانی رکھنے کے ہیں۔ اس سے ضروری ہے کہ اصل لغت میں بھی یہی معنی ہوئے کیونکہ اصل الاصول یہی ہے کہ معنی بدل نہ جائیں۔''

یہ بات سب تسلیم کرتے ہیں کہ مصطلحات میں لغوی معنی کی کچھ نہ کچھ مناسبت ضرور ملحوظ رہنی چاہیے چنانچہ سجدہ کی شرعی اصطلاح میں بھی یہ مناسبت مفقود نہیں ہے۔ نماز میں جس انداز سے سجدہ کرتے ہیں، اس سے زیادہ فروتنی وتذلل کی اور کیا صورت ہوسکتی ہے؟ علم اللسان جاننے والے جانتے ہیں کہ اصل لغت کے لحاظ سے اصطلاح میں کیا کچھ تبدیلیاں نہیں ہوجاتی ہیں؟

اصطلاحی معنی

رکوع کے معنی صرف جھکنے کے تھے۔ اصطلاح نے ایک خاص قسم کے جھکنے کی تخصیص کردی۔ صلوٰۃ صرف دُعا کو کہتے تھے۔ اصطلاح نے ایک مخصوص انداز دُعا کا نام صلوٰۃ رکھ دیا۔ جہاد کا لفظ سعی وکوشش کے لیے موضوع تھا۔ اصطلاح نے اس میں ایک تخصیص یعنی سعی کی شان پیدا کردی، وَقِسْ عَلٰى هٰذَا الْقِيَاسِ

عجیب بات یہ ہے کہ خود امام رازی نے ''وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا'' کی تفسیر میں سجدہ کے معنی تواضع ہی کے لیے ہیں اور صرف اس قدر معذرت کافی سمجھی ہے کہ سجدہ کے شرعی معنی یہاں درست نہیں اُترتے [3]

معنی اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃ

لفظ اقامت

قرآن کریم میں صلوٰۃ کا لفظ جہاں کہیں آیا ہے، اقامت کے صیغوں کے ساتھ آیا ہے[4] عربی میں اقامت کے معنی یہ ہیں کہ کسی کام کو اس کی تمام وکمال شرائط وحدود کے ساتھ انجام دیا جائے۔ محاورہ میں کہتے ہیں:

اَقَامَ الْقَوْمُ سُوْقَهُمْ اِذَالَمْ یُعَطِلُوْ هَا عَنِ الْبَیْعِ وَالشِّرَاءِ

ایک شاعر اپنے مخصوص قدیم انداز تفاخر میں شکایت کرتا ہے۔

اَقَمْنَالِاَهْلِ الْعَرَاقِیْنَ سُوْقَ

الضِّرَابِ تَحَامُوْا و ولَّوْا جَمِیْعًا

نماز قائم کرنے کا مفہوم

روایات میں ہے:

اِقَامَةُ الصَّلٰوۃِ تَمَامُ الرُّکُوْعِ وَالسُّجُوْدِ وَالتِّلاوَةِ وَالْخُشُوْعِ وَالِاقْبَالِ عَلَیْهَا فِیْهَا [5]

''نماز قائم کرنے کے معنی رکوع وسجود اور تلاوت وخشوع کے حق سے نہایت مکمل طریق پر سبکدوش ہونے اور نماز کی غایت کی جانب اچھی طرح توجہ کرنے کے ہیں۔''

نماز کا حکم وتکمیلِ نماز

یعنی ایک مسلمان کے لیے صرف نماز پڑھنا ہی کافی نہیں ہے، نماز کے اغراض وغایات کی تکمیل بھی ضروری ہے، قرآن کہیں بھی رسمی نماز ادا کرنے کا حکم نہیں دیتا۔ وہ تکمیل حدود کا خواستگار ہے اور صاف کہہ رہا ہے کہ بغیر اس تکمیل کے نماز، نماز ہی نہیں۔

استعانت بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ

حل المشکلات

قرآن کریم نے دومقام پرحکم دیا ہے:

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (۲:۴۵)

''استقلال وشکیبائی اور نماز کے ذریعہ مشکلات میں مدد مانگا کرو، یعنی ان چیزوں سے تم کو اعانت ملے گی، تمہاری مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔ مہمات اُمور میں تم کوانہی سے رجوع کرنا چاہیے۔''

اسوۂ نبویؐ

حدیث میں ہے:

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا حَزَبَهٗ اَمْرٌ، فَزَعَ اِلَى الصَّلٰوةِ [۶]

''جب کوئی مہم پیش آتی تو رسول اللہ ﷺ نماز کی جانب رجوع کرتے۔''

دوسری روایت یہ ہے:

اِنَّهُمَا اَیِ الصَّبْرُ وَالصَّلٰوةُ مَعُوْنَتَانِ عَلٰى رَحْمَةِ اللّٰهِ [۷]

''یہ دونوں نزولِ رحمت الٰہی میں اعانت کیا کرتے ہیں یعنی استقلال اور نماز''

صبر وشکیبائی کا مدعا

دوران تلاوت اس تاکیدی حکم پر بارہا تمہاری نظر پڑی ہوگی لیکن شاید ہی کبھی یہ خیال آیا ہو کہ اس کا مدعا کیا ہے؟ صبر کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انسان کے پاس ایک چیز تھی جو جاتی رہی اور وہ چپ ہو گیا کہ نہیں ہے تو نہ سہی۔

کھو گیا، دل کھو گیا، ہوتا تو کیا ہوتا امیر
جانے دو، اک بے وفا جاتا رہا، جاتا رہا

معنیٔ صبر

صبر کے حقیقی معنی یہ ہیں کہ مافات پرغم و اندوہ کرنا بے سود ہے۔ انسان کو ہر ایک مشکل میں مستقل مزاج رہنا چاہیے اور کوشش ہونی چاہیے کہ جو چیز جاتی رہی پھر اس کا نعم البدل مل سکے اور جب تک بہترین صورتِ تلافی نہ ہو جائے، سلسلۂ سعی و تدبیر میں خلل نہ آنے پائے۔ اسی طرح نماز سے بھی صرف ایک رسم کا پورا کر دینا مقصود نہیں ہے بلکہ خدا سے اپنے تعلقات کا تازہ کرنا اور مؤثرات دنیاوی سے کنارہ کش ہو کر نفس میں ایک اعلیٰ تصوّرِ قدسی پیدا کرنا مدّ نظر ہے۔ ظاہر ہے کہ یہی دونوں چیزیں انسانی زندگی کو کامیاب بنا سکتی ہیں اور یہی کامیابی اسلام کی نظر میں ہے۔ (صبر کی مزید تحقیق آگے آئے گی)

تشریحات قرآن

خواص نماز

نماز کی غرض و غایت کیا ہے؟ قرآن کریم نے خود اس کی تشریح کی ہے:

اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتَابِ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ ط وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ ط وَاللّٰہُ یَعْلَمُ مَاتَصْنَعُوْنَ (۲۹:۴۵)

”کتاب میں سے جو تم پر وحی اُتری ہے، اس کو پڑھو اور نماز کو درست طریق پر ادا کرو، حقیقت میں نماز بداخلاقیوں اور برائیوں سے روکتی ہے اور اللہ کی یاد سب سے برتر ہے۔ اللہ تمہاری کاریگری کو خوب جانتا ہے۔“

تفسیر فحشاءِ ومنکر

فحشا ومنکر (بے حیائی اور برائی) سے کیا مراد ہے اور ان چیزوں سے روکنے کے کیا معنی ہیں؟ اس کی یوں تفسیر کی گئی ہے:

اَلْفَحْشَآءُ مَا قُبِحَ مِنَ الْعَمَلِ كَالْزِنَا مثلاً وَالْمُنْكَرُ مَالَا يَعْرِفُ فِي الشَّرِيْعَةِ ، اى تَمْنَعُهُ عَنْ مَعَاصِي اللهِ وَتَبْعُدُهُ مِنْهَا، وَمَعْنَى نَهْيُهَا عَنْ ذَالِكَ ان فعلها يَكُوْنُ سَبَبًالِمَلاَءِ نَتِهَا عَنْهَا [8]

''جو قبیح کام ہوں جیسے حرام کاری۔ ان کو فحشا کہتے ہیں اور قانون اسلام نے جس چیز کی اجازت نہ دی ہو وہ منکر ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی نافرمانیوں سے انسان کو نماز روکتی ہے اور گناہوں سے دور کر دیتی ہے یعنی نماز کا فعل یہ ہے کہ ان چیزوں سے باز رہنے کا سبب بن جاتی ہے۔''

یہی سبب ہے کہ ہم نے فحشاء کا ترجمہ بداخلاقی سے کیا ہے کہ یہ لفظ جامع ہے۔

بداخلاقی سے روکنے کا طریقہ

فحشاء والمنکر سے روکنے کا طریق کیا ہے؟ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

قَالَ اَبُوالْعَالِيَةِ فِي قَوْلِهٖ تَعَالٰى اِنَّ الصَّلاَ ةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ قَالَ: اِنَّ الصَّلٰوةَ فِيْهَا ثَلاَثُ خِصَالٍ، فَكُلُّ صَلاَةٍ لاَ يَكُوْنُ فِيْهَا شَيْءٌ مِنْ هَذِهِ الْخِصَالِ فَلَيْسَتْ بِصَلاَةٍ (۱) اَلْاِخْلاَصُ (۲) وَالْخَشِيَةُ (۳) وَذِكْرُاللهِ فَالْاَخْلاَصُ يَأْمُرُهُ بِالْمَعْرُوْفِ، وَالْخَشْيَةُ تَنْهَاه عَنِ الْمُنْكَرِ، وَذِكْرُاللهِ الْقُرْآنُ يَأْمُرُهُ وَيَنْهَاه [9]

''(۱) نماز فحشا ومنکر سے روکتی ہے، اس کی تفسیر میں ابوالعالیہ کا قول ہے کہ نماز میں تین خصلتیں ہیں، ان میں سے اگر کوئی خصلت بھی کسی نماز میں نہ ہوتو وہ نماز ہی نہیں ہے۔ وہ خصلتیں یہ ہیں۔

(۱) خلوص (۲) خوفِ خدا (۳) یادِ الٰہی۔ خلوص کا فعل یہ ہے کہ نماز پڑھنے والے کو نیک کام کا حکم دیتا ہے۔ خوفِ خدا اسے بدی سے روکتا ہے اور یادِ الٰہی (قرآن) کا فعل امر و نہی دونوں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

بداخلاقی سے نہ روکنے والی نماز

فحشاء و منکر سے نہ روکنے والی نماز کس حکم میں ہے؟

امام رازی نے اس بارے میں نہایت محققانہ جواب دیا ہے۔

اَلصَّلاۃُ الْصَّحِیْحَۃُ شَرْعًا تَنْھٰی عَنِ الْاَمْرَیْنِ مُطْلَقًا وَھِیَ الَّتِیْ اَتٰی بِھَا الْمُکَلِّفُ اللہُ حَتّٰی لَوْ قَصَدَبِھَا الرِّیَاءِ لاَ تَصِحُ صَلاَ تُہٗ شَرَعًا وَتَجِبُ عَلَیْہِ الْاِعَادَۃُ [1]

''اُصول شریعت کی رو سے جو نماز صحیح کہی جا سکتی ہے وہ ان دونوں اُمور، فحشاء و منکر سے روکتی ہے اور وہ وہی نماز ہے جو ایک عاقل و بالغ مسلمان خدا کے لیے ادا کرے۔ اس باب میں یہاں تک تحدید کر دی گئی ہے کہ ادائے نماز سے اگر کسی کا مقصود نمائش و نمود ہو تو وہ نماز شرعاً درست نہ ہوگی۔ اس کو دوبارہ ادا کرنا چاہیے۔''

مفسّرین کا ذوقِ تدقیق

بعض مفسّرین کے ذوقِ تدقیق نے اس موقع پر ایک بات یہ بھی پیدا کی ہے کہ نماز انسان کو فحشاء و منکر سے باز تو رکھتی ہے، تاہم حقیقت میں یہ فعل نماز کا نہیں ہے آیات قرآنیہ کا ہے جن کی تلاوت نماز میں کی جاتی ہے اور پھر اس کی نسبت طول طویل بحثیں کی ہیں، لیکن ان سب کا ماحصل نزاعِ لفظی اور بحث مَالاَ یَنْفَعُ سے زیادہ نہیں۔

علامہ طبری کا فیصلہ

علامہ طبری نے جو کہ فنِ تفسیر بالروایات کے امام ہیں۔ خوب لکھا ہے:

الصَّوَابُ عَنِ الْقَوْلِ فِیْ ذٰلِکَ اَنَّ الصَّلاۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ کَمَا قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ وَّابْنُ مَسْعُوْدٍ، فَاِنْ قَالَ قَائِلٌ وَکَیْفَ تَنْھَی الصَّلاۃُ عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِاِنْ لَمْ یَکُنْ مَعْنِیًابِھَا مَایُتْلٰی فِیْھَا؟ قِیْلَ تَنْھٰی مَنْ کَانَ فِیْھَا فَتَحُوْلُ بَیْنَہٗ وَبَیْنَ اِیْقَانِ الْفَوَاحِشِ لِاَنَّ شُغْلَہٗ بِھَا یَقْطَعُہٗ عَنِ الشُّغْلِ بِالْمُنْکَرِ وَلِذَالِکَ قَالَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ: مَنْ لَّمْ یُطِعْ صَلاتَہٗ لَمْ یَزْدَدْمِنَ اللّٰہِ اِلَّا بُعْدًا، وَذَالِکَ اَنَّ طَاعَتَہٗ لَھَا اِقَامَۃٌ اِیَاھَا بِحُدُوْدِھَا وَفِیْ طَاعَتِہٖ لَھَا مُزْدَجرٌعَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ....مَنْ اَتَی فَاحِشَۃً اَوْ عَصَی اللّٰہَ بِمَا یَفْسُدُ صَلاتُہٗ فَلاَشَکَّ اِنَّہٗ لاَ صَلاۃَ لَہٗ[11]

''اس باب میں درست اور صحیح قول یہی ہے کہ فحشاء ومنکر سے نماز ہی روکتی ہے۔ ابن عباسؓ وابن مسعودؓ بھی اسی کے قائل ہیں، لیکن اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ اگر وہ آیتیں مراد نہیں ہیں جو نماز میں پڑھی جاتی ہیں تو پھر نماز فحشاء ومنکر سے کیونکر روک سکتی ہے؟ جواب میں یہ کہا جائے گا کہ نماز میں جو مشغول ہو گا نماز اس کو روکے گی، اس کے فحشاء کے مابین یہ نماز حائل ہو جائے گی اس لیے کہ نماز کا مشغلہ نمازیوں کو شغل منکر سے منقطع کر دے گا۔ ابن مسعودؓ نے اسی بناء پر کہا تھا کہ جس شخص نے اپنی نماز کی اطاعت نہ کی اسے بجز اس کے اور کوئی نفع نہ ہوا کہ جنابِ الٰہی سے اس کی جدائی اور بڑھ گئی اور جو کچھ تقرّب تھا اس میں بھی کمی آ گئی۔ سبب یہ ہے کہ نماز کی اطاعت کرنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ نماز کو اس طرح پڑھیں کہ جتنے ارکان حدود شرائط اور لوازم نماز کے ہیں، سب کے سب ادا ہو جائیں۔ جب یہ حالت ہو گی اور اس طرح نماز کی اطاعت کی جائے گی تو اس اطاعت میں لامحالہ فحشاء ومنکر سے باز رہنے اور باز رکھنے کی خصوصیّت ہو گی..... اب اگر کسی نے فحشاء کا ارتکاب کیا یا خدا کی کوئی ایسی نافرمانی کی جس سے نماز میں

خلل آتا ہو تو بے شبہ اس کی نماز نہ ہوگی۔"

نماز کی حقیقی شان

نماز کیا ہے؟ نماز خدا کے ساتھ تعلقات بندگی کو تازہ کرنے اور اپنے قوائے بہیمیہ کے خلاف اپنے قوائے ملکوتیہ کو قوی رکھنے کی سعی ہے۔ یعنی دنیا کی جھوٹی ہستیاں جو اپنی شان وشوکت اور جبروت وجلالت سے دلوں پر ایک طرح کی مرعوبیّت کا نقش بٹھاتی ہیں، اُن سے تبریٰ و استغفار کر کے صفحۂ قلب سے اِس نقش باطل کو دھو ڈالنا اور انسانی زندگی کو روحانی و مادی دونوں حیثیتوں سے بہترین نمونۂ سعادت بنانے کے لیے حسنِ توفیق کا طلب گار ہونا، پس نماز بندے کے لیے خدا کی ایک معیّت اور صحبت ہے اگر اس تعلق کو صحبت ومعیّت کے لفظ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے تو یہ معیّت، اوّل سے لے کر آخر تک قائم رہتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں صرف خدا ہے اور خدا کی یاد ہے۔ بندے اور خدا کے مابین کوئی چیز حائل نہیں ہوتی۔

اِنَّ الصَّلاَ ةَ اَوَّلُهَا لَفُظَةُ "اللهِ" وَاٰخِرُهَا لَفُظَةُ "اللهِ" فِيُ قَوُلِهٖ "اَشُهَدُاَنُ لاَ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ" لِيَعُلَمَ الُمُصَلِّي اَنَّهُ مِنُ اَوَّلِ الصَّلاَ ةِ اِلٰى اٰخِرِهَا مَعَ اللهِ

"نماز کی ابتداء اَشُهَدُاَنُ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ اور انتہا اَلسَّلاَمُ عَلَيُكُم وَرَحُمَةُ اللهِ پر ہوتی ہے، یعنی اوّل میں بھی اللہ ہی کا لفظ ہے اور آخر میں بھی۔ یہ اس لیے ہے کہ نمازی کو معلوم ہو جائے کہ نماز میں اوّل سے آخر تک وہ اللہ ہی کے ساتھ ہے۔"

اصلِ نماز سے خارج

فَاِنُ قَالَ قَائِلٌ : فَقَدَ بَقِيَ مَنُ الصَّلاَةِ قَوُلُهُ "وَاَشُهَدُاَنَّ مُحَمَّدً الرَّسُوُلُ اللهِ" وَالصَّلاَةِ عَلَى الرَّسُوُلِ وَالتَّسُلِيُم فَنَقُوُلُ: هَذِهِ الُاَشُيَاءُ دَخَلَتُ لِمَعُنَى خَارِجٍ عَنُ ذَاتِ الصَّلاَةِ، وَذٰلِکَ لِاَنَّ الصَّلاَةَ ذِكُرُ اللهِ لاَ غَيُرُ لٰكِنَّ الُعَبُدَ اِذَا وَصَلَ بِالصَّلاَةِ اِلَى اللهِ وَحَصَلَ مَعَ اللهِ لاَ يَقَعُ فِيُ قَلُبِهٖ

اِنَّهُ اسۡتَقَلَ وَالسۡتَبَدَّ وَاسۡتَغۡنیٰ عَنِ الرَّسُوۡلِ [۱۲]

''اگر یہ اعتراض ہو کہ نماز میں اَشۡھَدُاَنَّ مُحَمَّدً رَّسُوۡلُ اللہِ''اور''اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّبَارِکۡ وَسَلِّمۡ'' بھی ہے،تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ چیزیں اصل نماز کے معنی سے خارج ہیں۔ یہ ایک اوپری بات کے لیے داخل ہوگئی ہیں۔ سبب یہ ہے کہ نماز صرف خدا کی یاد کا نام ہے۔اس کے علاوہ نماز اور کوئی چیز نہیں ہے لیکن نماز کے ذریعہ بندہ جب خدا تک پہنچ جاتا ہے اور خدا کی قربت اسے حاصل ہوجاتی ہے تو اس کے دل میں یہ خطرہ نہ آنا چاہیے کہ رسول کی ہدایت سے آزاد ہوگیا اور مستبد بن بیٹھا کہ اب میں تعلیماتِ رسالت سے بالکل ہی بے نیاز ہوگیا ہوں۔''

لازمی خاصۂ نماز

نماز کی مواظبت سے کیا بات حاصل ہوتی ہے؟ حدیث میں ہے:

جَاءَ رَجُلٌ اِلٰی النَّبِیِّ صَلَّی اللہُ عَلَیۡهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: اِنَّ فُلا نًا یُصَلِّی بِالَّیۡلِ فَاِذَا اَصۡبَحَ سَرَقَ، فَقَالَ: لقتسنهَا ملول [۱۳]

''ایک شخص نے رسول ﷺ کی خدمت میں گذارش کی کہ فلاں شخص رات کو نمازیں پڑھا کرتا ہے اور جب تڑکا ہوتا ہے تو چوری کرتا ہے۔آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ جس چیز کو کہہ رہے ہو یعنی ادائے نماز۔یہی چیز اس کو اس حرکت سے روک دے گی۔''

اوصافِ نماز کا احساس

عصیاں سے باز رکھنا

یہ بات کیونکر حاصل ہوتی ہے [۱۴] اور اس کا سبب کیا ہے؟ احادیث میں اس کی جو حقیقت مذکور ہے اور آثار واخبار سے اس موضوع پر جو روشنی پڑتی ہے، اس کا ایک اقتباس

درج ذیل ہے:

فِیْ الصَّلاۃِ مُنْتَھٰی وَّمُزْدَجِرٌ عَنْ مَعَاصِی اللّٰہِ [15]

مَنْ لَّمْ تَنْھَہُ صَلاَتُہُ عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ لَمْ یَزْدَدْبِصَلاۃٍ مِنَ اللّٰہِ اِلاَّ بُعْدًا [16]

''نماز میں خدا کی نافرمانیوں سے باز رکھنے اور روکنے کی صفت ہے۔''

جس شخص کو اس کی نماز نے بے حیائی اور برائی سے نہ روکا، وہ نماز پڑھ کر خدا سے اور بھی دور ہو گیا۔

نفع بخشی نماز

قِیْلَ لِابْنِ مَسْعُوْدٍ: اِنَّ فَلاَنًا کَثِیْرُ قَالَ: فَاِنَّھَا لاَ تَنْفَعُ اِلاَّ مَنْ اَطَاعَھَا [17]

''عبداللہ بن مسعودؓ سے ایک شخص کا تذکرہ ہوا کہ فلاں شخص بہت نمازیں پڑھا کرتا ہے۔ ابن مسعودؓ نے کہا نماز اس شخص کو نفع دیتی ہے جو نماز کی اطاعت کرے۔''

خدا سے دوری کا باعث

مَنْ لَّمْ تَاْمُرْہُ صَلاَتُہُ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْھَہُ عَنِ الْمُنْکَرِ یَزْدَدْبِھَا مِنَ اللّٰہِ اِلاَّ بُعْدَہُ

''نیکی کرنے اور برائی سے روکنے کے لیے جس کی نماز حکم نہ دیتی ہو تو ایسی نماز نے خدا سے اُس کی دوری اور بڑھا دی۔''

اطاعت نماز سے مراد

لاَ صَلاَۃَ لِمَنْ لَّمْ یُطِعِ الصَّلاَۃَ وَطَاعَۃُ الصَّلاَۃِ اَنْ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ، قَالَ قِیْلَ لِسُفْیَانَ: قَالُوْا یَاشُعَیْبُ اَصَلاَتُکَ تَاْمُرُکَ؟ قَالَ فَقَالَ سُفْیَانُ؟ اَیْ وَاللّٰہِ تَاْمُرُہُ وَتَنْھَاہُ [18]

"جونماز کی اطاعت نہ کرے اس کی نماز نماز ہی نہیں۔ نماز کی اطاعت یہ ہے کہ وہ انسان کو بداخلاقی اور برائی سے روکے حضرت سفیان سے سوال ہوا کہ قرآن کریم کی اس آیت سے کیامراد ہے۔ کہ کفار نے کہا اے شعیب! کیا تیری نماز تجھے حکم دیتی ہے؟" سفیان نے جواب دیاہاں خدا کی قسم نماز حکم دیتی ہےاور منع بھی کرتی ہے۔"

قرب کی جگہ بُعد ودُوری

مَنْ صَلّٰی صَلاۃً تَنْھَھُ عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِلَمْ یَزْدَدْبِھَا مِنَ اللہِ اِلَّا بُعْدًا [19]

"جس نے نماز پڑھی مگراس نماز نے بداخلاقی اور برائی سے اس کو باز نہ رکھا تو جنابِ الٰہی سے قرب وتعلق کی جگہ اس کا اور فاصلہ بڑھ گیا۔"

کونسی نماز سے کوئی فائدہ نہیں

مَنْ لَّمْ تَنْھَھُ صَلاَ تُہٗ عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِفَاِنَّہٗ لاَ یَزْدَادُ مِنَ اللہِ بِذَالِکَ اِلَّا بُعْدًا [20]

"جس کی نماز اس کو بداخلاقی اور برائی سے مانع نہ ہوئی تو بجز اس کے اس نماز کی بدولت خدا سے اس کی دُوری بڑھ جائے اور کوئی فائدہ نہیں۔"

ترقی کی بہترین محرّک نماز

یعنی نماز انسان کی زندگی کو پاک کرنے والی، شریفانہ کردار بنانے والی، تہذیبِ نفس اور تربیتِ ضمیر کی روح بڑھانے والی چیز ہے۔ یہی سبب ہے کہ اسلام نے ادائے نماز پر سب سے زیادہ زور دیا ہےاور ہر جگہ اس کی اہمیت پر دنیا کو توجہ دلائی ہے۔ کسی قوم یا کسی فرد کی کامیاب زندگی کے لیےان باتوں کی جیسی کچھ ضرورت ہے، ظاہر ہے۔

قدرت نے مسلمانوں کو ساری دنیا پر حکومت کرنے اور ہر قسم کی روحانی و مادی

ترقیاّت کا مجموعہ بنانے کے لیے پیدا کیا تھا۔ ترقی کا سب سے بڑا اور سب سے موٴثر ذریعہ کردار کا تزکیہ ہے اوراس کی بہترین محرّک نماز ہے۔

حکومت وفرمانروائی کی باعث نماز

جس نماز کوتم ایک رسمی چیز سمجھ رہے ہو، جس کو عہدِ قدیم کا ایک بے کار اور بے سود رواج مانتے ہو، جس کے ادا کرنے میں تمہیں کیا کیا موانع پیش نہیں آتے اور جسے پڑھتے بھی ہوتو:

''برزبان تسبیح ودردل گاوٴخر''

کا حال ہوتا ہے، وہی نماز ایسی چیز تھی کہ اس کی حقیقت پر تمہیں عبور ہوتا تو اس وقت تمہاری حالت بدلی ہوئی نظر آتی اور تم یوں مقہور ومغلوب نہ ہوتے۔ کیونکہ تم میں سے ہر فرد ایک ایسا اعلیٰ اور مکمل اخلاقیکر دار رکھتا جو دنیا میں صرف عزت وعظمت، ہیبت وجبروت، حکومت وفرمانروائی اور طاقت وطاقت فرمائی ہی کے لیے ہے۔ اس کی مزید تشریح اور معارفِ صلاۃ کا انکشاف آگے چل کر ایک مستقل عنوان کے تحت آئے گا۔ یہ محض ایک سرسری اشارہ تھا:

چہ بودے ار بدل ایں دردہم نہاں بودے

کہ کارمن نہ چنیں بودے نہ چناں بودے؟

مسلمانوں کی موجودہ نماز

غور کرو! جو نماز تم پڑھتے ہو، جس عبادت پر تمہیں ناز ہے اور جو اندازِ پرستش تم نے قائم کر رکھا ہے، وہ حقیقت سے کس قدر دور ہے؟ کیا اس نے کبھی تمہیں فواحش ومنکرات سے روکا؟ کیا اس کے ذریعے تمہارا کردار پاک وبلند ہوسکا؟ کیا اس کی مواظبت نے تم میں کوئی روحانیّت پیدا کی؟ کیا تمہاری تنزل پذیر حالت اس کے طفیل ذرا سی بدلی؟ کیا خدا کا تعلق اور مخلوق کا رشتہ تمہارے ہاتھ آسکا؟

اگر جواب نفی میں ہے تو پھر کیا یہ وہی نماز ہے جس کی نسبت حضرت فاروقِ اعظمؓ نے بے خودانہ لہجے میں فرمایا تھا۔

لَا حَظَّ فِیْ الْحَیَاتِ وَقَدْ عَجُزَتُ عَنْ اِقَامَۃِ الصَّلاۃِ

ادائے نماز ہی کی استطاعت نہ رہی تو پھر زندگی میں کیا لطف رہا؟

صلوٰۃِ وسطیٰ کی تعیین

تمہید

ایک خاص نماز کی تحقیق بھی اسی ذیل میں ضروری ہے جس کی تعیین وتحدید کا سوال ایک نہایت معرکتہ الآراء مسئلہ بن گیا ہے اور جس نے اصل نماز کے متعلق عجیب عجیب مباحث پیدا کردیے ہیں یعنی صلاۃِ وسطیٰ جس کے لیے قرآن کریم نے خاص طور پر تاکید کی ہے:

حٰفِظُوْا عَلَی الصَّلٰوۃِ وَالصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی (۲:۲۳۸)

''محافظت کرو نماز کی اور علی الاخص نمازِ وسطیٰ کی۔''

صلاۃِ الوسطیٰ کونسی نماز ہے؟

نمازِ وسطیٰ کس نماز کا نام ہے؟ علمائے تفسیر وحدیث کے متعدّد قول اس باب میں ہیں:

نمازِ عصر

نمازِ وسطیٰ عصر کی نماز ہے اس کی تائید میں ۶۹ حدیثیں مروی ہیں جن میں ایک خاص حدیث واقعہء احزاب کے متعلق ہے اور بقول محدث ابن جریر یہی حدیث تخصیص عصر کی ''عِلَّۃُ الْعِلَلِ'' ہے۔

شَغَلَ الْمُشْرِکُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ صَلٰوۃِ الْعَصْرِ حَتّٰی اصْفَرَّتْ اَوَ اِحْمَرَّتْ. فَقَالَ شَغَلُوْنَا عَنِ الصَّلاۃِ الْوُسْطٰی مَلاءِ اللّٰہُ اَجْوَافَھُمْ وَقُبُوْرَھُمْ نَارًا ٥

''مشرکوں نے رسول اللہ ﷺ کو جنگ میں اتنا مشغول کرلیا کہ نماز عصر ادا کرنے کی مہلت نہ ملی۔ حتیٰ کہ آفتاب کا رنگ زرد یا سرخ ہو گیا یعنی غروب کا وقت آ گیا اس حال میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا: خدا ان کے سینے اور قبریں آگ سے بھر دے جنہوں نے ہم کو نمازِ وسطیٰ سے روک رکھا۔''

نماز ظہر

نماز وسطیٰ ظہر کی نماز ہے۔ اس کی تائید میں ۲۶ حدیثیں مروی ہیں جن میں تخصیص ظہر کی ''عِلَّةُ الْعِلَلِ'' دو حدیثیں ہیں:

كَانَ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي الظُّهْرَ بِالْهَاجِرَةِ وَلَمْ يَكُنْ يُصَلِّي صَلاَةً اَشَدُّ عَلٰى اَصْحَابِ النَّبِيّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَم مِنْهَا. قَالَ: فَنَزَلَتْ حَافِظُوْا عَلَى الصَّلٰوةِ وَالصَّلاَةِ الْوُسْطٰى وَقَالَ اِنَّ قَبْلَهَا صَلاَتَيْنِ وَ بَعْدَهَا صَلاَتَيْنِ "

''رسول اللہ ﷺ ظہر کی نماز دوپہر ڈھلتے ہی پڑھتے تھے۔ آپؐ جتنی نمازیں ادا فرماتے تھے، اس سے زیادہ اور کوئی نماز صحابہ پر گراں نہ تھی۔ اسی بنا پر یہ آیت اُتری کہ ''نمازوں اور نماز وسطیٰ کی محافظت کرو۔'' راوی حدیث (زید بن ثابت) نے اس کے وسطیٰ ہونے کی یوں بھی توجیہہ کی ہے کہ ظہر سے قبل و بعد دو دو نمازیں ہیں پس نماز ظہر، وسط میں ہے۔''

نماز عشاء

نمازِ وسطیٰ عشاء کی نماز ہے، اس کی تائید میں خصوصیّت کے ساتھ اس حدیث سے مدد لی جاتی ہے:

"عَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ صَلَّى الْعِشَآءَ الْاٰخِرَةَ فِيْ جَمَاعَةٍ كَانَ كَقِيَامِ نِصْفِ لَيْلَةٍ"

''حضرت عثمانؓ، رسول ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ جس نے عشاء کی نماز، جماعت کے ساتھ ادا کی اس کی نماز نصف شب تک کی عبادت سمجھی جائے گی۔''

ازروئے عقل اس کے وسطیٰ (درمیانی نماز) ہونے کی یہ علّت بھی بیان کی جاتی ہے۔

اِنَّهَا مُتَوَسَّطَةٌ بَيْنَ صَلاتَيْنِ نُقْصَرَانِ : الْمَغْرِبَ وَا لصُّبْحَ [۲۱]

''نمازِ عشاء مغرب وفجر دونوں چھوٹی چھوٹی نمازوں کے مابین متوسط درجہ کی نماز ہے۔''

نماز فجر

نمازِ وسطیٰ، فجر کی نماز ہے۔اس کی تائید میں ۷احدیثیں مذکور ہیں۔جن میں سے ایک یہ ہے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّهُ صَلَّى صَلاةَ الْغَدَاةِ فِيْ مَسْجِدِ الْبَصْرَةِ فَقَنَتَ قَبْلَ الرَّكُوْعِ وَّقَالَ: هٰذِهِ الصَّلَاةُ الْوُسْطٰى الَّتِيْ ذَكَرَهَا اللّٰهُ "حَافِظُوْا عَلَى الصَّلٰوةِ وَالصَّلاَةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْ اللّٰهِ قَانِتِيْنَ" [۲۲]

''بصرہ کی مسجد میں عبداللہ بن عباسؓ نے صبح کی نماز ادا کی، جس میں رکوع سے پہلے دُعا قنوت پڑھی اور فرمایا کہ یہ وہی نماز وسطیٰ ہے جس کی نسبت اللہ تعالیٰ نے تذکرہ کیا ہے کہ نمازوں اور نماز وسطیٰ کی محافظت کرو اور اللہ کے لیے قنوت کرتے ہوئے کھڑے ہو۔''

ابن جریر کی رائے

علامہ ابن جریر لکھتے ہیں:

وَعِلَةُ مَنْ قَالَ هٰذِهِ الْمُقَالَةَ اَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى ذَكَرَهُ قَالَ: حَافِظُوْا عَلَى الصَّلٰوةِ وَالصَّلاَةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ بِمَعْنَى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ فِيْهَا قَانِتِيْنَ، قَالَ فَلاَ صَلاَةَ مَكْتُوْبَةٌ مِنَ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ فِيْهَا قُنُوْتٌ سِوَى صَلاَةَ الصُّبْحِ فَعُلِمَ بِذٰلِكَ اَنَّهَا هِيَ دُوْنَ غَيْرِهَا ٥ [۲۳]

''جن لوگوں کا قول ہے کہ نماز وسطیٰ فجر کی نماز ہے وہ اس بناء پر یہ کہتے ہیں کہ اللہ

تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ نمازوں کی اور نماز وسطیٰ کی محافظت کرو۔اور اللہ کے لیے قنوت کرتے ہوئے کھڑے ہو۔ پس وہ کھڑے ہونے کے معنی عبادت کرنے اور قنوت کرنے کا مطلب نماز میں دُعائے قنوت پڑھنا سمجھتے ہیں۔نماز پنجگانہ میں نماز فجر کے علاوہ کوئی ایسی نماز نہیں جس میں ہم دُعائے قنوت پڑھتے ہوں لہٰذا معلوم ہوا کہ نماز وسطیٰ جس کے ساتھ قنوت کی شرط ہے فجر ہی کی نماز ہے کوئی اور نماز نہیں ہے۔''

پانچوں نمازوں میں ایک

نمازِ وسطیٰ ،تو معلوم نہیں کہ کون سی نماز ہے۔مگر انہی پانچوں نمازوں میں سے ایک نہ ایک یہ بھی ہے۔اس کی تائید میں تین حدیثیں روایت کی گئی ہیں جن میں دو یہ ہیں:

كُنَّا عِنْدَ نَافِعٍ وَمَعَنَا رَجَاءُ بْنُ حَيَاةٍ فَقَالَ لَنَا رَجَاءٌ سَلُوْا نَافِعًا عَنِ الصَّلاةِ الْوُسْطٰى فَسَاءَ لَنَاهُ فَقَالَ قَدْ سَالَ عَنْهَا عَبْدَ اللهِ بْنَ عُمَرَ رَجُلٌ فَقَالَ هِيَ فِيْهِنَّ فَحَافِظُوْا عَلَيْهِنَّ كُلُّهُنَّ [۲۴]

''ہم لوگ نافع کے پاس بیٹھے تھے ہمارے ساتھ رجاء بن حیاۃ بھی تھے۔رجاء نے کہا کہ نافع سے پوچھو کہ نماز وسطیٰ کونسی نماز ہے؟ ہم نے نافع سے سوال کیا تو نافع نے جواب دیا کہ عبداللہ بن عمرؓ سے بھی ایک شخص نے یہی سوال کیا تھا جس کے جواب میں ابن عمر نے کہا تھا کہ انہی پانچ نمازوں میں ایک نماز یہ بھی ہے پس تم سب کی حفاظت کرو۔''

دوسری حدیث میں ہے:

عَنْ اَبِى خُطَيْمَةَ قَالَ فَسَئَالَتُ الرَّبِيْعَ بْنَ خَيْثَمٍ عَنِ الصَّلاةِ الْوُسطٰى قَالَ: اَرَأَيْتَ اِنْ عَلِمْتَهَا كُنْتَ مُحَافِظًا عَلَيْهَا وَمُضِيْعًا سَائِرَ هُنَّ ؟ قُلْتُ لاَ، فَقَالَ : فَاِنَّكَ اِنْ حَافَظْتَ عَلَيْهِنْ فَقَدَ حَافَظْتَ عَلَيْهَا [۲۵]

''ابوخطیمہ کہتے ہیں کہ میں نے ربیع بن خثیم سے نماز وسطیٰ کی نسبت دریافت کیا۔

اُنہوں نے کہا، اگر تمہیں یہ معلوم ہو جائے تو کیا صرف اسی ایک نماز کی محافظت کرو گے اور بقیہ نمازیں چھوڑ دو گے؟ میں نے کہا ''نہیں'' اس پر اُنہوں نے کہا کہ اگر تم نے ان سب نمازوں کی محافظت کی تو اس کی محافظت بھی کر لی۔''

نماز پنجگانہ کا مجموعہ

نمازِ وسطیٰ ان پانچ نمازوں کے مجموعہ ہی کا نام ہے۔ اس کی تائید میں یہ ذیل پیش کی جاتی ہے۔

اِنَّ الْوُسْطٰی مَجْمُوْعُ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ فَاِنَّ الْاِیْمَانَ بِضْعُ وَّسَبْعُوْنَ دَرَجَۃً اَعْلاَھَا شَھَادَۃُ اَنْ لاَ اِلٰہُ اِلَّا اللہُ وَاَدْنَا ھَا اِمَاطَۃُ الْاَذٰی عَنِ الطَّرِیْقِ وَالصَّلٰوتُ الْمَکْتُوْبَۃُ وَاسِطَۃٌ بَیْنَ الطَّرَفَیْنِ ''[۲۶]

''حقیقت میں، نماز وسطیٰ سے مراد اوقات پنجگانہ کی نمازوں کا مجموعہ ہے، اس لیے کہ حسب راویت صحیحہ ایمان کے کچھ اوپر ۷۰ درجے ہیں جن میں اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی معبود کے نہ ہونے کی شہادت دی جائے اور ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ راستے سے اذیّت کی چیزیں ہٹا دی جائیں۔ فرض نمازوں کا درجہ ان دونوں کے درمیان ہے اور یہ ان دونوں کناروں کے لیے باہم ملنے کی جگہ ہے، پس یہی وسط ہے۔

معنی لفظ وسطیٰ

علمائے لغت کا بیان

صلاۃِ وسطیٰ کے معنی کیا ہیں؟ علمائے لغت و محققین ادبیات کا بیان ہے:

اَلْوُسْطٰی تَانِیْثُ الاوْسَطِ، وَاَوْسَطُ الشَّیءِ وَوَسْطُہٗ خِیَارُہٗ، وَمِنْہُ قَوْلُہٗ تَعَالٰی: وَکَذَالِکَ جَعَلْنَا کُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا ۔ وَوَسَطَ فُلاَ نُ نِ الْقَوْمَ یَسِطُھُمْ اَیْ صَارَفِیْ وَسْطِھِمْ وَلَیْسَتْ مِنَ الْوَسْطِ الَّذِیْ

مَعْنَاهُ مُتَوَسَّطٌ بَيْنَ شَيْئَيْنِ لِاَنَّ فُعْلٰى مَعْنَاهَا التَّفْضِيلَ وَلاَ يُبْنَى التَّفْضِيلُ اِلَّا مَا يُقْبَلُ الزِيَادَةُ وَالنَّقْصُ، وَالْوَسْطُ بِمَعْنَى الْعَدْلِ وَالْخِيَارِ يَقْبُلُهَا بِخِلاَفِ التَّوَسُّطِ بَيْنَ الشَّيْئَيْنِ فَاِنَّهُ لاَ يَقْبُلُهَا، فَلاَ يَبْنَى مِنْهُ اَفْعَلُ التَّفْضِيلُ "[27]

"وسطیٰ "لفظ" اوسط کا صیغہ مونث ہے، محاورہ میں کہتے ہیں، اوسط الشیء اور اوسط الشیء (کسی چیز کا اوسط اور اس کا اوسطاً) اور اس سے مراد لیتے ہیں، خیار الشیء (بہترین چیز) اوسط وسط سے تو مشتق ہے مگر اس وسط سے مشتق نہیں ہے جس کے معنی دو چیزوں کے درمیانی حصہ کے آتے ہیں، اس لیے کہ فعلی جس کے وزن پر وسطی کا لفظ ہے۔ اس کے معنی "تفضیل"، یعنی زیادتی کے ہیں اور "تفضیل" کے لیے، وہی لفظ لائیں گے جو زیادتی و کمی دونوں حیثیتوں کو قبول کر سکتا ہو۔ وسط جس کے معنی معتدل اور بہتر کے ہیں، ان دونوں (یعنی زیادتی و کمی) کی قابلیت رکھتا ہے، (یعنی بصورتِ زیادت اعتدال و بہتری اور بحالت نقص بے اعتدالی و بدتری کی گنجائش بھی اس میں نکل سکتی ہے) بخلاف اس توسط کے، جس سے دو چیزوں کا درمیانی حصہ مراد ہو کیونکہ اس میں دوسرا پہلو آ سکتا ہی نہیں، لہٰذا صیغہ افعل التفضیل اس سے نہیں بنا سکتے۔"

حاصل کلام

یعنی جن روایتوں کی بناء پر نمازِ وسطیٰ کے لیے اوقات پنجگانہ میں کسی ایسی نماز کی تحدید کی جاتی ہے، جو تمام نمازوں کے درمیان میں واقع ہو، یہ تخیّل ہی برخود غلط ہے، کیونکہ وسطیٰ کے یہ معنی ہی نہیں ہیں۔

بحث واوٴ عاطفہ

تقاضائے عطف

اس تحقیق کی تائید میں کہا گیا ہے کہ:

وَاوُ الْعَطْفِ تَقْتَضِی الْمُغایَرَۃَ

''واوٴ عطف کا اقتضایہ ہے کہ معطوف ومعطوف الیہ دونوں دو علیحدہ چیزیں ہوں''

پس حَافِظُوْا عَلَی الصَّلٰوۃِ وَالصَّلاَۃِ الْوُسْطٰی میں واوٴ عطف موجود ہے۔لہٰذا اصلوات سے جو نمازیں مراد ہیں،ان کی ذیل میں نماز وسطٰی کیونکر آ سکتی ہے؟ لامحالہ اسے کوئی دوسری نماز فرض کرنا پڑے گا۔

ایک شبہ کا ازالہ

یہ شبہ اگر صحیح ہے تو وہ روایتیں جو اوقاتِ پنجگانہ کی نمازوں میں سے کسی ایک نماز کو وسطٰی بنا رہی ہیں، یقیناً ماننی پڑیں گی۔نمازِ وسطٰی کو فرائضِ خمسہ کے علاوہ ایک دوسری نماز ماننا ہوگا اور تحقیق کے لیے بحث کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔

مفسرین کی غلطی

لیکن اس کا جواب یہ دیا گیا کہ ہر واوٴ کو واوٴ عطف مان لینا ہی غلط ہے۔واوٴ کی ایک قسم واوٴ زائد بھی ہے،جس کی متعدد مثالیں خود قرآن کریم میں موجود ہیں مثلاً:

(۱) وَكَذٰلِکَ نُفَصِّلُ الْاٰيَاتِ (۶:۵۵)

(۲) وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ (۶:۵۵)

(۳) وَكَذٰلِکَ نُرِیْٓ اِبْرَاهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْن (۶:۷۵)

''اور دیکھو ہم اسی طرح تفصیل سے اپنی آیتیں بیان کرتے ہیں۔ اور اس لیے (بیان کرتے ہیں) تاکہ مجرموں کی راہ ظاہر ہو جائے۔ اور اسی طرح ہم نے ابراہیم کو آسمانوں کی اور زمین کی پادشاہت کے جلوے دکھائے تاکہ وہ یقین رکھنے والوں میں سے ہو جائیں۔''

اقسام عطف

خود عطف میں بھی جہاں ایک قسم عطف وصفی کی ہے، جس میں معطوف و معطوف الیہ میں مغائرت ضروری ہے وہاں ایک دوسری قسم عطف ذاتی کی بھی ہے، جسے اس تفریق سے کچھ سروکار نہیں۔ آیتوں میں عطف ذاتی کی بکثرت نظیریں وارد ہیں۔ مثلاً:

(۱) وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ (۳۳:۴۰)

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى ۝ الَّذِىْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۝ وَالَّذِىْ قَدَّرَ فَهَدٰى ۝ وَالَّذِىْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى (۸۷:۱تا۴)

''اور لیکن (محمد) اللہ کے رسول اور سلسلۂ نبوت کے خاتم ہیں۔ اے نبیؐ آپ ﷺ اپنے بلند و اعلیٰ پروردگار کے نام کی تسبیح کریں، اسی نے ہر چیز کو پیدا کیا۔ پھر انہیں درست کیا۔ اس نے تمام مخلوق کا اندازہ کیا۔ پھر انہیں ہدایت یاب فرمایا۔''

ان مثالوں میں کوئی ایک بھی ایسی نہیں ہے، جسے مغائرت کے ثبوت میں پیش کر سکیں۔ یہ سب عدم مغائرت کے لیے ہیں۔ اسی طرح بیشمار آیتیں نقل کی جا سکتی ہیں۔ مَمَّالاَ حَاجَةَ اِلٰی سُوْقِهَا هُوَ مَعْلُوْمٌ بِالْبَدَاهَةِ[۲۸] عرب کا ایک قدیم شعر ہے:

اِلٰی الْمَلِكِ الْقَوْمِ وَابْنِ الْهَمَّامِ
وَلَيْثَ الْكَثِيْبَةَ فِىْ الْمَزْدَحَمِ

یہاں کہیں بھی مغائرت نہیں ہے۔ 'اِبنِ اَبِی رَدَادُ اَ یَادِی' کے مشہور قصیدے میں ہے:

سُلِّطَ الْمَوْتُ وَ الْمَنُوْنُ عَلَيْهِمِ
فَلَهُمَ فِيْ صَدَى الْمَقَابِرِ هَامٌ

موت اور منون کے درمیان واؤ عطف سے تفریق کی ہے لیکن معنی دونوں کے ایک ہیں۔

ارض حیرہ کا نامور شاعر اور لقمان ابن منذر کا سرپرست عدی بن زید عبادی ایک قصیدے میں لکھتا ہے۔

فَقَدِمَتِ الْاَدِيْمُ لِرَاهَشَيْهِ
فَالفٰى قَوْلَهَا كَذِبًا وَ مِيْنًا

''کذب'' اور ''مین'' دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ فارسی میں بھی یہی قاعدہ ہے۔ فردوسی کا شعر ہے:

در از جوئے خلدش بہنگام آب
بہ بیخ انگبیں ریزی و شہد ناب

انگبیں اور شہد دونوں دو چیزیں نہیں ہیں۔ سیبویہ کا قول ہے:

يَجُوْزُ قَوْلُ الْقَائِلِ "مَرَرْتُ بِاَخِيْكَ" وَيَكُوْنُ الصَّاحِبُ هُوَ الْاَخُ نَفْسُهٗ

''یہ کہنا جائز اور درست ہے کہ میں تیرے بھائی اور تیرے رفیق کے پاس سے گزرا خواہ جس کو رفیق کہا گیا ہو، وہی بھائی ہو یعنی دونوں ایک ہوں دو نہ ہوں۔''

معنیٔ قنوت

سکوت و خاموشی

قنوت کے کیا معنی ہیں؟ اس مسئلہ میں بھی حسبِ معمول متعدد اقوال ہیں:

(۱) قُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْن [۲۹] میں قنوت کے معنی سکوت و خاموشی کے ہیں اس باب میں ۹ حدیثیں مروی ہیں، جن میں ایک یہ ہے:

كُنَّا نَقُوْمُ فِيْ الصَّلٰوةِ فَنتكَلَّمُ وَيَسْاَلُ الرَّجُلُ صَاحِبَهٗ عَنْ حَاجَتِهٖ وَيُخبِرُهٗ وَيَرُدُّوْنَ عَلَيْهِ اِذَا سَلَّمَ حَتّٰى اَتَيْتَ اَنَا فَسَلَّمْتُ فَلَمْ يَرَدُّوْا عَلَيَّ السَّلَامَ فَاشْتَدَّ ذٰلِكَ عَلَيَّ فَلَمَّا قَضٰى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِنَّهٗ لَمْ يَمْنَعْنِيْ اَنْ اَرُدَّعَلَيْكَ السَّلَامَ اِلَّااِنَّا اُمِرْنَا اَنْ نَقُوْمَ قَانِتِيْنَ لا نَتَكَلَّمُ فِيْ الصَّلاةِ وَالْقُنُوْتُ السَّكُوْتُ

''ہم لوگ نماز میں باتیں کیا کرتے تھے، لوگ اپنے ساتھی سے اپنی ضرورت کے متعلق سوال کرتے وہ انہیں جواب دیتا، اطلاع دیتا، باہم سلام کرتے، جواب دیتے، یہی کیفیت روزمرہ تھی، کہ ایک مرتبہ میں حاضر ہوا نماز ہو رہی تھی، میں نے سلام کیا، جواب نہ ملا، مجھ پر یہ واقعہ بہت ہی گراں گزرا، رسول اللہ ﷺ جب نماز سے فارغ ہوئے تو آپ ﷺ نے ارشادفرمایا: ''جوابِ سلام سے مجھے صرف اس بات نے روکا تھا کہ ہم کو حکم ہوا ہے کہ قنوت کے ساتھ عبادت کریں، نماز میں نہ بولیں، پس قنوت کے معنی خاموشی کے ہیں۔''

خشوع وخضوع

(۲) قنوت کے معنی خشوع وخضوع کے ہیں۔ اس باب میں پانچ حدیثیں مروی ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے:

اِنَّ مِنَ الْقُنُوْتِ الْخُشُوْعَ وَ طُوْلَ الرَّكُوْعِ وَغَضَّ الْبَصَرِ وَخفْضَ الْجَنَاحِ مِنْ هَيْبَةِ اللّٰهِ كَانَ الْعُلَمَاءُ اِذَا اَقَامَ اَحَدُهُمْ يُصَلِّي يَهَابُ الرَّحْمَانَ اَنْ يَّلْتَفِتَ اَوْ اَنْ يَّقْلُبَ الْحَصَى اَوْلَعِبَتْ بِشَيْءٍ اَوْ يَحْدُثَ نَفْسَهُ بِشَيْءٍ مِنْ اَمْرِ الدُّنْيَا اِلَّا نَاسِيًا [۳]

''قنوت کی ذیل میں خشوع، طول رکوع، نظر نیچی رکھنی، خدا کے خوف سے متواضع رہنا، یہ سب باتیں داخل ہیں۔ علمائے صحابہ کی عادت تھی کہ جب ان میں کوئی نماز پڑھنے اُٹھتا تو خدا کی ان پر اتنی ہیبت چھا جاتی کہ نہ ادھر التفات کرتے، نہ

کنکریاں الٹتے پلٹتے، نہ کوئی بیکار شغل کرتے، نہ دنیا کی کسی بات کو جی میں لاتے اوراگر لاتے تو بھولے سے لاتے۔''

دُعائے قنوت

(۳) قنوت سے مراد دُعائے قنوت ہے۔ اس کی تائید میں ابن عباسؓ کی روایت پہلے نقل ہو چکی ہے۔

(۴) قنوت کے معنی اطاعت کے ہیں، اس باب میں ۲۴ حدیثیں مروی ہیں جن میں سے اکثر کے راوی ثقہ ہیں، اور ادبیات عرب سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

ابن جریر کی رائے

علامہ ابن جریر لکھتے ہیں:

اَوْلٰی هَذِهِ الْاَقْوَالِ بِالصَّوَابِ فِیْ تَاوِیْلِ قَوْلِهٖ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِیْنَ قَوْلُ مَنْ قَالَ تَاوِیْلُهٗ مُطِیْعِیْنَ، وَذٰلِکَ اَنَّ اَصْلَ الْقُنُوْتِ الطَّاعَةُ، وَقَدْ تَکُوْنُ الطَّاعَةُ لِلّٰهِ فِیْ الصَّلَاةِ بِالسُّکُوْتِ عَمَا نَهَی اللّٰهُ مِنْ الْکَلَامِ فِیْهَا وَلِذٰلِکَ وَجُهٌ مِنْ وَجْهِ تَاوِیْلِ الْقُنُوْتِ فِیْ هَذَا الْمُوْضِعِ اِلٰی السُّکُوْتِ فِیْ الصَّلَاةِ اَحَدُ الْمَعَانِیْ الَّتِیْ فَرَضَهَا اللّٰهُ عَلٰی عِبَادِهٖ فِیْهَا اِلَّاعَنْ قِرَأَةِ قُرْآنٍ اَوْ ذِکْرٍ لَهٗ بِمَا هُوَ اَهْلَهٗ ..... وَقَدَتَکُوْنُ الطَّاعَةُ لِلّٰهِ فِیْهَا بِالْخُشُوْعِ وَ خَفْضِ الْجَنَاحِ وَاِطَالَةِ الْقِیَامِ وَبِالدُّعَاءِ لِاَنَّ کُلًّا غَیْرُ خَارِجٍ مِنْ اَحَدَ مَعْنَیَیْنِ مِنْ اَنْ یَّکُوْنَ مِمَّا اُمِرَبِهٖ الْمُصَلِّی اَوْمِمَّا نُدِبَ اِلَیْهِ ، وَالْعَبْدُ بِکُلِّ ذٰلِکَ لِلّٰهِ مُطِیْعٌ وَهُوَ لِرَبِّهٖ قَانِتٌ، وَالْقُنُوْتُ اَصْلُهُ الطَّاعَةُ لِلّٰهِ ثُمَّ یُسْتَعْمَلُ فِیْ کُلِّ مَا اَطَاعَ اللّٰهِ الْعَبْدُ..... فَتَاوِیْلُ الْاٰیَةِ اِذًا حَافِظُوْا عَلَی الصَّلٰوةِ وَالصَّلاَ ةِ الْوُسْطٰی وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ فِیْهَا مُطِیْعِیْنَ..... غَیْرَ عَاصِیْنَ اللّٰهَ

فِيهَا بِتَضْيِيعِ حُدُوْدِهَا وَالتَّفْرِيْطِ فِي الْوَاجِبِ بَعْدَ عَلَيْكُمْ فِيهَا وَفِيْ غَيْرِهَا مِنْ فَرَائِضِ اللهِ [۳۱]

''اللہ کے لیے قنوت کرتے ہوئے عبادت کرو۔'' اس کی تفسیر میں جو اقوال مذکور ہیں ان میں زیادہ درست اور بہتر تاویل یہ ہے کہ قنوت کرنے کے معنی اطاعت کرنے کے ہیں۔ سبب یہ ہے کہ قنوت اصل لغت میں اطاعت و فرمانبرداری ہی کے لیے موضوع ہے۔ نماز میں خدا کی اطاعت کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ خاموش رہے۔ جن باتوں میں خدا نے گفتگو کرنے کی ممانعت کی ہے ان میں کلام نہ کرے، آیت میں جو لوگ قنوت کے معنی سکوت لیتے ہیں، اس تاویل کی ایک شکل وہ بھی ہے۔ خدا نے بحالتِ نماز بندوں پر سکوت کو بھی فرض ٹھہرایا ہے۔ البتہ قرأت قرآن یا وہ اذکار جو خدا کے شایانِ شان ہیں، اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں.....
نماز میں اطاعت الٰہی کی ایک دوسری صورت خشوع وخضوع وطولِ قیام و دُعا بھی ہے، یہ تمام چیزیں دو باتوں سے خالی نہیں: یا تو نماز پڑھنے والے کو اس کا حکم ملا ہے، یا اس کو مستحب ٹھہرایا گیا ہے۔ دونوں حالتوں کی اطاعت میں بندہ، خدا کی اطاعت اور قنوت کرنے والا سمجھا جائے گا۔ قنوت کی حقیقت بھی خدا کی اطاعت ہے۔ بعد میں ان تمام اشکال کو بھی قنوت کہنے لگے جن کے ذریعے سے خدا کی اطاعت کی جائے..... اس صورت میں آیت کی تفسیر یہ ہوگی کہ نمازوں کی اور نمازِ وسطیٰ کی حفاظت کرو اور ان عبادتوں میں خدا کی اطاعت کیا کرو..... حدودِ اطاعت کو تلف کرکے نافرمان نہ بنو۔ نمازوں میں اور دوسرے فرائض و واجبات میں جو اُمور خدا نے تم پر لازم ٹھہرائے ہیں، ان میں کمی نہ ہونے دو۔''

نماز سے مقصود بالذات

نماز میں سب سے بڑی مہم

حقیقت یہ ہے کہ نماز میں سب سے بڑی مہم اطمینان قلب وحضور نفس وخشوع

طبیعت وخضوع جوارح ہے کہ انسان اپنے تمام اعضاء اور تمام قویٰ اور جذبات سے خدا کی جانب متوجہ ہو جائے اور جن اغراض کے لیے نماز کی تاکید کی گئی ہے ان کو نہایت مکمل طریق پر بجالائے۔

مغفرت کا وعدہ کس کے لیے؟

حدیث میں ہے:

خَمَسُ صَلَوَاتٍ اِفْتَرَ ضَھُنَّ اللّٰہُ تَعَالٰی : مَنْ اَحْسَنَ وُضُوْءَ ھُنَّ وَصَلاتَھُنَّ لِوَقْتِھِنَّ وَاَتَمَّ رُکُوْعَھُنَّ وَخُشُوْعَھُنَّ کَانَ لَهُ عَلَی اللّٰہِ عَھْدٌ اَنْ یَّغْفِرَلَهُ وَمَنْ لَّمْ یَفْعَلْ فَلَیْسَ لَهُ عَلَی اللّٰہِ عَھْدٌ اِنْ شَآءَ غَفَرَلَهُ وَاِنْ شَاءَ عَذَّبَهُ [۳۲]

''خدا نے پانچ نمازیں فرض ٹھہرائی ہیں، جس نے اچھی طرح وضو کیا، وقت پر نماز پڑھی اور کامل طریق پر رکوع وخشوع کے حقوق سے عہدہ برا ہوا تو اللہ کا وعدہ ہے کہ ضرور اس کی مغفرت ہوگی لیکن جس نے ایسا نہ کیا تو کوئی وعدہ نہیں، چاہے تو اللہ اس کو بخش دے اور چاہے عذاب میں ڈالے۔''

ایک واقعہ نبوی ﷺ

یہی وہ نماز ہے، جسے کامل طریق پر ادا نہ ہوتے دیکھ کر ایک شخص کو رسول اللہ ﷺ ٹوکتے رہے۔ اس نے تین چار مرتبہ نماز پڑھی مگر ہر مرتبہ آنحضرت ﷺ نے یہی فرمایا:

قُمْ فَصَلِّ فَاِنَّکَ لَمْ تُصَلِّ [۳۳]

''اٹھو اور پھر نماز پڑھو۔ اس لیے کہ جو نماز تم نے پڑھی ہے وہ نماز ہی نہ تھی۔''

منتہائے نماز

وہ نماز، جو انسان میں ایک ذرّہ برابر اشراق ونورانیت نہ پیدا کر سکے، وہ خواہ کسی

وقت کی نماز ہو، اس میں صلاۃِ وسطیٰ کا درجہ کیونکر آ سکتا ہے؟ روزمرہ کی جو نمازیں فرض ہیں یہی صلاۃِ وسطیٰ بھی ہیں۔ شرط یہ ہے کہ ہر ایک شرط کی تکمیل پر نظر ہو۔ نماز کے اغراض و مقاصد ان سے حاصل ہو سکیں، قلب میں طہارت پیدا ہو، بطون میں نورانیت کا ظہور ہو، روحانیت بڑھے، نفس میں تہذیبِ خصال بلند ہو اور انسان اس قابل ہو سکے کہ جب نماز پڑھے تو "مَلَکُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" کے اسرار، اس پر افشا ہو جائیں:

لَوْ کَشَفَ الْغَطَاءَ لَمَا ازْدَدَتُ یَقِیْنًا

"قدرت کے تمام پردے اگر کھل جائیں۔ جب بھی میرا تیقن اس درجہ بلند ہے کہ اس میں کوئی اضافہ نہ ہو سکے گا۔"

پروردگارِ عالم کا شہود

علمائے حقیقت لکھتے ہیں:

اَلْقَلْبُ هُوَالَّذِیْ فِیْ وَسْطِ الْاِنْسَانِ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ فَکَاَنَّهُ قِیْلَ: حَافِظُوْا عَلٰی صُوْرَةِ الصَّلَوَاتِ بِشَرَائِطِهَا حَافِظُوْا عَلٰی مَعَانِیْ الصَّلَوَاتِ بِحَقَائِقِهَا بِدَوَامِ شُهُوْدِ الْقَلْبِ لِلرَّبِّ فِیْ الصَّلاةِ وَبَعْدِهَا

"قلب وہ چیز ہے، جو شرف مرتبت و شرف محل، ہر حیثیت سے انسان کے وسط جسم میں واقع ہے۔ یہ رُوح اور جسم میں ٹھیک درمیان کی حالت رکھتا ہے۔ گویا نماز وسطیٰ کی محافظت کا حکم دیتے ہوئے یہ کہا گیا کہ صورت نماز کی محافظت کرو۔ معانی و اغراض نماز کی محافظت کرو۔ حقیقت و حکمت نماز کی محافظت کرو اور یہ محافظت اس طرح کرو کہ نماز میں اور نماز کے بعد، ہر حالت میں قلب کو بطریق دوام و استمرار پروردگارِ عالم کا شہود حاصل رہے۔"

برکات نماز وسطیٰ

وسطیٰ وہی نماز ہوگی، جو فضل و شرف میں سب پر فائق ہو۔ ایسی نماز جو دینی و دنیوی، ہر قسم کی ترقیوں کی بہترین تحریک اپنے اندر رکھتی ہو۔ اس کی فضیلت میں کیا کلام ہو سکتا

ہے؟ یہی نمازیں ہیں، جن کو قرآن کریم کی اصطلاح میں وسطیٰ کا لقب دیا گیا۔ اور ان کی محافظت کی تاکید کی گئی، تاکہ انسان اس تحریک پر زمانہ بھر کی نعمتوں اور برکتوں کا احاطہ کر سکے اس کے تفوق کی سارے عالم پر حکومت ہو۔

تلخیص مضامین

کون سی نماز، نماز ہے؟

اس تمام مذکور کا حاصل یہ ہے:

(۱) نماز اور اجزائے نماز سے محض خشوع وخضوع و طہارتِ نفس مقصود ہے۔ یہ چیز ہی حاصل نہ ہو تو وہ نماز بھی مشرکین قریش کی نماز جیسی ہوگی جو انسان کو دوزخ میں لے جانے والی چیز ہے۔

(۲) نماز وہی ہے جو حقیقی معنوں میں ادا کی جائے، ایسی نماز سے انسان کی ہر مشکل آسان ہو سکتی ہے۔

(۳) نماز کی حقیقت یہ ہے کہ وہ فواحش ومنکرات سے روکے اور انسان کی زندگی کو پاک و ستھرا بنا سکے جس نماز سے یہ خصوصیت حاصل نہ ہو وہ نماز، نماز ہی نہیں ہے۔

(۴) نماز کی مواظبت سے انسان درست ہوتا ہے۔ خدا کی بارگاہ میں تقرب بڑھتا ہے اور اس درجہ بڑھتا ہے کہ دنیا کی تمام جھوٹی ہستیاں ہیچ نظر آنے لگتی ہیں!

شریعت میں نماز وسطیٰ

(۵) وہ نماز جو اِن اوصاف کی جامع ہو۔ شریعت کی اصطلاح میں وہی نماز وسطیٰ ہے۔ حدیثوں پر تدبّر کرو، جب کسی نماز کا وقت نہ رہا تو یہی شکایت ہوئی کہ نماز وسطیٰ جاتی رہی یعنی اب اتنی گنجائش باقی نہیں کہ تمام حدود وشرائط کے ساتھ یہ نماز ادا کی جاتی۔ جس نماز میں کوئی شان فضیلت دیکھی اسی کو وسطیٰ سمجھ لیا کہ تعلیم صلوٰۃ میں

تخصیصِ فضیلت صلوٰۃ وسطیٰ ہی کے لیے ہے۔

(۶) نماز وسطیٰ کی ایک صفت یہ ہے کہ معتدل ہو۔ اسی لیے مغرب وظہر وعشاء وغیرہ نمازوں کو وسطیٰ کہنے لگے تھے۔

(۷) نماز وسطیٰ کے لیے دُعائے قنوت مشروط نہیں ہے۔ قنوت، البتہ مشروط ہے جس کے معنی خضوع کے ہیں۔

(۸) نماز وسطیٰ کے لیے تمام نمازوں کے وسط میں ہونا ضروری نہیں اور نہ یہ ضروری ہے کہ اوقات خمسہ کے علاوہ یہ کوئی مستقل وجداگانہ نماز ہو۔

مواظبت نماز

(۹) نماز وسطیٰ کی محافظت لازم ہے نہ اس لیے کہ ایک رسم پوری ہو بلکہ اس لیے کہ ان میں نماز کی مواظبت سے وہ خصوصیّت پیدا ہو کہ سارے جہان کو چھالے اور ہر جگہ اسی کی حکومت ہو۔

وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَ نَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ o وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِيْ الْاَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ (۲۸:۵-۶)

''جو لوگ ملک میں کمزور ہو گئے، ہم چاہتے ہیں کہ ان پر احسان کریں، ان کو سردار بنائیں، انہیں سلطنت کا وارث ٹھہرائیں، ملک میں ان کا قدم جمائیں اور فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر کو دکھائیں کہ جس بات کا انہیں خطرہ تھا وہ انہی کمزوروں کے ہاتھ سے ان کے آ گے آ گئی۔''

فلسفۂ حقیقتِ نماز

نماز کی روحانی یادگاریں

برائیوں سے بچنے کا قلعہ

نماز روحانیت کا سرچشمہ ہے، ہدایت قلبی کا منبع، نیکی کا مرکز، برکات الٰہیہ کا مہبط اور انسان کو تمام بہیمی قوتوں اور نفسانی جوشوں سے بچانے والی ہے:

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنۡهٰى عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡكَرِ (ط)(۲۹:۴۵)

''نماز انسان کو تمام برائیوں سے روک دیتی ہے (کیونکہ اس کی وجہ سے ہمیشہ خدا کے تعلق کا تصور قائم رہتا ہے۔ پس وہ ایک قلعہ ہے جو برائیوں کے لشکر کو اپنے اندر گھسنے نہیں دیتا۔''

ارکانِ نماز، پیداوار جنگ

لیکن اس قلعہ کے ستونوں کو اس قوم کے سفرِ جہاد وغزوات ہی نے قائم کیا تھا:

كَانَ النَّبِىُّ صَلَعَمْ وَ جُيُوْشُهُ اِذَا عَلَوَا الثَّنَايَا كَبَّرُوْا وَاِذَا هَبِطُوْا سَبَّحُوْا، فَوُضِعَتِ الصَّلٰوةُ عَلَى ذَالِكَ [۳۴]

''آنحضرت ﷺ اور مجاہدین کی فوجیں جب پہاڑوں کے اُوپر چڑھتی تھیں تو تکبیر کا غلغلہ بلند کرتی تھیں اور جب اُوپر سے نیچے کی طرف اُترتی تھیں تو سبحان اللہ کا نعرہ مارتی تھیں پس نماز میں قیام وقعود، رکوع وسجود اور تکبیر وتسبیح کو اسی قالب میں ڈھالا گیا۔''

اس سے ظاہر ہوا کہ نماز کے ارکان لڑائی ہی کی بدولت وجود میں آئے، اس لیے نماز مسلمانوں کی ایک پہلی یادگار ہے۔

صلوٰۃ الخوف

تمام نمازوں میں ''صلوٰۃ الخوف'' جہاد کے ساتھ مخصوص ہے جس کے احکام دیگر نمازوں سے مختلف ہیں:

وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ قف فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً (۴:۱۰۲)

''اور جب تم مجاہدین کی صف میں نماز پڑھنا چاہو تو پہلے ایک گروہ تمہارے ساتھ اپنے ہتھیار لے کر شریکِ نماز ہو جائے، جب وہ سجدہ کر چکیں تو پیچھے ہو جائیں تا کہ حفاظت کرتے رہیں اور دوسرا گروہ آئے جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی ہے اور چاہیے کہ نہایت ہوشیاری کے ساتھ مسلح ہو کر تمہارے ساتھ نماز ادا کریں۔ کیونکہ کفار موقع ڈھونڈھ رہے ہیں کہ تم اپنے ہتھیار اور اپنے مال و متاع سے غافل ہو جاؤ تو دفعتاً تم پر ٹوٹ پڑیں۔''

مجاہدین اسلام نے اپنی اس یادگار کے ذریعے دنیا کو دکھا دیا کہ خدا کی صداقت کی محافظ قوم دشمن کے مقابلے میں اپنی روحانی یادگاروں کو کیونکر قائم رکھ سکتی ہے؟ جبکہ میدان جنگ میں تمام قومیں فرصت کے لمحوں کو ستانے اور کھانے پینے میں خرچ کرتی ہیں تو مسلمان تلواروں کے سائے کے نیچے اپنی مہلت کی گھڑیاں، صرف اللہ کی عبادت میں صرف کیا کرتے ہیں!

غرضیکہ صلوٰۃ الخوف بھی اسلامی غزوات کی ایک یادگار ہے۔

دو رکعت کی ایک نماز

اسلام میں دو رکعت کی ایک نماز بھی بطور یادگار کے قائم رکھی گئی ہے۔ جو ایک مظلوم

مجاہد (۳۶) کے جوش مذہبی کی یادگار رہے۔ اسلام صبر واستقلال، تقویٰ وطہارت اور خشوع وخضوع کا ایک قلعہ تھا، جس کو میدان میں کھڑا کیا گیا تھا۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ (۶۱:۴)

''خدا، ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو اس کی راہ میں اس استقلال کے ساتھ صف بستہ لڑتے ہیں، گویا ایک دیوار ہیں جس کے اندر سیسہ پگھلا کر بھر دیا گیا ہو!''

اس لیے اسلام نے سخت مصیبت کی حالت میں بھی عزم واستقلال کی زندہ امثال یادگار چھوڑی ہیں۔ اس نے فساد کی لڑائیوں کو روکنے کے لیے عدالت کی جتنی لڑائیاں لڑیں، ان کی یادگاروں میں اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ [۳۵]

واقعہ حبیب انصاری

ایک بار آنحضرت ﷺ نے فوج کے دس دستے روانہ کیے اور عاصمؓ بن ثابت انصاری کو ان کا امیر مقرر فرمایا۔ جب یہ لوگ مقام ہرات میں پہنچے تو قبیلہ بنولحیان کو ان کا پتہ لگ گیا اور اُنہوں نے دو سو قدر انداز ان کے پیچھے روانہ کر دیے۔ جب عاصم نے دشمن کے مسلح گروہ کو دیکھا تو پہاڑ پر چڑھ گئے۔ دشمنوں نے ہر طرف سے اُنہیں گھیر لیا اور امان دے کر پہاڑ سے اُترنے کی خواہش کی لیکن عاصم نے کہا! ''میں کسی کافر کی امان سے فائدہ اٹھانا نہیں چاہتا۔'' اس پر ان لوگوں نے تیروں کی بارش کر دی اور وہ سات آدمیوں کے ساتھ شہید ہو گئے۔

مگر فوج کے تین دستے عہد ومیثاق لے کر اُتر آئے ان میں حبیب انصاری اور ابن دشنہ بھی تھے۔ کفار نے کمانوں کی زرہ اتار لی اور اس سے ان لوگوں کو باندھ لیا۔ ان کے ساتھ ایک تیسرا شخص بھی تھا۔ اس نے کہا یہ پہلی عہد شکنی ہے جس سے مجھے قتل وخون کی بو آتی ہے، میں ان کے ساتھ نہیں جا سکتا۔ ان لوگوں نے جبراً ساتھ لے جانا چاہا مگر اس نے انکار کر دیا۔ یہاں تک کہ شہید کر دیا گیا۔ وہ حبیب اور ابن دشنہ کو ساتھ لے گئے اور مکہ میں غلام

بنا کر بیچ دیا۔ قبیلہ بنو حارث ابن عامر نے حبیب کو خرید لیا اور چونکہ یہ وہی حبیب تھے جنہوں نے غزوۂ بدر میں حارث ابن عامر کو قتل کر دیا تھا اس لیے ان لوگوں نے اس خون کا انتقام لینا چاہا اور ان کو حرم سے باہر قتل کرنے کے لیے لے گئے کہ دارالامن میں قتل ناجائز تھا۔

لیکن حبیب کے عزم و استقلال نے شہادت کے وقت ایک روحانی یادگار قائم کر دی۔ اُنہوں نے دشمنوں سے دو رکعت نماز کی اجازت چاہی کفار نے اجازت دے دی۔ اُنہوں نے نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ نماز ادا کی اور کہا کہ اگر تم اس کو جزع و فزع کے لیت و لعل پر محمول نہ کرتے اور یہ بدگمانی نہ ہوتی کہ موت کے وقت میں تاخیر ڈالنے کے لیے بہانہ کرتا ہوں تو میں نماز کو اور زیادہ طول دیتا اور بہت دیر تک اپنے خداوند کے حضور رہتا۔ اس کے بعد یہ اشعار پڑھے:

لَسْتُ اُبَالِی حِیْنَ اُقْتَلُ مُسْلِمًا
عَلٰی اَیِّ شِقٍ کَانَ لِلّٰہِ مَصْرَعِیْ

جبکہ میں مسلمان ہونے کی حالت میں قتل کیا جاتا ہوں تو مجھے کچھ پرواہ نہیں کہ خدا کی راہ میں کس پہلو پر جان دوں گا؟

وَ ذَالِکَ فِیْ ذَاتِ الْاِلٰہِ وَاِنْ یَّشَآء
یُبَارِکْ عَلَی اَوْصَالِ شَلْوٍ مُمَزَّعٍ

میرا قتل صرف خدا کی راہ میں ہے اور اگر وہ چاہے تو کاٹے ہوئے جوڑوں میں برکت دے سکتا ہے؟

کفار نے ان کو نہایت بے دردی کے ساتھ باندھ کر قتل کر دیا اور اُنہوں نے ان دو رکعتوں کو ہر اس شخص کے لئے بطور ایک زندہ سنت صبر و ثبات کے یادگار چھوڑا جو ایسے ظالمانہ طریقہ سے قتل کیا جائے!

نماز کے اوقات

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ اِنَّ

قُرْآنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْھُوْدًا (۷۸:۱۷)

''(اے پیغمبر!) نماز قائم کر، سورج کے ڈھلنے کے وقت سے لے کر رات کے اندھیرے تک (یعنی ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کے وقتوں میں) نیز صبح کی تلاوت قرآن (یعنی صبح کی نماز) بلاشبہ صبح کی تلاوتِ قرآن ایک ایسی تلاوت ہے، جو (خصوصیت کے ساتھ) دیکھی جاتی ہے۔''

اس آیت نے نماز کے اوقات معین کروائے۔فرمایا:

لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ

''سورج کے ڈھلنے سے لے کر رات کے اندھیرے تک نماز کے اوقات ہیں یعنی ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کے اوقات نیز صبح کی تلاوت ہے، یعنی صبح کی نماز۔''

اصلی سرچشمہ طاقت

سورۃ ہود میں فرمایا!

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفِیِ النَّھَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّاٰتِ، ذَٰلِکَ ذِکْرٰی لِلذَّاکِرِیْنَ (۱۱۴:۱۱)

''نماز قائم کرو، اس وقت جب دن شروع ہونے کو ہو۔ نیز اس وقت جب رات کا ابتدائی حصہ گزر رہا ہو۔ یاد رکھو! نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔ یہ نصیحت ہے اُن لوگوں کے لیے جو نصیحت پذیر ہیں۔''

نماز کو اس کی ساری حقیقتوں کے ساتھ اس کے تمام وقتوں میں ادا کرو۔ تمہاری طاقت کا اصلی سرچشمہ یہی ہے۔ یہ بڑی نیک عملی ہے اور نیک عملی برائیاں دور کر دیتی ہے۔

نماز تہجد

وَمِنَ الَّیْلِ فَتَھَجَّدْ بِہٖ نَافِلَۃً لَّکَ عَسٰٓی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (۷۹:۱۷)

''اور (اے پیغمبر!) رات کا کچھ (یعنی پچھلا پہر) شب بیداری میں بسر کر، یہ تیرے لئے ایک مزید عمل ہے۔ قریب ہے کہ اللہ تجھے ایک ایسے مقام میں پہنچا دے، جو نہایت پسندیدہ مقام ہے۔''

نفل کے معنی کسی ایسی بات کے ہیں جو اصل مطلوب سے زیادہ ہو پس فرمایا:

نَافِلَةً لَّکَ:

''یہ تیرے لئے ایک مزید عمل ہے۔''

رات کا بھی کچھ حصہ جاگنے اور عبادت میں صرف کیا کرو۔ یہ تمہارے لئے عبادت کی مزید زیادتی ہوگی۔

اس آیت میں خطاب اگرچہ پیغمبر اسلام سے ہے۔ لیکن حکم عام ہے اس سے معلوم ہو گیا کہ شب بیداری کی عبادت یعنی تہجد ایک مزید عبادت ہے اگر بن پڑے۔

مقامِ محمود

عَسٰٓی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (۱۷:۷۹)

''قریب ہے کہ اللہ تجھے ایک ایسے مقام میں پہنچا دے جو نہایت پسندیدہ مقام ہے۔''

(اس) آیت میں مقامِ محمود سے مقصود ایسا درجہ ہے جس کی عام طور پر ستائش کی جائے۔ فرمایا: تمہارا پروردگار (اس نماز پنجگانہ اور تہجد کی برکت سے) تمہیں ایسے مقام پر پہنچا دے جو عالمگیر اور دائمی ستائش کا مقام ہو۔

یہ آیت اس وقت نازل ہوئی تھی۔ جب پیغمبر اسلام کی مکی زندگی کے آخری سال گذر رہے تھے اور مظلومیت اور بے سروسامانی اپنے انتہائی درجوں تک پہنچ چکی تھی حتیٰ کہ مخالف قتل کی تدبیروں میں سرگرم تھے ایسی حالت میں کون اُمید کر سکتا تھا کہ انہی مظلومیتوں سے فتح و کامرانی پیدا ہو سکتی ہے؟

لیکن وحیٔ الٰہی نے صرف کامرانی ہی کی بشارت نہیں دی۔ کیونکہ فتح و کامرانی کی عظمت کوئی غیر معمولی عظمت نہ تھی۔ بلکہ ایک ایسے مقام تک پہنچنے کی خبر دی جو نوعِ انسانی

کے لیے عظمت وارتفاع کی سب سے آخری بلندی ہے۔ یعنی:

عَسٰۤی اَنۡ یَّبۡعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا (۱۷:۷۹)

''قریب ہے کہ اللہ تجھے ایک ایسے مقام میں پہنچادے جو نہایت پسندیدہ مقام ہے۔''

حسن وکمال کا ایک ایسا مقام جہاں پہنچ کر محمودیّت خلائق کی عالمگیر اور دائمی مرکزیّت حاصل ہوجائے گی۔ کوئی عہد ہو، کوئی نسل ہو لیکن کروڑوں دلوں میں اس کی ستائش ہوگی۔ اَن گنت زبانوں پر اس کی مدحت طرازی ہوگی۔ محمود یعنی سرتاسر ممدوح ہستی ہوجائے گی۔

مَاشِئۡتَ قُلۡ فِیۡهِ ، فَاَنۡتَ مُصَدَّقٌ

فَالۡحُبُّ یَقۡضِیۡ وَالۡمَحَاسِنُ تَشۡهَدُ!

یہ مقام انسانی عظمت کی انتہا ہے اس سے زیادہ اونچی جگہ اولادِ آدم کو نہیں مل سکتی۔ اس سے بڑھ کر انسانی رفعت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ انسان کی سعی و ہمت ہر طرح کی بلندیوں تک اُڑ سکتی ہے۔ لیکن یہ بات نہیں پا سکتی کہ روحوں کی ستائش اور دلوں کی مدّاحی کا مرکز بن جائے۔

سکندر کی ساری فتوحات خود اس کے عہد وملک کی ستائش اسے نہ دلا سکیں اور نپولین کی جہاں ستانیاں اتنا بھی نہ کرسکیں کہ کورسیکا کے چند غدار باشندوں ہی میں اسے محمود و ممدوح بنادیتیں جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔

محمودیّت اس کو حاصل ہوسکتی ہے جس میں حسن وکمال ہو کیونکہ روحیں حسن ہی سے عشق کرسکتی ہیں اور زبانیں کمال ہی کی ستائش میں کُھل سکتی ہیں لیکن حسن و ستائش کی مملکت، وہ مملکت نہیں، جسے شہنشاہوں اور فاتحوں کی تلواریں مسخر کرسکیں!

غور تو کرو، جس وقت سے نوع انسانی کی تاریخ شروع ہوئی ہے نوع انسانی کے دلوں کا احترام اور زبانوں کی ستائش کن انسانوں کے حصے میں آئی ہیں۔؟

شہنشاہوں اور فاتحوں کے حصے میں یا خدا کے ان رسولوں کے حصے میں جنہوں نے جسم وملک کو نہیں، روح ودل کو فتح کیا تھا؟

یہی مقامِ محمود ہے جس کی خبر ہمیں ایک دوسری آیت میں دی گئی ہے اور خبر کے ساتھ امر بھی ہے:

اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ط یٰٓاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (۳۳:۵۶)

''بلاشبہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے نبی ﷺ پر درود پڑھتے ہیں۔ اے پیروانِ دعوت ایمانی! تم بھی آپ ﷺ پر درود بھیجو اور خوب اچھی طرح سلام پڑھو۔''

بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام کا ایک مشہد وہ معاملہ ہوگا جو قیامت کے دن پیش آئے گا جبکہ اللہ کی حمد وثناء کا علم آپ ﷺ بلند کریں گے، اور بلاشبہ محمودیّت کا مقام دنیا وآخرت دونوں کے لیے ہے۔ جو ہستی یہاں محمودِ خلائق ہے، وہاں بھی وہی محمود وممدوح ہوگی۔

تمکنت فی الارض

اسلامی اقتدار کا مقصد

سورۂ حج میں واضح کر دیا کہ قرآن کے نزدیک مسلمانوں کے اقتدار وحکومت کا اصلی مقصد کیا تھا؟ فرمایا:

اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ (۲۲:۴۱)

''یہ (مظلوم مسلمان) وہ ہیں کہ اگر ہم نے زمین میں انہیں صاحبِ اقتدار کر دیا (یعنی ان کا حکم چلنے لگا) تو وہ نماز (کا نظم) قائم کریں گے، زکوٰۃ کی ادائیگی میں سرگرم ہوں گے۔ نیکیوں کا حکم دیں گے اور برائیاں روکیں گے۔''

قیام مملکت کی غرض

ان مسلمانوں کے اگر قدم جم گئے تو یہ کیا کریں گے؟ تمکّن فی الارض کو کن

مقاصد کے لیے کام میں لائیں گے؟ اس لیے کہ نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں، نیکی کا حکم دیں، برائیوں سے روکیں اور ظلم و بدعملی کی جگہ عدالت و نیکی کی مملکت قائم ہو جائے۔

اس کے بعد فرمایا:

وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ (۴۲:۲۲)

''اور (اے پیغمبر) اگر یہ (منکر) تجھے جھٹلائیں تو (یہ کوئی نئی بات نہیں) ان سے پہلے کتنی ہی قومیں اپنے اپنے وقتوں کے رسولوں کو جھٹلا چکی ہیں۔''

یہ انقلاب اُسی سلسلۂ انقلاب کی ایک کڑی ہے جو دنیا میں ہمیشہ برپا ہوتا رہا ہے۔ پس اگر منکرین حق اسے جھٹلائیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں۔ پہلے بھی ہمیشہ ظلم و غرور کے متوالوں نے حق و صداقت کی آوازیں جھٹلائیں ہیں۔

جماعتی اقتدار کی اصلی علامت

اس بات پر بھی غور کرو کہ یہاں اسلامی اعمال میں سے کسی عمل کا ذکر نہیں کیا۔ صرف قیامِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا ذکر کیا تو اس سے معلوم ہوا، قرآن کے نزدیک مسلمانوں کے جماعتی اقتدار کی اصلی علامت یہی دو عمل ہیں۔ جس گروہ کا اقتدار ان دو عملوں کے قیام سے خالی ہو، اس کا اقتدار اسلامی اقتدار نہیں سمجھا جائے گا۔

نماز جوہر ایمان ہے

سورہ مریم میں فرمایا: ان تمام نبیوں نے خدا پرستی اور نیک عملی کی دعوت دی تھی۔ وہ اُن میں سے تھے جن پر خدا کا انعام ہوا اور کامیابیوں کے لیے چن لئے گئے۔ لیکن ان کے بعد ایسے لوگ پیدا ہو گئے جنہوں نے یہ حقیقت ضائع کر دی اور خواہشوں کے پرستار بن گئے۔ ان کے نام لیواؤں کے جتنے گروہ ہیں، سب کا یہی حال ہے اور سب کو اپنی بدعملی کا نتیجہ بھگتنا ہے۔

فَخَلَفَ مِنْ م بَعْدِ هِمْ خَلْفٌ اَضَا عُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا (۵۹:۱۹)

''لیکن پھر ان کے بعد ایسے ان کے ناخلف جانشین ہوئے، جنہوں نے نماز کی حقیقت کھودی اور اپنی نفسانی خواہشوں کے پیچھے پڑ گئے۔ سو قریب ہے کہ ان کی سرکشی ان کے آگے آئے۔''

اس آیت میں پچھلوں کی گمراہی بیان کرتے ہوئے صرف ''اَضَا عُوا الصَّلٰوۃَ وَاتَّبَعُوا الشَّھَوَاتِ'' فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نماز یعنی عبادت جوہرِ ایمان ہے۔ اس کی حقیقت گئی تو سب کچھ چلا گیا۔

دراصل ایک خدا پرست اور ایک غیر خدا پرست میں عملی امتیاز اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ پہلا اُس کی بندگی میں لگا رہتا ہے اور اُسی کو پکارتا رہتا ہے۔ دوسرا اس سے بے پرواہ رہتا ہے۔ اسی لیے دُعا اور عبادت ایمان باللہ کی اصلی علامت ہوئی اور اِسی لیے تمام مذاہب نے اسی عمل پر مذہبی زندگی کی ساری عمارتیں اُٹھائیں۔ جونہی یہ عمل بگڑا، مذہبی زندگی کی ساری بنیادیں ہل گئیں۔

کامیابیوں کا راز

پیغمبر اسلام اور ان کے ساتھیوں سے خطاب ہے:

فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ (۱۹:۶۵)

''یعنی دو باتوں میں لگے رہو، ساری ہی کامیابیاں انہی سے ملیں گی، اس کی عبادت کرو اور اس کی راہ میں جتنی بھی مشکلات پیش آئیں، جھیلتے رہو۔''

اصلاح نفس اور انقلاب حال

صبر اور نماز دو بڑی روحانی قوتیں ہیں، جن سے اصلاحِ نفس اور انقلاب حال میں مدد لی جاسکتی ہے۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ۝ (۲:۴۵-۴۶)

''اور (دیکھو) صبر اور نماز (کی قوتوں) سے (اپنی اصلاح میں) مدد لو (نفس کی برائیاں کتنی ہی سخت کیوں نہ ہوگئی ہوں، صبر اور نماز کی روح انہیں مغلوب کرلے گی لیکن (یادرکھو) نماز ایک ایسا عمل ہے (جو انسان کی راحت طلب طبیعت پر) بہت ہی شاق گزرتا ہے۔ البتہ جن لوگوں کے دل اللہ کے حضور جھکے ہوئے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ انہیں اپنے پروردگار سے ملنا اور (بالآخر) اس کے حضور لوٹنا ہے، تو ان پر یہ عمل شاق نہیں گزرسکتا (بلکہ وہ تو اس میں سرتاسر لذت محسوس کرتے ہیں!)''

جماعتی قوت کا استقرار

نماز اور زکوٰۃ یعنی قلبی اور مالی عبادت کی سرگرمی ایک ایسی حالت ہے جس سے جماعت کی معنوی استعداد نشوونما پاتی ہے جس جماعت میں یہ سرگرمی موجود ہو، نہ تو وہ راہِ راست سے برگشتہ ہوسکتی ہے، نہ ہی اس کی جماعتی قوت میں خلل پڑسکتا ہے۔

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِکُمْ مِّنْ خَیْرٍ تَجِدُوْہُ عِنْدَاللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۝ (۲:۱۱۰)

''اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو (تاکہ تمہاری معنوی نشوونما ہو اور تم راہ ایمان میں استوار ہوجاؤ) یادرکھو، جو کچھ بھی تم اپنے لیے نیکی کا سرمایہ پہلے سے فراہم کرلوگے، اللہ کے پاس اس کے نتائج موجود پاؤ گے۔ (یعنی مستقبل میں اس کے نتائج وثمرات ظاہر ہوں گے) تم جو کچھ بھی کرتے ہو، اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔''

تقویّتِ رُوح

نماز کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے ذکر وفکر سے روح کوتقویّت ملتی ہے۔

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ (۲:۱۵۳)

''اے پیروانِ دعوت ایمانی! صبر اور نماز (کی معنوی قوتوں) سے سہارا پکڑو (یہی دو قوتیں ہیں، جن کے ذریعے تم راہ عمل کی مشکلوں اور آزمائشوں سے عہدہ برا

ہو سکتے ہو، یقین کرو اللہ، (کی نصرت) صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"
جس جماعت میں یہ دونوں قوتیں پیدا ہو جائیں گی، وہ کبھی ناکامیاب نہیں ہو سکتی۔

فتح مندی کا ظہور

سورہ طٰہٰ میں فرمایا اگر پہلے ہی سے اللہ کا یہ قانون موجود نہ ہوتا کہ انکار و بدعملی کے نتائج اپنے مقررہ وقت اور مقرر حالت کے مطابق ظہور میں آئیں، تو یہ لوگ اپنی سرکشیوں کی وجہ سے کب کے ملزم ہو چکے تھے۔ لیکن یہاں ہر گوشہ میں رحمتِ الٰہی نے ڈھیل دے رکھی ہے اور ضروری ہے کہ مقررہ وقت کا انتظار کیا جائے۔

لیکن یہ انتظار کس طرح کیا جائے؟ اس طرح کہ تم صبر و صلوٰۃ کی روح سے معمور ہو جاؤ۔
یہی وہ دو عنصر ہیں جن سے ہر طرح کی کامرانی و فتحمندی ڈھل سکتی اور ظہور میں آ سکتی ہے!

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّاَجَلٌ مُّسَمًّىo فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى (۲۰:۱۲۹۔۱۳۰)

"اور (اے پیغمبر!) اگر ایسا نہ ہوتا کہ پہلے سے تیرے پروردگار نے (اس بارے میں) ایک بات ٹھہرا دی ہوتی (یعنی ایک قانون مقرر کر دیا ہوتا) تو اسی گھڑی ان پر (جرم کا) الزام لگ جاتا۔ پس چاہیے کہ ان کی ساری باتوں پر صبر کرو اور اپنے پروردگار کی حمد و ثنا میں لگے رہو۔ صبح کو سورج نکلنے سے پہلے، شام کو سورج ڈوبنے سے پہلے رات کی گھڑیوں میں بھی اور دوپہر کے لگ بھگ بھی۔ بہت ممکن ہے کہ تُو بہت جلد (ظہور نتائج سے) خوشنود ہو جائے۔"

پھر فرمایا:

وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا (۲۰:۱۳۲)

"اور اپنے گھر والوں کو بھی نماز کا حکم دے اور اس پر مضبوطی کے ساتھ جم جاؤ۔"

سعادت کی خوشخبری

بَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ o الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَآ اَصَابَهُمْ وَالْمُقِيْمِى الصَّلٰوةِ (۲۲:۳۴-۳۵)

''اور (اے پیغمبر!) عاجزی و نیازمندی کرنے والے بندوں کو (کامرانی وسعادت کی) خوشخبری دے دو، ان نیازمندانِ حق کو جن کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے، تو ان کے دل لرز اُٹھتے ہیں، جو ہر طرح کی مصیبتوں میں صبر کرنے والے ہیں، جو نماز پڑھنے اور اُس کی درستگی میں کوشاں رہتے ہیں''

مومن کی زندگی

(سورہ مومنون کے نزول کے وقت) مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی جماعت مکہ میں پیدا ہوگئی تھی اور دعوتِ حق کے فیضان نے اس کے خصائص اسلامی آشکارا کر دیئے تھے۔ یہ گویا مریضوں کی پہلی جماعت تھی جو اس شفا خانہ سے تندرست ہو کر نکلی۔ اب طبیب ان کی طرف اشارہ کر کے کہہ سکتا تھا کہ جسے میری بابت میں شک ہو، وہ انہیں دیکھ لے۔ جو طبیب اپنے نسخۂ شفا سے ایسی تندرست روحیں پیدا کر دیتا ہے، وہ طبیب ہے یا نہیں؟

یہ جماعت اپنے خصائص ایمانی اور عمل میں دعوت کی صداقت کی ایک مشہور دلیل بن گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کی سورتوں میں جا بجا اس کے اعمال و خصائص کی طرف اشارات کیے گئے ہیں۔

قرآن مجید کے نزدیک ایمان وعمل کے مرقع میں سب سے زیادہ نمایاں (چند) خط و خال (بتلائے) ہیں، جس زندگی میں یہ خصائص نہ ہوں، وہ مومن کی زندگی نہیں سمجھی جاسکتی، ان میں سب سے اوّل نمبر نماز کی محافظت اور اس کا خشوع وخضوع کے ساتھ ادا کرنا ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ o الَّذِيْنَ هُمْ فِىْ صَلٰوتِهِمْ خٰشِعُوْنَ (۲۳:۱-۲)

''بلاشبہ ایمان لانے والے کامیاب ہوئے (کون ایمان لانے والے؟) جو اپنی نمازوں میں خشوع وخضوع رکھتے ہیں''۔

''خشوع'' کا پورا مفہوم کسی ایک لفظ میں ادا نہیں کیا جا سکتا۔ تم کسی باہیبت اور اجلال والے مقام میں کھڑے ہو جاؤ، تو تمہارے ذہن وجسم پر کیسی حالت طاری ہو جائے گی؟ ایسی ہی حالت کو عربی میں خشوع کی حالت کہتے ہیں۔

پھر فرمایا:

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلٰوتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ (۹:۲۳)

''اور (وہ مومن ایسے ہو گئے ہیں کہ) اپنی نمازوں کی نگہداشت سے غافل نہیں ہوتے۔''

مومن وحی ونبوت کی ہدایت اور علم ویقین کی روشنی اپنے سامنے رکھتا ہے۔ اس لیے فلاح وسعادت کی شاہراہ سے کبھی نہیں بھٹک سکتا۔

قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ط وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعَالَمِيْنَo وَاَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ (۶:۷۱-۷۲)

''خدا کی ہدایت تو وہی ہدایت کی حقیقی راہ ہے (جو ہمیشہ سے موجود ہے) اور ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ رب العالمین کے آگے سر اطاعت جھکا دیں (اس کے سوا کوئی نہیں جو بندگی و نیاز کا مستحق ہو) نیز ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ نماز قائم کرو۔''

سچا مومن

سچا مومن وہ ہے جس کی روح خدا پرستی سے معمور رہتی ہے، جس کا ایمان گھٹنے کی جگہ برابر بڑھتا رہتا ہے، جو نماز قائم رکھتا اور خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے کبھی نہیں تھکتا۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَo اَلَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۸:۲-۳)

''مومنوں کی شان تو یہ ہے کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل دہل جاتے

ہیں اور جب اس کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کے ایمان کو اور زیادہ کر دیتی ہیں اور وہ ہر حال میں اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور ہم نے جو کچھ دے رکھا ہے اس میں سے ایک حصہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔''

یہ آیت اس بات میں قاطع ہے کہ قرآن کے نزدیک ایمان ہر حالت میں یکساں نہیں رہتا۔ وہ گھٹتا بھی ہے۔ نفسِ تصدیق کے لحاظ سے سب برابر ہیں، کیفیت و یقین میں تفاوت ہے۔

مایہ ناز تکمیل شعارِ اسلامی

سورہ حج میں مسلمانوں سے خطاب ہے:

۱) اللہ کی بندگی و نیاز میں سرگرم رہو۔ تمہارے سارے کام خیر و فلاح پر مبنی ہوں۔ اگر حسن عمل کی یہ روح تم میں بس گئی تو پھر تمہارے لیے فلاح ہی فلاح ہے۔

يَآاَيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوْا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ o (۲۲:۷۷)

''مسلمانو! رکوع میں جھکو، سجدے کرو، اپنے پروردگار کی بندگی کرو اور جو کچھ کرو نیکی کی بات کرو، عجیب نہیں کہ اس طرح بامراد ہو جاؤ۔''

۲) جہاد فی اللہ تمہاری زندگی کا شعار ہو:

وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ط (۲۲:۷۸)

''اور اللہ کی راہ میں جان لڑا دو، اس راہ میں جان لڑا دینے کا جو حق ہے۔ پوری طرح ادا کرو۔''

''جہاد'' کے معنی کمال درجہ کوشش کرنے کے ہیں، پس مطلب یہ ہوا کہ زیادہ سے زیادہ کوشش جو ایک انسان کسی مقصد کے لیے کر سکتا ہے، وہ تمہیں اللہ کے لیے کرنی چاہیے کیونکہ تمہاری سعی کا نصب العین اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ کوشش نیّت سے بھی، مال سے بھی، ہاتھ پاؤں سے بھی،

۳) اس نے تمہیں برگزیدگی کے لیے چن لیا ہے: **هُوَاجْتَبٰكُمْ**

۴) اس نے تمہیں دین کی بہتر راہ دکھادی، اس بہتری کا معیار کیا ہے؟ یہ کہ کسی طرح کی تنگی اور رکاوٹ اس میں نہیں ہے، سب سے زیادہ سہل، سب سے زیادہ سبک، سب سے زیادہ واضح اور سب سے زیادہ فکر وعمل کی وسعت رکھنے والی، حَنِیۡفِیَۃُ السَّمۡحَۃُ، لَیۡلُھَا کَنَھَارِھَا!

وَمَا جَعَلَ عَلَیۡکُمۡ فِیۡ الدِّیۡنِ مِنۡ حَرَجٍ ؕ (۷۸:۲۲)

''تمہارے لیے دین میں کسی طرح کی تنگی نہیں رکھی۔''

انسان پر فکر وعمل کے ارتقاء کی راہ جس بات نے روک رکھی ہے، وہ یہی دین کی تنگی اور رکاوٹ ہے۔ اس تنگی نے اس طرح انہیں جکڑ بند کر رکھا ہے کہ ایک قدم بھی وسعت و بلندی کی طرف نہیں اٹھا سکے۔ اللہ نے اس جکڑ بندی سے تمہیں نجات دے دی اور یہ اس کا بڑے سے بڑا احسان ہے جو کسی انسانی گروہ پر ہو سکتا ہے۔

۵) یہ تنگیاں جس قدر ہیں، بعد کو پیدا کر لی گئیں۔ اصل دین میں نہ تھیں جو تمہارے بزرگ ابراہیم کا دین تھا۔ اسی دین خالص کی راہ تم پر کھول دی گئی۔

مِلَّۃَ اَبِیۡکُمۡ اِبۡرٰھِیۡمَ ؕ (۷۸:۲۲)

''وہی طریقہ تمہارا ہوا جو تمہارے باپ ابراہیم کا تھا۔''

۶) اس نے تمہارا نام ''مسلم'' رکھا کیونکہ دین خالص اوّل دن سے ''اسلام'' ہی ہے یعنی قوانینِ حق کی اطاعت کا یہی نام پہلے تھا یہی اب ہوا۔

ھُوَ سَمّٰکُمُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ مِنۡ قَبۡلُ وَفِیۡ ھٰذَا (۷۸:۲۲)

''اس نے تمہارا نام مسلم رکھا تھا پچھلے وقتوں میں بھی اور اس قرآن میں بھی۔''

۷) تمہیں اس لیے چنا گیا کہ اللہ کا رسول تمہارے لیے شاہد ہو اور تم تمام انسانوں کے لیے۔ تم اپنا چراغ اس سے روشن کرو گے اور تمہارے چراغ سے تمام دنیا کے چراغ روشن ہو سکیں گے:

یک چراغ ست دریں خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجامی نگری، انجمنے ساختہ اند!

لِیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِیْدًا عَلَیْکُمْ وَتَکُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاس
(۲۲:۷۸)

''اور یہ اس لیے کیا تا کہ رسول تمہارے لیے (حق کا) گواہ ہو (یعنی معلم ہو) اور تم تمام انسانوں کے لیے''

۸) یہ فرض کیونکر انجام پا سکتا ہے؟ اس طرح کہ نماز قائم کرو، زکوٰۃ کا نظام استوار کرو اور اللہ کا سہارا مضبوط پکڑلو:

فَاَقِیْمُوْا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوْا الزَّکٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ (۲۲:۷۸)

هُوَ مَوْلٰکُمْ ج فَنِعْمَ الْمَوْلٰی وَ نِعْمَ النَّصِیْرُ (۲۲:۷۸)

''پس نماز کا نظام قائم کرو، زکوٰۃ کی ادائیگی کا سامان کرو۔ اللہ کا سہارا مضبوط پکڑلو وہی تمہارا کارساز ہے اور جس کا کارساز اللہ ہو تو وہ کیا ہی اچھا کارساز ہے اور کیا ہی اچھا مددگار!''

یہاں سے دو باتیں قطعی معلوم ہوگئیں۔

۱) ایک یہ کہ دین کی سچائی کی سب سے بڑی کسوٹی یہ ہے کہ اس میں تنگی و رکاوٹ نہ ہو۔

۲) دوسری یہ بات کہ مسلمانوں کے لیے دینی نام صرف مسلمان ہی ہے اس کے سوا جو نام بھی اختیار کیا جائے گا، وہ اللہ کے ٹھہرائے ہوئے نام کی نفی ہوگا۔

پس مسلمانوں کے مختلف فرقوں، مذہبوں اور طریقوں نے جو طرح طرح کے خودساختہ نام گھڑ لیے ہیں اور اب انہی سے اپنی پہچان بنانا چاہتے ہیں، وہ صریحاً ''سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ'' سے انحراف ہے۔

فیصلہ نزاع تارک الصلوٰۃ

(سورہ توبہ میں (یہ بات قطعی طور پر واضح ہوگئی کہ جس بات کے بعد ایک جماعت مسلمانوں کی جماعت تسلیم کی جاسکتی ہے، وہ یہ ہے کہ زبان سے اسلام کا اقرار کرے اور عمل میں دو باتیں ضرور آجائیں یعنی نماز کی جماعت کا قیام اور زکوٰۃ کی ادائیگی:

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوْا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَخَلُّوْا سَبِیْلَھُمْ (۵:۹)

''پھر اگر ایسا ہو کہ وہ باز آ جائیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان سے کسی طرح تعرّض نہ کیا جائے۔''

اگر یہ دو عملی باتیں ایک جماعت میں مفقود ہیں تو اس کا شمار مسلمانوں میں نہ ہوگا۔

اس اعتبار سے ایک فرد کی حالت میں اور ایک جماعت کی حالت میں جو فرق ہے، اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اگر ایک فرد قیامِ صلوٰۃ اور ادائے زکوٰۃ میں کوتاہی کرتا ہے تو گنہگار ہے لیکن ایک جماعت نے بہ حیثیت جماعت کے ترک کر دیا تو اسلامی زندگی کی بنیادی شناخت کھودی اور وہ مسلمان نہیں۔

ان چند لفظوں میں تمھیں اس تمام نزاع کا فیصلہ مل سکتا ہے جو تارک الصلوٰۃ کے باب میں چلی آتی ہے، بشرطیکہ غور وفکر سے کام لو۔

منافق کی نماز

منافقوں کے اعمال و خصائص (میں بتلایا ہے کہ جب) وہ نماز کے لیے کھڑے ہوں گے تو کاہلی کے ساتھ، گویا مارے باندھے کھڑے ہو گئے ہیں۔ دکھاوے کے لیے تھوڑی بہت قرأت جلد جلد کر لیں گے اور نماز پٹک کر الگ ہو جائیں گے۔ خشوع وخضوع اور دل کا لگاؤ، ان کی نماز میں نہ ہوگا۔

وَاِذَا قَامُوْا اِلَی الصَّلٰوۃِ قَامُوْا کُسَالٰی یُرَآءُ وْنَ النَّاسَ وَلَا یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ اِلَّا قَلِیْلًا مُّذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِکَ لَآ اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ (۴:۱۴۲-۱۴۳)

''اور جب یہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو کاہلی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں (جیسے کوئی مارے باندھے کھڑا ہو جائے) محض لوگوں کو دکھانے کے لیے، نماز پڑھتے ہیں اور اللہ کا ذکر نہیں کرتے مگر برائے نام۔ کفر اور ایمان کے درمیان متردّد کھڑے ہیں کہ اِدھر ہیں نا اُدھر، اِن کی طرف ہیں نا اُن کی طرف، (یعنی نہ تو مسلمانوں کی طرف ہیں، نہ

مسلمانوں کے دشمنوں کی طرف)''

اخوتِ دین کا قیام نماز سے

فَاِنْ تَابُوا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِى الدِّيْنِ ط (۹:۱۱)

''بہرحال اگر یہ (لوگ اپنی مشرکانہ روش سے) باز آ جائیں، نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں تو (پھر ان کے خلاف تمہارا ہاتھ نہیں اُٹھنا چاہیے) وہ تو اب تمہارے دینی بھائی ہو گئے۔''

تیسّراتِ صلوٰۃ

طہارت

عبادت اسلامیہ کی آسانیوں میں، تیمّم خدا کی دی ہوئی یادگار آسانی ہے، اس کے برکات کا ظہور زیادہ تر سفر میں ہی ہوتا ہے۔

آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم) کا سفر اکثر جہاد ہی کے لیے ہوا کرتا تھا اس لیے سفر ہی میں مسلمانوں کو یہ عطیہ الٰہی بھی دیا گیا۔ چنانچہ ایک سفر میں حضرت عائشہ ؓ آپ ﷺ کے ساتھ تھیں۔ سوءِ اتفاق سے راستے میں ان کا ہار گم ہو گیا آنحضرت ﷺ تمام صحابہ کے ساتھ اس کے ڈھونڈھنے کے لے ٹھہر گئے۔ لیکن منزل پر دور تک پانی کا نام ونشان نہ تھا۔ صحابہ نے حضرت صدیق ؓ سے اس کی شکایت کی۔ اُنہوں نے حضرت عائشہ ؓ پر ناراضی ظاہر کی کہ تمہاری ہی غفلت نے تمام قوم کو اس مصیبت میں مبتلا کر رکھا ہے، چنانچہ اسی موقعہ پر آیتِ تیمّم نازل ہوئی اور تمام صحابہ مسرت کے لہجے میں پکار اُٹھے:

مَاهِىَ بِاَوَّلِ بَرَكَتِكُمْ يَا اٰلَ اَبِىْ بَكْرٍ (بخاری)

''اے آلِ ابی بکر! یہ کچھ تمہاری پہلی ہی برکت نہیں ہے!''

نمازِ قصر، افطارِ صوم کی وجہ

حالت سفر میں قصر اور رمضان میں افطار صوم کی اجازت بھی جہاد ہی کی راہ میں آسانیاں پیدا کرنے کے لیے دی گئی۔ قرآن کریم کی آیات قصر میں صاف طور پر جہاد کے موقع کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں کہ حکم قصر دراصل جہاد کے لیے ہوا تھا۔ (بخاری)

وضو کا حکم نعمتِ خداوندی

فرمایا، خدا نہیں چاہتا کہ تمھیں کسی طرح کی مشقت اور تنگی میں ڈالے، یعنی وضو کا حکم اس لیے نہیں ہے کہ تمہارے پیچھے بے جا قیدیں لگا دی جائیں۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ تم میں صفائی اور پاکیزگی پیدا ہو اور تمہیں طہارت اور شائستگی رکھنے والی جماعت بنا کر تم پر اپنی نعمتِ ہدایت پوری کر دے۔

يَآ اَيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُ وْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ط وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ط وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰى اَوْعَلٰے سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِنْهُ ط مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۶:۵)

’’مسلمانو! جب تم نماز کے لیے آمادہ ہو تو چاہیے کہ اپنا منہ اور ہاتھ کہنیوں تک دھو لیا کرو اور سر کا مسح کر لو، نیز اپنے دونوں پاؤں ٹخنوں تک دھو لو۔ اگر نہانے کی حاجت ہو تو چاہیے کہ (نہا کر) پاک صاف ہو جاؤ۔ اور اگر تم بیمار ہو (اور پانی کا استعمال مضر ہے) یا سفر میں ہو (اور پانی کی جستجو دشوار ہو) یا ایسا ہو کہ تم میں سے

کوئی جائے ضرور سے (ہوکر) آیا ہو، یا تم عورت کے پاس رہے ہو اور پانی میسر نہ آئے تو اس حالت میں چاہیے کہ (وضو کی جگہ) پاک مٹی سے کام لو اور (طریقہ اس کا یہ ہے کہ (اپنے منہ اور ہاتھوں پر اس سے مسح کرلو۔ اللہ نہیں چاہتا کہ تمہیں کسی طرح مشقت اور تنگی میں ڈالے، بلکہ چاہتا ہے (اس طرح کے اعمال کے ذریعہ) تمہیں پاک وصاف رکھے۔ نیز یہ کہ (تمہیں ایک شائستہ ترین جماعت بنا کر) تم پر اپنی نعمت (ہدایت) پوری کردے تا کہ تم شکرگزار رہو (یعنی اللہ کے قدر شناس ہو)۔''

دوسری جگہ آتا ہے:

وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْعَلٰى سَفَرٍ اَوْجَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ط اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا (۴:۴۳)

''اور اگر تم بیمار ہو، یا سفر میں، یا تم میں سے کوئی آدمی جائے ضرور سے فارغ ہوکر آئے، یا ایسا ہو کہ تم عورت کے پاس رہے ہو اور (وضو اور غسل کے لیے پانی میسر نہ آئے، تو اس صورت میں چاہیے کہ پاک زمین سے کام لو (طریقہ اس کا یہ ہے کہ زمین پر ہاتھ مار کر (چہرے اور ہاتھوں کا مسح کرلو۔ بلاشبہ اللہ درگزر کرنیوالا اور بخش دینے والا ہے۔''

یعنی اگر پانی میسر نہ آئے، یا بیماری مانع ہو، تو وضو اور غسل کی جگہ تیمّم کرلو، لیکن کسی حال میں نماز ترک نہ کرو۔

مدارج فرضیت نظام عبادات اسلامیہ

اسرار تقدیم وتاخیر

اسلام ایک دین قیم ہے۔ ترتیب ونظام اسکی حقیقت میں داخل ہے۔ پس ضرور ہے کہ عبادت کی فرضیت کی تقدیم وتاخیر میں بھی اسرار وعلل پوشیدہ ہوں اور تدبر وتفکر سے کام لیا

جائے تو فی الحقیقت نماز کی تقدیم اور روزے کی تاخیر میں ایک دقیق اور اہم نکتہ پوشیدہ ہے۔

مجبورانہ تقویٰ

اگر ہمارے پاس غذائے لطیف نہیں، آب خوشگوار نہیں، زوجۂ جمیلہ نہیں، غرض وہ تمام چیزیں نہیں جن کے استعمال سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے تو ایسی حالت میں ان تمام چیزوں سے منہ موڑ لینا کوئی حقیقی تقویٰ نہ ہوگا بلکہ ایک مجبوری کی شکل ہوگی۔ کیونکہ اگر یہ روزہ نہ رکھیں، جب بھی دن بھر فاقہ ہی سے گزرہوتی ہے۔ پس اگر مکہ میں روزہ فرض کردیا جاتا تو وہ ایک قسم کا مجبورانہ تقویٰ ہوتا۔

قوتِ ایمانی اور ضبطِ نفس کی دلیل

لیکن مدینہ کی حالت اس سے مختلف تھی۔ وہاں زمین اپنے خزانے ابل رہی تھی۔ خوبصورت کنیزیں ہر طرف سے آ آ کر جمع ہو رہی تھیں۔

فتوحات کے آغاز نے طرح طرح کی نعمتوں کے انبار لگا دیئے تھے اور آزادی کے احساس نے ان جذبات کو اور بھی مشتعل کر دیا تھا۔ ایسی حالت میں اگر کوئی شخص ان لذائذ طیبہ سے احتراز کرتا تو یہ بے شبہ اس کی قوتِ ایمانی اور ضبطِ نفس کی دلیل ہوتی۔

صبر و توکل کی آزمائش گاہ

اسلام درحقیقت صبر و توکل کی ایک آزمائش اور زہد و تقویٰ کی امتحان گاہ ہے۔ اس لیے صبر و قناعت کے لیے اس نے مسلمانوں کے زہد و تقویٰ کو زور کے ساتھ آزمایا اور ایسے وقت میں آزمایا جبکہ لغزش اور ٹھوکر کے اسباب فراہم ہونا شروع ہو گئے۔

سب سے پہلے نماز فرض ہوئی

تقدیم زمانی کے لحاظ سے تمام فرائض میں سب سے پہلے نماز فرض ہوئی۔ ابتداء میں اگرچہ یہ نہایت سادہ و مختصر عبادت تھی۔ تاہم تکبیر و تہلیل اور قرأت سے اس کا پیکرِ روحانی

خالی نہ تھا۔ جب کفر اور مکہ کی فضاء میں قرآن مجید کی نامانوس مگر مقدس آیتیں گونجتی تھیں تو کفار اس مختصر عبادت میں بھی رکاوٹ پیدا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ کو کفار نے نماز میں قرأت سے صرف اس بناء پر روک دیا تھا کہ اس کا اثر ان کے بال بچوں پر شدت کے ساتھ پڑتا تھا اور انہیں خوف تھا کہ کہیں وہ مسلمان نہ ہو جائیں۔

روزہ نماز کے بعد فرض ہوا

لیکن تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز تو پہلے ہی روز فرض کر دی گئی مگر روزہ سنہ ۲ھ میں فرض ہوا۔ جبکہ مال غنیمت سے مدینہ کا دامن بھر گیا تھا اور تکبیر و تہلیل کی صداؤں کو ایک فضائے غیر محدود مل گئی تھی۔

مناسبتِ صلوٰۃ وصیام

نماز ایک محتسب ہے، جو ہم کو ہر برائی سے بچاتی ہے:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡکَرِ (۴۵:۲۹)

''حقیقت میں نماز تمام بداخلاقیوں، اور برائیوں سے روکتی ہے۔''

لیکن محض احتساب سے تقویٰ حاصل نہیں ہوسکتا۔ طبیب ہم کو پرہیز بتاتا ہے اور ہم اس کی ہدایت پر عمل نہیں کرتے تو اس کے پرہیز کا اصل مقصد یعنی صحت حاصل نہیں ہوتی۔

نماز کے احتساب کا نتیجہ

نماز ہم کو تقویٰ کی راہ دکھاتی ہے۔ لیکن روزہ ایک ایسی عبادت ہے جو ہم کو نماز کے احتساب کا نتیجہ عملی صورت میں دکھا دیتی ہے۔ نماز ہم کو تقویٰ سکھاتی تھی اور ہم نے روزے میں تمام منہیات سے احتراز کر کے تقویٰ حاصل کر لیا۔ پس نماز کا اصلی نتیجہ روزہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نماز کے بعد فرض کیا گیا کیونکہ نتیجہ کبھی اصل علت سے منفک نہیں ہوسکتا۔

زکوٰۃ کا درجہ تیسرا ہے

روزہ اگرچہ نماز کا عملی نتیجہ ہے، لیکن وہ خود زکوٰۃ کی علت بن جاتا ہے۔ انسان جب روزہ رکھتا ہے تو خود بھوکا پیاسا رہ کر غُرباء اور مسکینوں کی بھوک پیاس کا اچھی طرح اندازکر لیتا ہے۔ پس اسے فقراء و مساکین یاد آ جاتے ہیں، جو بارہ مہینے اس تکلیف میں مجبوراً مبتلا رہتے ہیں۔ جس تکلیف کو روزہ دار نے اپنی خوشی سے ایک ماہ کے لیے اختیار کیا، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس کے دل میں ان کی اعانت کا حقیقی جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اور جب کبھی کسی بھوکے پیاسے کو دیکھتا ہے تو ٹھیک ٹھیک سمجھ لیتا ہے کہ اس پر کیسی مصیبت طاری ہے۔

اس لحاظ سے .... زکوٰۃ عبادت کا تیسرا درجہ .... ارتقائی نہیں، بلکہ عقلی ہے کیونکہ وہ روزہ کا نتیجہ ہے۔ عبادات کے سلسلہ میں روزہ کا چونکہ دوسرا درجہ تھا، اس لیے اس کے نتیجہ کا تیسرا اثر زکوٰۃ قرار پایا۔

حج، عبادات سہ گانہ کا جامع مرقع

حج ان تمام عبادات کی جامع ہے۔ اس کے علاوہ اسلام کا آخری فرض ہے۔ نماز بھی اس کا جزو ہے جو خطبہ و جماعت کے ساتھ ادا کی جاتی ہے۔ وہ روزہ اور زکوٰۃ کا بھی ذریعہ بن سکتا ہے...... پس وہ اسلام کی عبادات سہ گانہ کا ایک جامع مرقع ہے، جو دنیا کو علی الاعلان دکھلایا جاتا ہے۔

استفتاء نماز باجماعت

شارع کی آسانی

نمازِ پنجگانہ جماعت کے ساتھ پڑھنا نہایت ضروری ہے۔ اس کی نسبت متعدد احادیث منقول ہیں۔ بڑی تاکید اس امر کی ہے کہ جماعت ترک نہ کی جائے۔ اہمیت اور ضرورت اس کی اہل بصیرت سے پوشیدہ نہیں۔ بسبب تائید کے علماء دین اس خیال سے

کہ مسلمان ثواب سے محروم نہ رہیں، جماعت کے مسائل میں آسانی اور سہولت پیدا کر دی یعنی دس بیس مسلمان موجود ہیں اور وہ کام میں مصروف ہیں، صرف تین آدمی کے جمع ہونے سے جماعت ہوگئی اور پھر دو شخص بھی شامل ہو کر نماز پڑھ لیں تو جماعت کا ثواب مل گیا۔ حضرت شارع علیہ السلام نے جس قدر اہمیت اور ضرورت اس کی پیش نظر رکھی تھی، وہ ان مبارک تاکیدات سے ظاہر ہے جو احادیث میں موجود ہیں۔

شخصی رائے

اگر مجھے رائے دینے کا موقع ہوتا تو میں ضرور یہ کہتا کہ جس مقام پر پندرہ بیس مسلمان ہوں اور وہ کسی دوسرے کام میں مصروف ہوں، اذان کے ساتھ ہی نہ آئیں اور اپنے کاروبار میں لگے رہیں تو ایسے موقع پر تین شخصوں سے جماعت نہیں ہوتی بلکہ سب کو جمع ہو کر نماز ادا کرنی چاہیے۔ لیکن جو لوگ پہلے سے تیار ہوں، اس مبارک اور مفید سنت کے ادا کرنے کی غرض سے دوسروں کے آنے کا قدرے انتظار کر لیں۔ اس زمانہ میں تو فی صد پانچ آدمی بھی نماز ادا نہیں کرتے ہیں، جماعت کجا۔

ہر مسلمان کے لیے یہ لازمی گردانا جائے کہ جس قدر آدمی اس کے مکان میں ہوں، ان کے ساتھ نماز با جماعت ادا کرے اور اس قدر سختی سے پابندی ہونی چاہیے کہ بلا عذر شرعی کوئی نہ چھوٹے۔

پابندی جماعت اور میرِ محلّہ

جس طرح ہر شخص کو اپنے مکان کی حد تک جماعت کی پابندی لازم ہوگی، اسی طرح اگر شہر ہے تو اہل محلّہ کے لیے بھی پانچوں وقت محلّہ کی مسجد میں جمع ہو کر نماز ادا کرنے کی پابندی ہونی چاہیے۔ اگر کاروبارِ دنیوی کا لحاظ کیا جائے تو محلے کی مسجد کے متعلق چند نمازوں کی رعایت دی جائے مگر جہاں لوگ اپنا کام کرتے ہوں، جہاں پہ وہ نوکر ہوں، وہاں جس قدر لوگ ہوں، ان سب کو جماعت کی پابندی کرنی چاہیے۔

نماز کمیٹیوں کا تقرر

ان اُمور کی پابندی و نگرانی کے لیے اگر شہر ہو تو دو شخص میرِ محلّہ مقرر ہوں، اگر کوئی کارخانہ یا مل ہے تو دو چار شخص لیڈر مقرر ہوں اور وہ نماز باجماعت کی پابندی کرائیں۔ اسی طرح اب اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ بجائے اس کے کہ ہر محلّہ کی مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کی جائے اور محلّہ کے مسلمان جمع ہوں اگر قصبہ ہے، آبادی کم ہے تو ایک ہی مسجد جامع میں جمعہ ادا کریں۔ شہر ہے، آبادی زیادہ ہے تو چار یا تین مساجد جمعہ کی نماز کے لیے منتخب کی جائیں۔ انتخاب کے لیے ہر محلّہ کے میرِ محلّہ اور شہر یا قصبہ کے قاضی و خطیب کی کمیٹی بنائی جائے اور ان کی رائے سے بلحاظِ آبادی وضرورت و فاصلہ مساجد منتخب کی جائیں اور اس کی پابندی میں سرِ مُو فرق نہ ہو۔

طریقہ سلف کا لحاظ

سلف کے مسلمانوں میں انہیں جماعتوں کے اندر جملہ اُمورِ سنگین طے ہوا کرتے تھے۔ ہر مسلمان کو رائے دینے کا موقع ملتا تھا۔ مسلمانوں میں جو لوگ نماز نہیں پڑھتے ہیں، وہ بلائے جائیں لیکن ان پر سختی نہ کی جائے بلکہ نہایت نرمی سے بتلایا جائے کہ نماز پڑھیں اور جماعت کے ساتھ پڑھیں۔ یقین ہے کہ جس قدر مسلمان ہوں گے، سب شریک ہو جائیں گے۔ اس کی فضیلت اور اہمیت صاحبانِ تفکر سے پوشیدہ نہیں۔

فرائض محلّہ اور صدر کمیٹی

میں نے اس کی بنا ڈال دی ہے، ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس میں جس قدر کامیابی ہو اس کی فہرست مرتب کر رکھے۔ فہرست میں ہر مسلم کے دستخط لے رکھیں۔ میرِ محلّہ اپنا فرض ادا کریں اور صدر کمیٹی کے لوگ اپنا فرض ادا کریں۔ اس طریقہ سے ہر مقام کے لیے ایک معقول جماعت مرتب ہو جائے گی۔ ضرورت کے وقت بھی لوگ آپس میں ایک دوسرے کے دست و بازو بن جائیں گے اور اس طورح وہ جو کام کریں گے نہایت عمدگی

سے انجام دیں گے اور نماز نہایت شاندار طریقہ سے ادا ہوا کرے گی....... (م-ع)

جواب فتویٰ اور تائید مولانا

"جَزَا کُمُ اللّٰہُ . زَادَنَا اللّٰہُ وَاِیَّاکُمْ حَمِیَّۃُ الْاِسْلَامَ" مسئلہ نماز، پابندیٔ جماعت و شرکت اوقاتِ خمسہ مساجد، ایک اہم ترین اور مقدم ترین مسائل وقت میں سے ہے اور اس کا عملی طریق پر انتظام، اقدام والتزام اسلامی حکومت اور مسلمانوں کی اوّلین ذمہ داری ہے۔

مسلمانوں کا قدرتی انجمن سے تغافل

فرضیّتِ صلوٰۃ خمسہ کے ساتھ التزامِ جماعت بھی فی الحقیقت فرض، واز جملہ اسرار و مصالح فرضیّت صلوٰۃ ہے۔ یہ ہماری سب سے بڑی بدبختی ہے کہ باہمی اتحاد وتعاون کے لیے نئی نئی انجمنیں بناتے ہیں مگر اپنی قدرتی انجمنوں کو بھول گئے ہیں۔ آج مسلمانوں کے لیے کسی کام میں تاسیس و ایجاد کی ضرورت نہیں ہے بلکہ صرف تجدید و احیاء امور و احکام کی۔ ہمارے لیے کچھ ضرورت نہیں ہے کہ نئے گھروں کی تعمیر کے لیے مضطرب الحال ہوں بلکہ ضرورت صرف اس کی ہے کہ اپنے اجڑے ہوئے گھروں کو آباد کریں۔ یہی اصولی اختلاف ہے جو اس عاجز کے اُصولِ عمل اور ابنائے مصر کے طریقِ کار میں ہے اور غور کیجیے تو یہ ایک بہت بڑا نکتہ تھا جس کو میں نے سرسری طور پر عرض کر دیا.....

خطباتِ جمعہ وعیدین

رشد وہدایت کا دائمی ذریعہ

جمعہ کا اجتماع اور حکمِ خطبہ مسلمانوں کی فلاحِ دارین کا وسیلہ عظمٰی تھا۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ ہفتے میں ایک بار لوگوں کو ان کی حالت اور ضرورت کے مطابق ہدایت و ارشاد کی دعوت دی جائے اور یہ کام امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا ایک دائمی ذریعہ ہو۔

خلفاء سلاطین سلف کا معمول

خطبہ دراصل ایک وعظ تھا جیسا کہ وعظ ہوتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کے بعد خلفائے راشدین اور صحابہ کا بھی یہی حال رہا اور تمام عربی حکومتیں جو اس کے بعد قائم ہوئیں، ان میں بھی خلفاء سلاطین کو مساجد کے منبروں پر وعظ کرتے ہوئے تاریخ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ حقیقتِ خطبہ کے لیے کتبِ صحاح کے ابواب متعلق جمعہ کی احادیث دیکھنی چاہئیں۔

اعمال اسلامی کی حقیقت سلبی

لیکن ہماری اصلی مصیبت ہمارے حالات نہیں بلکہ نتائج ہیں جن کا اصلی منبع ہمارے اعمال کی تحریف و نسخ میں ہے کہ وہی حقیقی علل و اسباب ہیں۔ شخصی حکومتوں کے قیام، عجمی سلاطین کی کثرت، سنت خلفاء راشدین کے ضیاع اور جہل و غفلت کے استیلاء نے ہر اسلامی عمل کو ایک لباس ظاہر دے کر اس کی روحِ حقیقت سلب کر لی ہے، خطبۂ جمعہ اور عیدین و نکاح کا بھی یہی حال ہے۔

سب سے بڑا قاری کون؟

اب خطبے کے معنی یہ رہ گئے ہیں کہ عربی زبان میں ایک چھپی ہوئی کتاب، جو بازار سے خرید لی جائے اور "اَلْفُ لَیْلَۃٌ" کی طرح اس میں سے ایک خطبہ غلط سلط پڑھ کر سنا دیا جائے، آواز بشدت کریہہ ہو اور لب و لہجہ میں عربیّت پیدا کرنے کے لیے ہر جگہ تفخیم و ثقالت سے کام لیا جائے بعض لوگ قرآن شریف کی حاصل کردہ قرأت کو اس میں بھی صرف کرتے ہیں۔ پھر جو شخص ہر لفظ کے آخری حروف کو پوری سانس میں کھینچ کر پڑھ دے وہ سب سے بڑا قاری ہے۔!

خطیب و سامعین کی حقیقت ناشناسی

بسا اوقات غریب پڑھنے والا یہ بھی نہیں جانتا کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں؟ "اَلْفُ لَیْلَۃٌ"

کا افسانہ ہے۔ فلیوبی کی کوئی حکایت ہے، یا ارشاد و ہدایتِ امت کا وہ عظیم و جلیل عملِ اقدس جو رسول ﷺ کے منبر پر کھڑے ہو کر مجھ کو انجام دینا پڑتا ہے؟ پھر سننے والوں کی مصیبت کا کیا پوچھنا؟ کوئی اونگھتا ہے کوئی اپنے ساتھیوں سے صبح کے بازار کا بھاؤ پوچھتا ہے!

تحقیر و تذلیل اعمال دین

یہ تمسخر انگیز تذلیل و تحقیر ہے، اس مذہب عظیم کے اعمال دینیہ کی جس کے داعیٔ اوّل نے اپنے خطبات و مواعظ سے ایک بادیہ نشین قوم کو روم و ایران کے تمدّن کا مالک بنا دیا تھا!

فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۹:۷۰)

''اور ہرگز ایسا نہیں ہوسکتا تھا کہ اللہ ان پر ظلم کرتا مگر وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کرتے تھے۔''

علماء صوفیا کا ماتم

یقین کرو کہ جب حضرت مسیح علیہ السلام نے بنی اسرائیل کی ذلت و ہلاکت پر ماتم کیا تو شریعتِ موسوی کے احکام و اعمال کا بعینہ یہی حال تھا، جو آج تم نے خدا کی شریعت کا بنا رکھا ہے۔ مسیح علیہ السلام اگر ان قدوسیوں اور صدوقیوں پر روتے تھے جو اگرچہ بڑی بڑی آستینوں کے جبے پہنتے، ہر وقت دُعائیں مانگتے اور بڑی بڑی مہیب تسبیحیں اپنے ہاتھوں میں رکھتے تھے، مگر شریعت کے حکموں کو انہوں نے مسخ اور اعمالِ صالح کو بے اثر کر دیا تھا تو ہمیں بھی اپنے عالموں اور صوفیوں پر ماتم کرنا چاہیے جو ان کی طرح یہ سب کچھ کرتے ہیں لیکن انہی کی طرح حقیقت سے بھی خالی ہیں۔!

معیارِ خطبہ بنزدیک مولانا

میں سرے سے ہی اس امر کا عدو و دشمن ہوں کہ خطبے لکھے ہوئے پڑھے جائیں۔ یہ ایک بدعت ہے جس کا نہ تو قرونِ مشہود بالخیر میں ثبوت ملتا ہے اور نہ علتِ حکم اس کی موئد۔ خطبہ ایک وعظ ہے۔ پس مسجدوں میں ایسے خطیب ہونے چاہئیں جن کو یہ قابلیت حاصل ہو کہ جمعہ کے خطبے کے لیے تیار ہو کر آئیں اور زبانی مثل مواعظ کے وعظ کہیں۔ ضروری

ہے کہ قوم کی موجودہ حالت ان کے پیش نظر ہو۔ جو بیماریاں آج ہمیں لاحق ہیں، انہی کا علاج بتلائیں نہ کہ ان کا جواب جو آج سے پانچ سو برس پہلے تھیں۔

ناموزونیت اور تغلیط

جو خطباتِ عربیہ آج کل رائج ہیں، میں نے ان سب کو پڑھا ہے۔ وہ تو اس وقت کے لیے بھی موزوں نہ تھے جس وقت کے لیے لکھے گئے تھے۔ پھر آج کل کی حالت کا کیا ذکر؟

خطبہ کا یہ مطلب کس نے بتلایا ہے کہ صرف جمعہ وعیدین کے چند مسائل بیان کر دیئے جائیں اور کہہ دیا جائے کہ ایک دن مرنا ہے، پس ڈرو اور موت کو یاد کرو؟ بے شک موت کو یاد کرنے سے بڑھ کر انسان کے لیے کوئی نصیحت نہیں ہوسکتی۔

كَفَاكَ بِالْمَوْتِ وَاعِظًا يَا عُمَرُ!

لیکن صرف یہ کہہ دینا، لوگوں کو ڈرانے کے لیے کافی نہیں ہے۔ موت کی یاد کے ساتھ ان کو اس زندگی کا طریقہ بھی بتلانا چاہیے، جو تذکرۂ آخرت کے ساتھ مل کر انسانوں کو دونوں جہانوں میں نجات دلاسکتی ہے۔

بڑا مسئلہ زبان کا ہے اور ضروری ہے کہ ایک مختصر سے خطبۂ ماثورۂ عربیہ کے بعد وعظ اسی زبان میں ہو، جو سامعین کی زبان ہے، ورنہ سمجھ میں نہیں آتا بلکہ اس سے حاصل کیا۔؟

شرعی حیثیت خطبہ

شریعت نے کیسی عمدہ مصلحت اس میں رکھی ہے کہ جمعہ کے خطبے کو نماز فرض کا قائم مقام قرار دیا اور اس کی سماعت کو فرض بتلایا۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک دونوں خطبوں کا سماع واجب ہے اور امام شافعیؒ کے نزدیک صرف پہلے کا۔ اس وقت نماز پڑھنا بھی جائز نہیں۔

ماتم عقل وفکر

اس سے مقصود یہی تھا کہ لوگ عملِ عبادت کی طرح نصائح وہدایت کو بھی سنیں۔ پھر ان نصائح کو ایسا اہم ہونا چاہیے کہ مصروفیت نماز سے بھی اقدم وانفع ہوں۔ کیا یہ خطبات جو آج

کل دیے جاتے ہیں یا اٹک اٹک کر پڑھے جاتے ہیں اور لوگ بیٹھے ہوئے اونگھتے رہتے ہیں، یہی وہ مواعظ ہیں، جن کی سماعت فرض اور ان کی موجودگی میں نماز تک ممنوع ہے؟

فَاَیْنَ تَذْهَبُوْنَ؟ (۲۶:۸۱)

''پس تم لوگ کہاں بہکے جاتے ہو۔''

عقل و شریعت کے لیے ماتم ہے کہ موجود علماء خود اس طریق کے عامل اور اس پر پوری طرح قانع ہیں!

فَمَالِ هٰؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا یَکَادُوْنَ یَفْقَهُوْنَ حَدِیْثًا (۴:۷۸)

''پھر (افسوس اُن لوگوں کی حالت پر) ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی بات ہو، یہ سمجھ بوجھ کے قریب بھی نہیں پھٹکتے!''

امامت مساجد اور ذریعہ معاش

بڑی مصیبت یہ ہے کہ مساجد کی امامت عموماً جہلا کے ہاتھوں میں ہے اور یہ کام ایک ذریعہ معاش بن گیا ہے۔ وہ بیچارے کہاں سے ایسی قابلیت لائیں کہ برجستہ خطبہ دیں اور اس کی تمام شرائط کو پورا کریں۔

اصلاح حال مسلمانان

خطبہ کے معنی تو یہ ہیں کہ نہ صرف عام حالت کی اس میں رعایت کی جائے بلکہ گذشتہ جمعہ کے بعد جو نئے حالات و حوادث دنیا میں گزرے ہیں اور ان کی بناء پر مسلمانوں کو جو کچھ تعلیم کرنا ضروری ہے، اس کی بھی رعایت اس میں ملحوظ رہے....... مسلمانوں کی تعلیم، ان کی سیاسی حالت، ان کے اخلاق و اعمال، ان کی ضروریاتِ حالیہ، اگر مساجد کی تعلیم سے درست نہ ہوں گی تو کیا وائی۔ ایم۔ سی۔ اے پریچنگ ہالوں میں ان کو ڈھونڈھا جائے؟ اگر یہ سلسلہ درست ہو جائے تو پھر نہ انجمنوں کی ضرورت اور نہ کسی مرکزی کانفرنس کی نہ لوکل کمیٹیوں کی اور نہ مسلم لیگ کی شاخوں کی۔

مولانا اور ارباب عمل کا فرق

میں نے ایک بار کہا تھا کہ میرے فکر و نظر اور آج کل کے کاموں میں ایک بڑا اُصولی فرق یہ ہے کہ وہ راہ تاسیس اختیار کرتے ہیں اور میں صرف تجدید و احیاء کی ضرورت سمجھتا ہوں۔ یہ بحث بھی اسی کی ایک مثال ہے۔

ضرورت وقتیّہ کا تقاضا

اس کام کے لیے:

(۱) ضرورت ہے علماء حق کی بیداری اور اداء فرض کی۔

(۲) ضرورت ہے تمام آئمہ مساجدِ ہند کے حالات کی تفتیش و تحقیق کے لیے ایک باقاعدہ صیغہ کی۔

(۳) ضرورت ہے ایک مدرسہ کی اور ایک خاص نصابِ تعلیم کی جس میں سے مساجد کے پیش امام و خطباء تیار ہو کر نکلیں، لیکن:

تن ہمہ داغدار شد، پنبہ کجا کجا نہی

عبارت اور مطالبِ خطبہ

خطبہ کی عبارت نہایت موثر ہونی چاہیے، تاکہ دلوں کو کھینچ لے اور سامع کو اس کا ذوق دوسری طرف متوجہ نہ ہونے دے...... اصل شے تو مطب ہی .... ہے۔ اس میں مسلمانوں کے تمام موجود امراضِ ملّی و اجتماعی کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اور ان چیزوں اور شریعت کے ان حکموں پر زور دینا چاہیے جن کے ترک نے مسلمانوں کو فلاحِ کونین سے آج محروم کر دیا ہے۔

نماز عیدین

یہ عجیب بات ہے کہ نماز عیدین کے متعلق اصل حکم، سنت نبوی ﷺ اور علم رسم، تینوں باتیں اس کی موئد ہیں کہ شہر سے باہر کسی میدان یا صحرا میں ایک ہی جماعت کے ساتھ ادا کی

جائیں، مگر بعض شہروں میں عید، مسجدوں کے اندر پڑھنے کا رواج ہوگیا ہے اور اس کی وجہ سے مسلمانوں کی اجتماعی قوت و وحدت کو نقصان عظیم پہنچ رہا ہے...... لیکن بدقسمتی سے مسجدوں میں عیدین نماز پڑھنے کی رسم اس طرح پڑ گئی ہے کہ جب کبھی لوگوں کو اس طرف توجہ دلائی گئی تو بہت کم لوگ ایسے نکلے جنہوں نے اس سنتِ اصلی کے احیاء کو ضروری سمجھا ہو۔

نمازِ قصر بحالتِ امن وراحت

استفتاء اور جواب مولانا

یک عالم کا استنباط:

ایک مستند اور بزرگ عالم نے نمازِ قصر کے متعلق فرمایا کہ ریل کے سفر میں قصر کرنا جائز نہیں کیونکہ قصر کا حکم اس وقت ہوا جبکہ خوف و جنگ اور شدائد و تکالیف کے ساتھ سفر ہوتا تھا۔ اب ریل کے سفر میں وہ حالت کہاں باقی رہی ہے۔؟

سنت قصر کے خلاف استدلال:

اس کی نسبت احقر نے جناب سے استفسار کیا تھا، جناب نے ارقام فرمایا کہ احادیث صحیح سے قصر کرنا ہر حال میں ثابت ہے، چنانچہ میں نے اسے بیان کیا۔ لیکن اس کے جواب میں اُنہوں نے کہا کہ احادیث میں تو اختلاف ہے، حضرت عثمان ؓ اور حضرت عائشہ ؓ کی نسبت ثابت ہے کہ وہ قصر نہیں کیا کرتے تھے۔ اتنے بڑے جلیل القدر اصحاب نے جب قصر نہیں کیا تو پھر کیوں کر سنت ہوسکتا ہے۔؟

ازالہ حیثیت عرفی مولانا:

میں نے آپ کا حوالہ دیا تو اُنہوں نے کہا کہ انہیں حدیث کی کچھ خبر نہیں وہ اس

بحث سے واقف ہی نہیں ہیں۔ ان کے مقابلے میں ایک اور عالم مُصِر ہیں کہ قصر کرنا واجب ہے اور ثابت ہے۔اب احقر نیز یہاں کے مسلمان حیران ہیں کہ کیا کریں؟
اُمید ہے کہ جناب میری تشفی فرماویں گے اور خط کی جگہ الہلال میں مفصل بحث کریں گے۔
احقر العباد۔احمد علی

جواب:۔
جواب کو چند دفعات میں عرض کروں گا۔

تفصیل حکم قصر

سفر وخوف کی حالت

سفر کی حالت میں قصر کرنے ،اور جنگ کی حالت میں خاص طریقہ پر نماز ادا کرنے کا حکم جسے ''صلوٰۃ خوف'' کہتے ہیں۔ نیز اس بات کا حکم کہ نماز اوقات کی تقسیم اور پابندی کے ساتھ فرض کی گئی ہے۔قرآن کریم میں سفر اور خوف کے وقت نماز کے قصر کرنے کا حکم سورہ نساء میں بہ تصریح موجود ہے۔

وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوۃِ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَکُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اِنَّ الْکَافِرِیْنَ کَانُوْا لَکُمْ عَدُوًّا مُّبِیْنًا(۴:۱۰۱)

''اور مسلمانو: جب تم جہاد کے لیے سفر کرو اور تم کو خوف ہو کہ نماز پڑھنے میں کافر حملہ کر بیٹھیں گے تو تم پر کچھ گناہ نہیں اگر نماز میں سے کچھ گھٹا دیا کرو بے شک کفار تمہارے کھلے دشمن ہیں۔''

بحالتِ جنگ وخوف

پھر اس کے بعد جنگ اور خوف کی حالت کے متعلق بہ تفصیل فرمایا۔

وَاِذَا کُنۡتَ فِیۡهِمۡ فَاَقَمۡتَ لَهُمُ الصَّلٰوۃَ فَلۡتَقُمۡ طَآئِفَةٌ مِّنۡهُمۡ مَّعَکَ وَلۡیَاۡخُذُوۡآ اَسۡلِحَتَهُمۡ فَاِذَا سَجَدُوۡا فَلۡیَکُوۡنُوۡا مِنۡ وَّرَآئِکُمۡ وَلۡتَاۡتِ طَآئِفَةٌ اُخۡرٰی لَمۡ یُصَلُّوۡا فَلۡیُصَلُّوۡا مَعَکَ وَلۡیَاۡخُذُوۡا حِذۡرَهُمۡ وَاَسۡلِحَتَهُمۡ (۱۰۲:۴)

''اور اے پیغمبر! جب تم فوج کے ساتھ ہو اور نماز پڑھنے لگو تو اس ترتیب سے نماز پڑھی جائے۔ پہلے ایک جماعت تمہارے ساتھ کھڑی ہو اور اپنے ہتھیار لئے رہے، جب وہ سجدہ کر چکیں، تو پیچھے ہٹ جائیں اور دوسری جماعت جو اب تک شریک نماز نہیں ہوئی تھی، آگے بڑھ کر تمہارے ساتھ شریک ہو جائے اور ہوشیار رہے۔ نیز اپنے اسلحہ بھی لیے رہے۔''

اس آیتِ کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سفر اور خوف دونوں حالتوں میں نماز کو گھٹا کر یعنی قصر کر کے پڑھنا چاہیے۔

سفر سے مراد

سفر کی تصریح '' وَاِذَا ضَرَبۡتُمۡ فِی الۡاَرۡضِ '' میں موجود ہے لیکن چونکہ اس کے بعد حالتِ خوف و جنگ کا ذکر کیا گیا ہے، اس لیے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں سفر سے مقصود خاص وہی سفر ہوگا جو جہاد و قتالِ کفار کی غرض سے کیا جائے۔

سجدہ سے مراد

اس آیت سے ضمناً یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ قصر کی حالت میں دو رکعتیں پڑھنی چاہییں، کیونکہ فرمایا کہ ایک جماعت جب سجدہ کر چکے تو ہٹ جائے اور دوسری جماعت آ کر پڑھے ایک سجدہ سے مقصود ایک رکعت ہی ہوگی۔

اصل نماز

نماز کا جب حکم ہوا تو صرف دو رکعتیں ہی فرض ہوئی تھیں۔ احادیث سے ثابت ہے

کہ ہجرت تک آنحضرت ﷺ نمازِ مغرب کے سوا اور تمام نمازیں دو رکعت پڑھتے تھے۔ ہجرت کے بعد چار رکعت قرار دی گئی۔ پس چونکہ اصل نماز کی دو رکعت تھی اور اصل کسی حالت میں بھی ساقط نہیں ہوسکتی۔ اس لیے جنگ اور خوف کے وقت بھی وہ قائم رہی۔

تزدید بحالتِ قیام

چنانچہ عروہ بن زبیر کی روایت سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول مشہور ہے:

فُرِضَتِ الصَّلٰوةُ رَكْعَتَيْنِ رَكْعَتَيْنِ فِيْ الْحَضَرِ وَالسَّفَرِ فَأُقِرَّتْ صَلٰوةُ السَّفَرِ وَ زِيْدَ فِي صَلٰوةِ الْحَضَرِ [۳۶]

''نماز دراصل دو دو رکعتیں ہی فرض ہوئی تھی۔ لیکن اس کے بعد وہ سفر کی حالت میں قرار پائی اور قیام کی حالت میں زیادہ ہوگئی۔''

غلط استنباط

معلوم ہوتا ہے کہ جس بزرگ نے آپ سے نمازِ قصر کی نسبت کہا ہے ان کی نظر صرف اس آیت ہی کی طرف ہے اور بلاشبہ یہ درست ہے کہ قصر کا حکم جنگ اور خوف ہی کی وجہ سے ہوا کیونکہ لڑائی کے عالم میں زیادہ عرصے تک نماز میں مصروف رہنا ہوشیاری اور حفاظت کے خلاف تھا۔ لیکن جو نتیجہ اُنہوں نے اس سے نکالا ہے، وہ کسی طرح صحیح نہیں۔

حکم قصر اور اس کی تعمیم

نمازِ قصر کا حکم جنگ ہی کی وجہ سے دیا گیا تھا۔ پھر ہر طرح کے سفر کے لیے عام ہو گیا۔ سنت اور تعامل سے معلوم ہو چکا ہے کہ قصر سے مقصود چار کی جگہ دو رکعت پڑھنا ہے اگر نماز چار رکعت سے کم ہو تو اس میں قصر نہیں۔

اگر جنگ کی حالت میں قصر نماز بھی بہ اطمینان نہیں پڑھ سکتے یا جنگ جاری رہے اور نماز کا وقت آ گیا تو پھر اس طریقہ پر ادا کرو، جس کی ترکیب بتلا دی ہے۔ اس سے معلوم

ہوا کہ نماز مسلمانوں کے لیے ایک ایسا عمل ہے جس سے کسی حال میں بھی غفلت جائز نہیں حتیٰ کہ عین جنگ کی حالت میں بھی۔

اگر حالت ایسی ہو کہ کسی طرح نماز ادا نہ کی جا سکے تو پھر قضا کرنی چاہیے۔ جیسا کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے غزوہ خندق میں کیا تھا (صحیحین)

آخر میں فرمایا، نماز بقید وقت فرض کی گئی ہے۔

فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (۱۰۳:۴)

''پھر جب ایسا ہو کہ تم (دشمن کی طرف سے) مطمئن ہو جاؤ (معمول کے مطابق) نماز قائم کرو۔ بلا شبہ نماز مسلمانوں پر بہ قیدِ وقت فرض کر دی گئی ہے۔''

سنت ثابتہ اور آثار صحیحہ

اُسوۂ نبوی ﷺ

بلا شبہ اس آیت میں جنگ اور خوف کی حالت کا ذکر اور حکم ہے، لیکن یہ بھی بالکل قطعی اور یقینی طور پر احادیث و آثار سے ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ہمیشہ سفر کی حالت میں نماز قصر پڑھی گو وہ سفر امن بغیر جنگ ہی کہ ہو کبھی بھی چار رکعت پڑھنا ان سے ثابت نہیں۔

اسوہ خلفاء اربعہ وصحابہ

اسی طرح خلفاء اربعہ کی نسبت بھی ثابت ہے کہ اُنہوں نے ہمیشہ اور ہر طرح کے سفر میں قصر کیا اور یہ امر اس درجہ حدِ تواتر وشہرت تک پہنچا ہوا ہے جبکہ صدر اوّل وعہد صحابہ کا تعامل اس درجہ متیقّن ہے کہ اس سے انکار کرنا کسی طرح ممکن نہیں اور جس شخص نے ایک

نظر بھی کتبِ حدیث پر ڈالی، وہ اس کی کبھی جرأت نہیں کرسکتا۔

شواہد حدیث وفقہ

صحاح ستہ کے یہی ابوابِ صلوٰۃ میرے سامنے ہیں اور اس کے شواہد کثیرہ سے لبریز ہیں۔ پھر قولِ جمہور بھی اس کا موئد ہے اور تمام آئمہ وفقہا کا بھی یہی مذہب ہے۔ میں کتنی حدیثیں نقل کروں گا اور ایک صریح اور مسلّم بات کے لیے دلیل تلاش کرنے سے کیا فائدہ؟ حضرت انسؓ ہی کی روایت اس بارے میں کافی ہے، اگر وہ حدیث کے طالب ہیں، فرمایا:

خَرَجْنَا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْمَدِيْنَةِ اِلٰى مَكَّةَ فَكَانَ يُصَلِّي رَكْعَتَيْنِ رَكْعَتَيْنِ حَتّٰى رَجَعْنَا اِلَى الْمَدِيْنَةِ قُلْتُ اَقُمْتُمْ بِمَكَّةَ شَيْئًا؟ قَالَ اَقَمْنَا بِهَا عَشْرًا [۳۷]

''ہم آنحضرت ﷺ کے ساتھ مدینہ سے مکہ روانہ ہوئے وہ برابر دو دو رکعت نماز پڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ مکہ میں قیام کرکے پھر مدینہ واپس پہنچ گئے (یعنی مدینہ آنے تک یہی حالت رہی۔ یحییٰ بن ابی اسحاق راوی نے پوچھا کہ مکہ میں کچھ قیام بھی) کیا تھا؟ کہا کہ ہاں ایک عشرہ''

عمل صحابہ وآئمہ اربعہ

صرف صحیحین ہی کو اُٹھا کر دیکھ لیجیے، خلفاء اربعہ اور تمام اجلّہ صحابہ کا ہمیشہ ایک ہی عمل اسی پر رہا۔

مسلم میں بروایتِ مجاہد حضرت ابن عباس کا قول صاف صاف موجود ہے:

فَرَضَ اللّٰهُ الصَّلٰوةَ عَلَى لِسَانِ نَبِيِّكُمْ فِيْ الْحَضَرِ اَرْبَعًا وَ فِيْ السَّفَرِ رَكْعَتَيْنِ وَفِيْ الْخَوْفِ رَكْعَةً [۳۸]

''اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی ﷺ کی زبانی تم پر نماز فرض کی ہے، حضر میں چار رکعت سفر میں دو رکعت اور خوف کے وقت صرف ایک رکعت۔''

حکمت بقاء حکم قصر مع فوتِ علت

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

البتہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب قصر کا حکم ایک خاص علت کی وجہ یعنی جنگ، خوف کے سبب سے ہوا تھا تو پھر دفع علت کے بعد کیوں قائم رہا؟ آپ کے سوال میں اسی بات پر زور دیا گیا ہے لیکن آج ہی اس کی نسبت شبہ پیدا نہیں ہوا بلکہ خود اسی عہدِ مقدس میں بھی یہ شبہ پیدا ہوا تھا اور اس کا جواب بھی دیا گیا۔ یعلیٰ بن امیہ نے یہی سوال حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے کیا تھا۔

عَنْ يَعْلٰى بْنِ اُمَيَّةَ قَالَ قُلْتُ لِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ: لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَقَدْ اَمِنَ النَّاسُ فَقَالَ : عَجِبْتُ مِمَّا عَجِبْتَ فَسَأَلْتُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ ذٰلِكَ قَالَ : صَدَقَةٌ تَصَدَّقَ اللّٰهُ بِهَا عَلَيْكُمْ فَاقْبَلُوْا صَدَقَتَهُ.

"یعلیٰ بن امیہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمرؓ سے پوچھا: قرآن میں تو یہ ہے کہ اگر تمہیں کافروں کی طرف سے خوف ہو تو کچھ مضائقہ نہیں، اگر تم نماز کو قصر کر لو۔ اس سے معلوم ہوا کہ حکم صرف بے امنی اور خوف کی وجہ سے ہے لیکن اب تو امن ہو گیا ہے اور وہ حالت باقی نہیں رہی.... اب کیوں قصر کیا جاتا ہے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جس طرح تمہیں آیت کی بناء پر تعجب ہوا ہے مجھے بھی ہوا تھا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا۔ اُنہوں نے جواب دیا کہ یہ خدا کا تم پر صدقہ ہے۔ اس کے بخشے ہوئے صدقے کو قبول کر لو۔"

خدا کی بخشش اور شریعت کی آسانی

یہ حدیث میں نے صحیح مسلم سے نقل کی ہے۔ لیکن نسائی نے بھی اسے یعلیٰ بن امیہ کی راویت سے باختلاف رواۃ مابعد لیا ہے۔

اصل یہ ہے کہ شریعت کے تمام احکام میں آسانی اور سہولت ملحوظ رکھی گئی ہے "اَلدِّیْنُ یُسْرٌ" شریعت حقہ کی بڑی پہچان ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی کمزوری پر جب رحم فرماتا ہے تو پھر اسے واپس نہیں لیتا۔

سچے قانون کی پہچان

اس حدیث کا مطلب یہی ہے کو حکم جنگ اور خوف کی بناء پر ہوا تھا۔ لیکن جب خدا نے آسانی عطا فرمادی تو یہ اس کی بخشش ہے اور خدا کی بخشش کو کون ہے جو رد کرنے کی جرأت کرسکتا ہے۔؟ یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلاَ یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ (۲:۱۸۵) وَقَالَ اَیضًا سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی : مَاجَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ (۲۲:۷۸) انسان کے لیے سچا قانون وہی ہوسکتا ہے۔ جو اس کے ضعف، اس کی مجبوریوں اور اس کی طبعی احتیاجات و داعیات کا پورا پورا لحاظ رکھے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا اختلاف

احتجاج غلط ہے

نماز کے متعلق صحابہ کرامؓ کے اس عام اجتماع سے صرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا مختلف پائے جاتے ہیں اور بوجہ ناواقفیت و عدم نظر کے بزرگ موصوف نے اس سے احتجاج کیا ہے لیکن اس اختلاف کی حقیقت انہیں معلوم نہیں۔ اس اختلاف میں بھی پہلا اختلاف محض جزئی ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا تعامل

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو حالتِ سفر میں قصر سے اختلاف نہ تھا۔ مثل حضرت شیخین واجلّہ صحابہ کے وہ بھی قصر کیا کرتے تھے۔ صحیح مسلم میں عامر بن عمر کا قول ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ پڑھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے

ساتھ پڑھی۔ یہ سب قصر کیا کرتے تھے اور آخری وقت تک ان کا عمل اسی پر رہا۔ راویت میں حضرت عثمان ﷛ کی نسبت بھی اسی جزم و یقین کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ "فَلَمْ يَزِدْعَلٰى رَكْعَتَيْنِ حَتّٰى قَبَضَهُ اللهُ" یعنی میں نے حضرت عثمان ﷛ کی بھی صحبت پائی لیکن اُنہوں نے بھی سفر کی دو رکعتوں کو کبھی زیادہ نہیں کیا، یہاں تک کہ وفات پا گئے!

پس دیکھو، اس روایت سے کس طرح صاف صاف ثابت ہے کہ عام طور پر نماز قصر کے متعلق انہیں کوئی اختلاف نہ تھا۔ وہ اسی طرح قصر کرتے تھے جس طرح کہ حضرات شیخین [۳۹] رضی اللہ عنہما کرتے رہے اور نیز یہ کہ وہ آخر تک اسی پر قائم رہے۔

موقع اختلاف عثمان ﷛

البتہ اپنی خلافت کے دوسرے سال انہیں ایک جزئی اختلاف اس مسئلے میں پیدا ہوا اور وہ بھی قصر کے ایک خاص موقع اور سفر کی ایک مخصوص صورت کی نسبت۔ آنحضرت ﷺ کا طرزِ عمل، دیگر اجلّہ صحابہ کے سامنے یہ تھا کہ وہ منٰی میں کلی مثل دیگر مواقع سفر کے قصر پڑھا کرتے تھے۔ حضرت عثمان ﷛ بھی اپنی خلافت کے ابتدائی عہد میں ایسا ہی کرتے تھے، مگر دوسرے سال اُنہوں نے اختلاف کیا اور منٰی میں پوری نماز پڑھی، صحیحین میں عبداللہ بن عمر ﷛ اور عبدالرحمٰن ﷛ بن یزید وغیرہ سے مروی ہے:

صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِى بِمِنٰى رَكْعَتَيْنِ وَاَبِى بَكْرٍ وَعُمَرَ وَمَعَ عُثْمَانَ صَدْرًا مِّنْ اَمَارَتِهٖ ثُمَّ اَتَمَّهَا [۴۰]

"میں نے آنحضرت ﷺ کے ساتھ منٰی میں دو رکعت (نماز پڑھی) پھر ابوبکر ﷛ کے ساتھ، اسی طرح عثمان ﷛ کے ساتھ بھی، ان کی خلافت کے ابتدائی عہد میں۔ اس کے بعد ان کی رائے بدل گئی اور وہ پوری پڑھنے لگے۔"

پس حضرت عثمان ﷛ کا جو اختلاف ہے وہ عام مسئلہ قصر پر کچھ موثر نہیں صرف قصر صلوٰۃ المنٰی کی نسبت اُنہوں نے رائے بدل لی تھی اور اس کی ایک تاویل کر لی تھی جس کی تفصیل کتب شہیرہ فقہ وحدیث میں موجود ہے۔

اضطراب انگیز اختلاف عائشہ رضی اللہ عنہا

البتہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا اختلاف اس معاملے میں مضطرب اور عجیب ہے ۔ایک طرف تو خود ان کا قول اُوپر گزر چکا ہے کہ:

"فُرِضَتِ الصَّلٰوۃُ رَکْعَتَیْنِ رَکْعَتَیْنِ فِیْ الْحَضَرِ وَالسَّفَرِ فَأُقِرَّتْ صَلٰوۃُ السَّفَرِ وَ زِیْدَ فِی صَلٰوۃِ الْحَضَرِ"

''نماز اصل دو ،دو رکعت ہی فرض ہوئی تھی پھر دو سفر میں قرار پا گئی اور حضر میں زیادہ یعنی چار رکعت ہو گئی''

دوسری طرف یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا) قصر کی قائل نہ تھیں!

پہلی تاویل

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جن کا اجتہاد اور بصیرت وعلم تمام صحابہؓ میں امتیازِ خاص رکھتا تھا، سخت تعجب ہے کہ وہ اس صاف اور صریح مسئلہ میں بغیر کسی سببِ قوی کے ایسا مضطرب عمل رکھیں!

میں سمجھتا ہوں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بھی مثل حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے صرف منٰی ہی کے قصر میں اختلاف ہو گا۔ عام طور پر نفسِ قصر سے اختلاف نہ فرماتی ہوں گی۔ اس کی تائید، مسلم کی مشہور حدیث سے ہوتی ہے۔ زہری سے حضرت عروہ بن زبیر نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ مشہور قول جب نقل کیا کہ ''سفر میں دو رکعت نماز قرار پائی۔'' تو زہری نے سوال کیا۔

فَقُلْتُ مَابَالُ عَائِشَۃَ تَمَّ فِیْ السَّفَرِ؟ قَالَ اِنَّھَا تَأَوَّلَتْ کَمَا تَأَوَّلَ عُثْمَانُ[4]

''زہری کہتے ہیں کہ میں نے یہ سن کر عروہ سے کہا کہ پھر عائشہ رضی اللہ عنہا کو کیا ہو گیا کہ وہ سفر میں پوری پڑھتی تھیں؟ اُنہوں نے کہا کہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے بھی اس کی تاویل کر لی تھی۔ جیسی کہ عثمان رضی اللہ عنہ نے کی تھی۔''

دوسری تاویل

عروہ کے قول میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تاویل کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تاویل سے تشبیہ دی ہے۔ یہ تشبیہ نفسِ تاویل میں بھی ہوسکتی ہے کہ جس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قصر الصلوٰۃ بمنٰی کی تاویل کی تھی ویسی ہی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نفس مسئلہ قصر میں بھی کی ہو اور اسی طرح مسئلہ قصر میں بھی ہوسکتی ہے کہ جس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تاویل کر کے منٰی میں قصر ترک کر دیا تھا اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بھی منی کے قصر کی تاویل کر لی۔

رفع اختلاف

اگر اس حدیث میں عروہ کے قول کا آخری مطلب سمجھا جائے تو نفس قصر کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا اختلاف باقی نہیں رہتا اس صورت میں ایک اور حدیث سامنے آئے گی جو امام شافعیؒ نے روایت کی ہے:

"كُلُ ذٰلِکَ قَدْ فَعَلَ النَّبِیُّ قَصَرَ الصَّلٰوۃَ وَاَتَمَّ"

"نبی ﷺ نے یہ سب کچھ کیا کہ قصر نماز بھی پڑھی اور پوری نماز بھی، لیکن اس حدیث کی صحت بالکل مشتبہ ہے۔ اس کی روایت یوں ہے شافعیؒ عن ابراہیم بن محمد اور عن طلحہ بن عمرو عن عطاء لیکن ابراہیم بن محمد اور طلحہ بن عمر باتفاق محدثین ضعیف الروایت ہیں اور ان دونوں کا ایک روایت میں جمع ہو جانا اس کی تضعیف کے لیے کافی سے بھی زیادہ ہے۔ جیسا کہ اربابِ فن پر مخفی نہیں۔"

عدم قبول وجہ اختلاف

بہرحال حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا اختلاف اگر صریح و عمومی صورت میں متحقق بھی ہو جائے، جب بھی اجلّہ صحابہ اور احادیث معروفہ و مشہورہ نبویہ کے مقابلے میں صرف ان کا اختلاف کیونکر مقبول ہوسکتا ہے؟ علی الخصوص جبکہ خود ان کا قول موجود ہے کہ سفر کی حالت

میں دو رکعت قرار دی گئی اور خود ان کے بھانجے (یعنی عروہ) نے جو اس بارے میں اعلم الناس ہیں، صاف صاف کہہ دیا کہ وہ کسی تاویل کی بناء پر ایسا کرتی تھیں، نہ کہ کسی سنت کی بناء پر؟ اگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس کوئی دلیل سنت موجود ہوتی تو عروہ اس سے کیونکر بے خبر رہتے؟ فتا مل و تدبر!!

فضیلتِ نمازِ قصر

امام شافعیؒ کا قول

اس بارے میں اختلاف ہے کہ حالت سفر میں قصر کرنا کس حکم میں داخل کیا جائے اور اگر پوری چار رکعت کوئی پڑھ لے تو اس کا حکم کیا ہے؟ آیا وہ حرام ہوگا، مکروہ ہوگا، یا یہ کہ اس کا ترک اولیٰ ہے؟ امام شافعیؒ کا مذہب اُن کے ایک قول کے بموجب یہ ہے کہ قصر جائز ہے مگر اتمام (پوری نماز پڑھنا) افضل۔ لیکن اس سے زیادہ معتبر و مسلم قول ان کا وہ ہے جس میں قصر کو افضل بتلایا گیا ہے۔

قصر کا وجوب

امام مالک سے بھی دو مختلف قول منقول ہیں۔ ایک میں قصر و اتمام دونوں کو یکساں بتلایا گیا ہے۔ ایک میں قصر کے وجوب کے قائل ہیں۔ امام سحنون کی روایت وجوب ہی کی تائید کرتی ہے۔ امام احمد بھی ایک قول میں قصر کو افضل اور دوسرے میں اتمام کو مکروہ بتلاتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ قصر کے وجوب کے قائل ہیں۔

یعلیٰ بن امیہ کی حدیث میں آنحضرت ﷺ نے مثل امر کے فرمایا ہے کہ قبول کرلو۔ اس اس لیے احناف کہتے ہیں کہ وجوب ثابت ہوگیا۔

اصحّ اور اوسط مسلک

لیکن ''فَاقْبَلُوْا'' کو اس طرح کا امرِ نصی قرار دینا، جس کو وجوب کے لیے مستلزم قرار دیا گیا ہے، ضروری اور قطعی نہیں۔ سب سے زیادہ اصحّ اور اوسط مسلک یہی ہے کہ قصر سنت

ہے اور اتمام مکروہ۔ ائمہ مذاہب کے مختلف اقوال میں سے ایک ایک قول سب کا باتفاق اسی کی تائید کرتا ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ باوجود وجوب کے فرماتے ہیں کہ قصر کی نیت واجب نہیں۔ اگر نیت واجب نہیں تو وجوب قطعی نہ ہوا۔

الحاصل، آج کل کے سفر میں بھی قطعاً نمازِ قصر کا حکم باقی وقائم ہے اور حالتِ خوف اور شدائد کا نہ ہونا اس پر کچھ مؤثر نہیں ہوسکتا۔ آنحضرت ﷺ سے اونٹ کی پیٹھ پر جب نماز ثابت ہے تو ریل کے اندر کیوں جائز نہ ہوگی۔؟

حضرت مولانا نے یہ خطبہ جمعہ کے دن مقام کلکتہ میں مورخہ ۲۰ ذی قعدہ سنہ ۱۳۵۳ھ کو ارشاد فرمایا۔

روح نماز اوراس کا فقدان

مسلمانوں کی محرومی کی اصلی وجہ

ذریعہ حصول دین ودنیا

...... نماز کو درست کرنا اور ٹھیک طریقہ پرادا کرنا اوّلین رکن دین ہے اور اگر صرف اپنی نمازیں درست و استوار کر لی جائیں تو میں...... اعلان کرتا ہوں کہ دین کی ساری سربلندیاں حاصل ہوسکتی ہیں۔

پاداش عمل کی سردمہری

مگر افسوس کہ مسلمانوں کی غفلت و جمود نے جہاں ان کی بداعمالیوں کی پاداش میں ان سے ہر قسم کی سربلندیاں اور سرفرازیاں چھین لی ہیں وہاں ان کے دلوں کی انگیٹھیاں بھی اس درجہ سرد ہوگئی ہیں کہ ان میں اب کوئی چنگاری اور کوئی گرمی باقی نہیں رہی۔ دل کا سوز وگداز، اللہ کے حضور جھکنے کا جذبہ، سچی اِنابت، سچا عجز، غرضیکہ سب کچھ سرد پڑ چکا ہے۔

بے لذت نماز کی بے اثری

کون ہے، جو نماز کی صحیح لذت اپنی نمازوں میں پاتا ہے؟ اور جب نماز کی لذت ہی نماز سے علیحدہ کر لی گئی تو پھر وہ ایک جسم ہے جس میں جان نہیں، ایک پھول ہے جس میں خوشبو نہیں، ایک ڈھانچہ اور ہیولیٰ ہے جس میں روح نہیں۔ ایسی نماز بے کار، صرف قواعد ہوئی اور ٹکر مارنا یعنی بے نتیجہ بے فائدہ بے اثر۔

برکاتِ قرآنی کا فقدان

اگر مسلمان صحیح طور پر نماز ادا کرتے ہیں، اگر ان کی نمازیں حقیقی نماز میں شمار ہوتی ہیں تو پھر بتاؤ کہ نماز کے وہ قرآنی برکات جن کا اللہ نے نمازی سے وعدہ کیا ہے، کہاں ہیں؟ یقیناً اللہ کا قانون اٹل، اس کا وعدہ سچا:

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلاً (۶۲:۳۳) وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ (۴۷:۲۲)

''دستورِ الٰہی میں کبھی تغیر و تبدل ہونے والا نہیں۔ خدا کے وعدہ میں خلاف ورزی ہرگز نہ ہوگی۔''

فقدان کا اصلی سبب

اصل یہ ہے کہ دلوں کے چولہے سرد ہو گئے ہیں، ان میں کوئی گرمی اب باقی نہیں رہی۔ کوئی چنگاری موجود نہ رہی ورنہ اگر ہماری نمازوں میں سوز و گداز، عجز و الحاح ہوتا، تو دنیا اور دنیا کے ساتھ دین کی کامرانیاں ہماری ہوتیں۔

محرومی کے لیے نسخہ شفاء

ابتدائے اسلام اور داعیِ اسلام کی غربت

میں بتاؤں کہ کیوں صرف نماز ہی کی استواری و درستگی سے ہمارا دین اور ہماری دنیا بدل

سکتی ہے؟ سنو! تم قرآن کی تمام مکی سورتوں کو پڑھ جاؤ۔ یعنی جن کا زمانۂ نزول زمانہ قیام مکہ تھا اور رسول ﷺ اپنے وطن ہی میں تشریف فرماتے تھے اور یہی وہ زمانہ تھا جب دعوت و تبلیغِ حق کی پکار مکہ کے کوہساروں سے شروع میں ٹکرائی تھی۔ بالکل ابتدائے عالم اسلام تھی، اس وقت اسلام و داعی اسلام کی غربت و بیچارگی، بے یاری و بے مددگاری، اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔

مسلمانوں کے خون کے پیاسے

معدودے چند مسلمان تھے جو ہر طرف ہر طرح سے اعدائے اسلام کے نرغے میں محصور تھے۔ پورا مکہ اور نہ صرف مکہ بلکہ پورا جزیرۃ العرب ان کے خون کا پیاسا اور جان کا دشمن تھا، یار تھا نہ کوئی مددگار۔ جس طرف نظر اُٹھتی تھی، مایوسی سے ٹکرا کر واپس آتی تھی۔ جس طرف امان و احسان کی تلاش میں نکلتے تھے، مایوسی و حرمانی کے ساتھ واپس آ جاتے تھے۔

حکیم مطلق کا واحد علاج

ایسے عالم کسمپرسی و بیچارگی میں، بتاؤ کہ اس وقت ان تمام درد و مصائب کا علاج و نسخۂ شفاء جو حکیم مطلق نے تجویز کیا تھا، کیا تھا؟ وہ صرف ایک ہی تھا۔ یعنی:

"اَقِمِ الصَّلٰوۃ، اَقِمِ الصَّلٰوۃ" نماز قائم کرو۔ نماز قائم کرو۔

حالانکہ اللہ کی اس کشادہ زمین پر ان کو یہ بھی حق نہ تھا کہ کھلے طور پر نماز ہی کے لیے جگہ ملتی مگر دانائے حال نے بجز اس کے اور کوئی دوسرا نسخہ تجویز نہیں کیا۔

یہ اس لیے کہ نماز ہی تمہارے لیے تمام دکھوں کا علاج، ہر درد کی دوا اور ہر زخم کا مرہم ہے۔

رجوع الی القرآن

ہر کرب و الم کے لیے داروئے تسکین

وسیع و کشادہ زمینِ عرب میں سب کے لیے جگہ تھی۔ سب کو چلنے پھرنے کا بلا قیدو

شرط حق تھا۔ مگر تنگ تھی وہ زمین، تو اِن چند ہی پرستارانِ حق وتوحید کے لیے۔ وہ کون سی جسمانی وروحانی تکلیف وایذا تھی جو ان کو نہ دی گئی، یا ان کے لیے نہ تجویز کی گئی؟ بالآخر جب شدت تکالیف وایذا رسانی حد سے بڑھ گئی اور انسان کے لیے نا قابل برداشت ہوگئی حتّٰی کہ وہ وجودِ اقدس وگرامی بادشاہ "رحمة للعالمين" ہجرت پر مجبور ہوا، اور وطن سے بے وطنی پر لاچار۔ اس وقت کے کرب والم، دردوغم کے لیے بھی جو داروئے تسکین ومرہم زخم آتا ہے۔ وہ یہی کہ:

اَقِمِ الصَّلٰوة نماز قائم کرو، نماز قائم کرو۔

کامیابی کی راہ

سورہ قٓ کی آخری آیات پڑھو، تم کو واضح ہو جائے کہ اس بیچارگی، غربت اور درد ومسکنت کا جو علاج سوچا گیا، کامیابی کی جو راہ سوچی گئی تھی وہ بجز اس کے اور کچھ نہ تھی کہ:

اَقِمِ الصَّلٰوة نماز قائم کرو، نماز قائم کرو۔

قرآن کے رکھنے کی جگہ

مگر کاش! کبھی تم قرآن پڑھتے بھی۔ تم نے قرآن کو پڑھنے اور سمجھنے کی چیز ہی نہیں سمجھا۔ اس کو ریشمی غلافوں اور جز دانوں میں لپیٹ کر طاق میں رکھنے کی چیز سمجھ لیا ہے، جو کبھی وقتِ ضرورت کام میں لائی جاتی ہے۔

بلاشبہ قرآن رکھنے کی چیز ہے، مگر غلافوں میں نہیں دل میں، جس کو اللہ تعالیٰ توفیق دے۔

سچی نماز کی برکت

(غور کرو) کس طرح پھر انہی معدودے چند مسلمانوں نے نماز، سچی نماز اور صرف سچی نماز کی برکت سے جماعت کی شکل اختیار کی اور کس طرح اس ربانی جماعت نے دنیا کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔

معاشرتی زندگی

اگر تم معاشرتی زندگی کی اخلاقی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا چاہتے ہو تو چاہیے کہ خدا کے ذکر و عبادت سے اپنی قوت مضبوط کرتے رہو۔ جو جماعت نماز کی حقیقت سے محروم ہوگئی یعنی عبادت کے خشوع وخضوع کا اس میں ذوق نہ ہوگا، وہ کبھی عملی زندگی کی اخلاقی مشکلات پر قابو نہیں پاسکتی۔

سلف صالحین

انقلاب آمیز نمازیں

ایک وہ انقلاب انگیز نمازیں تھیں، ایک تمہاری نمازیں ہیں، جو رسمًا یا دکھاوے کے لیے ادا کی جاتی ہیں۔ ان نمازوں کا ہونا، نہ ہونا برابر، ان کا کرنا نہ کرنا ایک۔ بتاؤ! تمہاری نمازوں میں کوئی لذت ہے جس سے تمہارے دلوں میں سرور اور تازگی پیدا ہوتی ہو؟ تمہارے دلوں میں کوئی سوز و گداز ہے؟ دلوں کے چولہے میں کوئی چنگاری باقی ہے جو تمہاری آنکھوں سے ہنگامِ نماز ایک قطرۂ اشک نکالا کرتی؟ بتاؤ ایسی نمازوں میں کشش و محبت الٰہی کا کوئی اثر محسوس کرتے ہو؟

اگر نہیں، تو پھر تمہاری نماز بے کار، تمہارے سجدے باطل، تمہاری عبادت اکارت، سچی نماز تو وہ نماز ہے جس سے دل میں سوز و گداز، رکوع میں خشوع وخضوع اور سجود میں کیف ولذت حاصل ہو اور تقرب و معراج الی المحبوب۔

سچی نماز کی شہادتِ قرآنی

جن کی نمازیں سچی نمازیں تھیں، جنہوں نے اپنی نمازوں میں لذت وچاشنی پائی تھی، جن کے زبان ولب اس جامِ شیریں کی لذت سے شاد کام تھے، قرآن ان کو ان الفاظ کے ساتھ یاد کرتا ہے۔

تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ (۱۶:۳۲)

''ان کے پہلو، خواب گاہوں سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔''

ان تمام کی پسلیاں نرم و نازک بستروں پر سکون و قرار نہیں پاتیں، راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر اپنے اللہ کے حضور نمازیں قائم کرتے ہیں۔ اس کی رضا کی آرزوئیں، اس کے وصل کی التجائیں، ان کی پیشانیاں مصروفِ سجدہ، اِن کی زبانیں تسبیح کناں، ان کے قلوب محوِ لذائذ نماز ہوتے ہیں۔

کاش! تمہیں بھی ایسی نمازوں کی چاٹ پڑتی اور تم سمجھتے کہ نماز واقعی کیا چیز ہے۔؟

هٰذَا وَاَحْسَنَ الْكَلَامِ كَلَامُ اللهِ الْمَلِكُ الْمَنَّانُ۔ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ۝ (۲۳:۱-۲)

۱۷ ذی قعدہ سنہ۔ ۱۳۵۳ھ/۳۵/۲،۱۵۔۱۹۴۵

حواشی

(۱) رَوَاہُ اَبُوجَعْفَرٍ مُحَمَّدُ بْنُ مُحَمَّدُ بْنِ جَرِیْرٍ قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ حُمَیْدٍ قَالَ ثَنَا سَلَمَۃُ عَنْ ابْنِ اِسْحَاقَ وَمَاکَانَ صَلَا تُھُمْ عِنْدَ الْبَیْتِ اِلَّا مُکَاءً وَّتَصْدِیَۃً قَالَ مَاکَانَ صَلاَ تُھُمْ (اِلَخْ)

(۲) تفسیر کبیر، امام رازی، ج ۱، ص۔ ۳۹۸

(۳) ایضاً

(۴) ۲ قرآن کریم ۵:۰۷، ۲:۷۷۲، ۹:۵-۱۱، ۱۳:۲۲، ۳۵:۱۹-۲۶، ۴۲:۳۶، ۵:۰۶، ۲:۲، ۹:۳۷، ۲:۰۴-۷۷، ۱۰۴، ۴:۹۷، ۷:۸۲، ۱۰:۸۷، ۲۴:۵۵، ۳۰:۳۰، ۵۵:۸، ۲:۶۵، ۳۸:۲۰، اِلٰی غَیْرِ ذَالِکَ مِنْ آیَاتٍ کَثِیْرَۃٍ تَدُلُّ اَنَّ لَاَصَلٰوۃَ اِلَّا بِاِقَامَۃِ حُدُوْدِھَا وَشُرُوْطِھَا۔

(۵) اَبُوجَعْفَرٍ قَالَ حَدَّثَنَا عُثْمَانُ بْنُ سَعِیْدٍ عَنْ شَیْرِبْنِ عُمَارَۃَ عَنْ اَبِیْ رَوْقٍ عَنِ الضَّحَاکِ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ قَالَ اِقَامَۃُ الصَّلٰوۃِ (الخ)

۶) اَبُوجَعْفَرٍ قَالَ حَدَّثَنِیْ اِسْمَاعِیْلُ بْنُ مُوْسَی الضَرَارِیُ قَالَ حَدَّثَنَا الْحُسَیْنُ رَتَاقِ اَلْھَمْدَ انِیُ عَنْ ابْنِ جَرِیْح عَنْ عِکْرِمَۃَ بْنِ عَمَادٍ عَنْ مُحَمَّدِبْنِ عُبَیْدِبْنِ اَبِیْ قُدَامَۃَ عَنْ عَبْدِالْعَزِیْزِ بْنِ اِیْمَانٍ عَنْ حُذِیْفَۃَ قَالَ (الخ)

۷) اَبُوْ جَعْفَرُ قَالَ حَدَّثَنَاالْقَاسِمُ قَالَ حَدُّثَنَا الْحُسَیْنُ قَالَ حَدَّثَنِیُ حَجَّاجٌ قَالَ قَالَ ابْنِ جریح وَاسْتَعِیْنُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلاَۃِ قَالَ اِنَّھُمَا (الخ)

۸) فتح البیان، (طبع مصر) جلد ۷، ص۔ ۲۹۱

۹) ابن کثیر، (علی ہامش الفتح) ج ۷، ص۔ ۲۹۶

۱۰) تفسیر کبیر، ج ۵، ص۔ ۱۶۴

۱۱) ابن جریر، ج ۲، ص۔ ۹۲۔ ۹۳

۱۲) تفسیر کبیر، ج۵، ص-۱۶۵

۱۳) رَوَاهُ الِامَامُ اَحْمَدُ بْنُ حَنْبَلٍ قَالَ حَدَّثَنَا وَ كِيْعُ اَخْبَرَنَا الْاَعْمَشُ، قَالَ اُرَىٰ اَبَا صَالِحٍ عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِىِّ (صلعم) الخ.....

۱۴) یہ بات یعنی ادائے نماز کا چوری سے روک دینا۔ ناشر

۱۵) رَوَاهُ عَلِيٌّ قَالَ حَدَّثَنَا قَالَ ثَنِىْ مَعَاوِيَةُ عَنْ عَلِيِّ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَوْلُهُاِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ يَقُوْلُ فِىْ الصَّلَاةِ (الخ)

۱۶) الْقَاسِمُ قَالَ حَدَّثَنَا الْحُسَيْنُ قَالَ ثَنَا خَالِدُ بْنُ عَبْدِ اللهِ عَنِ الْعَلَاءِ بْنِ الْمُسَيَّبِ عَنْ ذِكْرِهٖ، وَقَدْنَسِيَ الرَّازِى اسْمَهُ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ فِىْ قَوْلِ اللهِ تَعَالٰى اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ

۱۷) اَلْقَاسِمُ قَالَ ثَنَا الْحُسَيْنُ قَالَ ثَنَا خَالِدٌ قَالَ قَالَ الْعَلَاءُ بْنُ الْمُسَيَّبِ عَنْ سَمُرَةَ بْنِ عَطِيَّةَ، قَالَ قِيْلَ لِابْنِ مَسْعُوْدٍ (الخ)

۱۸) اَلْحُسَيْنُ قَالَ ثَنَا عَلِيٌّ بْنُ هَاشِمِ بْنِ يَزِيْدَ عَنْ جَوْهَرٍ عَنِ الضَّحَّاكِ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ عَنِ النَّبِىِّ صَلَّے اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ قَالَ (الخ)

۱۹) عَلِيٌّ عَنْ اِسْمَاعِيْلَ بْنِ مُسْلِمٍ عَنِ الْحَسَنِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ (الخ)

وَبِرِوَايَتِهٖ اُخْرَى عَنْ يَعْقُوْبَ قَالَ ثَنَا ابْنُ عُلَيَّةَ عَنْ يُوْنُسَ عَنِ الْحَسَنِ قَالَ (الخ)

۲۰) بِشْرٌ قَالَ ثَنَا يَزِيْدُ قَالَ ثَنَا سَعِيْدُ بْنُ قَتَادَةَ وَالْحَسَنُ قَالَا (الخ)

۲۱) غرائب القرآن، ج۲، ص-۳۵۶

۲۲) اِبْنُ بَشَّارٍ قَالَ ثَنَا عَبْدُالْوَهَابِ قَالَ ثَنَا عَوْفٌ عَنْ اَبِى الْمِنْهَالِ عَنْ اَبِى الْعَالِيَةَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّهٗ صَلَّى (الخ)

۲۳) ابن جریر، ج۲، ص-۳۵

۲۴) يُوْنُسُ بْنُ عَبْدِ الْاَعْلٰى قَالَ اَخْبَرَنَا ابْنُ وَهْبٍ قَالَ ثَنِىْ هِشَامُ بْنُ سَعْدٍ قَالَ يَرْضَاهُ عِنْدَ نَفِعٍ (الخ)

۲۵) اَحْمَدُبْنُ اِسْحَاق قَالَ اَبُو اَحْمَدَ عَنْ قَيْسِ بْنِ الرَّبِيْعِ عَنْ سيوين بُنِ عَلُوْقٍ عَنْ اَبِىْ قُطَيْعَةَ قَالَ (الخ)

۲۶) غرائب القرآن، جلد۲، ص۔ ۳۶۳

۲۷) فتح البیان، ج۱، ص۔ ۳۱۵

۲۸) ایسی مثالوں کے بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں، کیونکہ یہ بات بخوبی اظہر من الشمس ہے۔

۲۹) عَنْ مُوْسٰى قَالَ ثَنَا عَمرُو قَالَ ثَنَا اَسْبَاطُ عَنِ السَّدِّىِ فِىْ خَبرٍ ذَكَرَهُ عَنْ مُرَّةَ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ وَقَالَ كُنَّا نَقُوْمُ (الخ)

۳۰) مُسْلِمُ ابْنُ جَنَارَةَ قَالَ ثَنَا ابْنُ اُوِيْسٍ عَنْ لَيْثٍ عَنْ مُجَاهِدٍ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ قَالَ فَمِنَ الْقُنُوْتِ طُوْلُ الرُّكُوْعِ (الخ)

۳۱) ابن جریر، ج۲، ص۔ ۳۵۴

۳۲) رَوَاهُ اَحْمَد وَاَبُو داود عَنْ عَبَادَةَبْن الصامت قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَمْسُ صَلَوَاتٍ (الخ)

۳۳) رَوَاه الْبُخارى وَمُسْلِم عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَة وَقَالَ اِنَّ رَجُلاً دَخَلَ الْمَسْجِدَ وَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَالِسٌ (الخ)

۳۴) ابوداؤد جلد اوّل ص۔۳۴۹ کتاب الجہاد

۳۵) حبیب انصاری کا واقعۂ شہادت

۳۶) (صحیح مسلم کتاب صلوٰۃ المسافرین صفحہ۔۲۵۷)

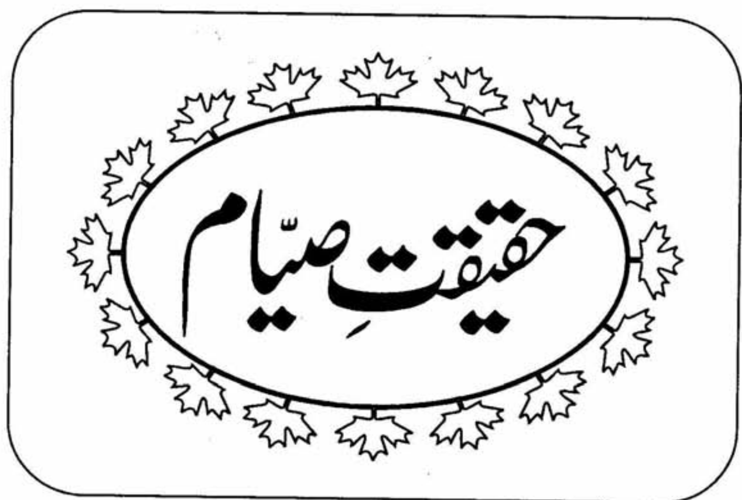
۳۷) (بخاری جلد ثانی باب ماجاء فی القصر)

۳۸) (کتاب صلوٰۃ المسافر وقصرھا)

۳۹) حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما مراد ہیں۔ ’ناشر‘

۴۰) (بخاری۔ ماجاء فی التقصیر)

۴۱) (کتاب صلوٰۃ المسافرین)


حقیقتِ صیام

پس صیام جو ہمارا علاجِ روحانی ہے اگر اس سے شفائے روحانی حاصل نہ ہو تو حقیقت میں وہ صیام نہیں فاقہ ہے اور ایسے صائم اور روزہ دار جن کے صوم میں اتقاء تقدیس اور شکر کے عناصرِ ثلاثہ نہیں وہ فاقہ کش ہیں جن کی تشنگی اور گرسنگی ایک پھول ہے جس میں رنگ و بو نہیں ایک گوہر ہے جس میں آب نہیں ایک آئینہ ہے جس میں جوہر نہیں اور ایک جسم ہے جس میں روح نہیں۔ اور کون نہیں جانتا کہ ایک گل بے رنگ و بو ایک گوہر بے آب ایک آئینہ بے جوہر ایک جسم بے روح بے حقیقت ہستیاں ہیں جن کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

> رُبَّ صائم لیس له من صیامه الا الجوع و رُبَّ قائم لیس له من قیامه الا السهر (رواه ابن ماجه)
>
> ''کتنے روزہ دار ہیں جن کو روزہ سے بجز گرسنگی کچھ حاصل نہیں اور کتنے تہجد گزار ہیں جن کی نماز تہجد سے بیداری کے سوا کچھ فائدہ نہیں۔''

یہ کون لوگ ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کے جسم نے روزہ رکھا لیکن دل نے روزہ نہیں رکھا۔ ان کی زبان پیاسی تھی لیکن دل پیاسا نہ تھا پس رحمت کا کوثر ان کے لیے نہیں کہ پیاسے نہ تھے۔

فہرست (حقیقت صیام)

مقصدِ وحید

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ. بِسمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِO

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ. (۲:۱۸۳)

''مسلمانو! تم پر روزے اسی طرح لکھے گئے جس طرح تم سے پہلی امتوں اور قوموں پر اس سے پہلے لکھے گئے تھے۔ تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو۔''

شَھْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْاٰنُ ھُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْھُدٰی وَالْفُرْقَانِ فَمَنْ شَھِدَ مِنْکُمُ الشَّھْرَ فَلْیَصُمْہُ وَمَنْ کَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَ لَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ وَلِتُکْمِلُوا الْعِدَّۃَ وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰکُمْ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ. (۲:۱۸۵)

''ماہ رمضان وہ ہے جس میں قرآن اترا' جو لوگوں کے لیے سرتاپا ہدایت ہے' جو ہدایت و تمیز حق و باطل کی نشانی ہے' پس جو اس مہینہ میں زندہ موجود رہے۔ وہ روزے رکھے' اور جو مریض یا مسافر ہو' وہ ان کے بدلے دوسرے دنوں میں پھر روزے رکھ لے۔ خدا آسانی چاہتا ہے' سختی نہیں چاہتا' تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کر سکو۔ اور روزے اس لیے فرض ہوئے کہ تم اس عطائے ہدایت پر خدا کی بڑائی کرو' اور شکر بجالاؤ۔''

تذکار نزولِ قرآن واتباعِ حاملِ قرآن

غارِ حرا کی افضلیت

عزلت گاہِ نبوی ﷺ

مکہ سے تین میل کی مسافت پر کوہِ حرا واقع ہے۔ آج سے ۱۳۴۴ برس پہلے ایامِ رمضان میں جب سخت گرمی کے دن تھے اور شدت حرارت سے ریگستان بطحاء کا ذرّہ ذرّہ تنور بن رہا تھا' اس کوہِ حرا کے ایک تیرہ وتاریک غار میں مادیاتِ عالم سے ایک کنارہ کش انسان سر بزانو تھا۔

ریاضت گاہِ نبوی ﷺ

وہ بھوکا تھا' لیکن بھوکا نہ تھا کہ اس کے پاس کھانے کی وہ چیز تھی جس کو کھا کر پھر انسان کبھی بھوکا نہیں ہوتا۔ وہ پیاسا تھا' لیکن پیاسا نہ تھا کہ اس کے پاس پینے کی وہ چیز تھی جس کو پی کر انسان کبھی پیاسا نہیں ہوتا۔ وہ تین تین چار چار دن کھانا پینا چھوڑ دیتا تھا' اس کے جاں نثار بھی اس کی محبت میں کھانا پینا چھوڑ دیتے تھے' لیکن وہ ان کو منع کرتا تھا کہ:

ایکم مثلی؟ ابیت یطعمنی ربی و یسقینی. (رواہ البخاری و مسلم فی صحیحھا)

''تم میں کون میری طرح ہے؟ میں بھوکا ہوتا ہوں تو میرا آقا مجھ کو کھلاتا ہے' میں پیاسا ہوتا ہوں تو میرا آقا مجھ کو پلاتا ہے۔'' (حدیث صحیح)

سرفرازی باری تعالیٰ

کوہِ حرا کا مقدّس عزلت نشیں اسی طرح بھوکا پیاسا سر بزانو تھا کہ ایک نورِ بے کیف نے تیرہ وتار غار کو روشن کر دیا۔ وہ نورِ بے کیف کیا تھا؟ ہدایت وفرقان کا ایک آفتاب تھا جو

مطلع حظیرۃ القدس سے طلوع ہو کر اس کے سینے میں غروب[6] ہو گیا۔

فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ. (۲:۹۷)

"بیشک وہ تیرے دل میں جاگزیں ہو گیا۔"

اور پھر اس کے سینہ سے نکل کر تمام عالم کو اس کی شعاعوں نے روشن کر دیا:

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ. (۲۱:۱۰۷)

"اور (اے پیغمبر) ہم نے تجھے نہیں بھیجا ہے، مگر اس لیے کہ تمام دنیا میں رحمت کا ظہور ہو!"

صیامِ رمضان سے مقصود؟

آفتابِ عالم تاب

وہ آفتاب جس کا مطلع حظیرۃ القدس تھا، وہ آفتاب جس کا مغرب سینہ نبویؐ تھا، وہ آفتاب جس نے عالم کو منوّر کیا، قرآن مجید تھا، جو ماہِ مقدّس کی شبِ مبارک میں آسمان سے زمین پر نازل ہونا شروع ہوا۔

ماہِ مقدّس

وہ کون سا ماہِ مقدّس تھا جس میں خدا کا کلام بندوں کو پہنچنا شروع ہوا؟ وہ ماہِ رمضان تھا:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ، هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ. (۲:۱۸۵)

"رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن اترا، جو لوگوں کے لیے سرتاپا ہدایت ہے، جو ہدایت و تمیزِ حق و باطل کی نشانی ہے!"

ہماری بھوک پیاس؟

پس ان ایام میں ہماری بھوک، ہماری پیاس، ہمارا مادیاتِ عالم سے اجتناب، اس یادگار میں ہے کہ ہم تک جو خدا کا پیغام لایا، وہ ان دنوں بھوکا اور پیاسا تھا، اور وہ تمام لذائذ مادی سے

مجتنب تھا:

فَمَنۡ شَهِدَ مِنۡكُمُ الشَّهۡرَ فَلۡيَصُمۡهُ. (۲:۱۸۵)

''پس جو اس مہینہ میں زندہ موجود ہو وہ روزے رکھے۔''

نوامیسِ نبوّت

یہ اس کا حال تھا جو کوہِ فاران[1] (کوہ حرا) کی چوٹی سے جلوہ گر ہوا تھا (محمد صلعم)۔ لیکن وہ جو سینا سے آیا (موسیٰ علیہ السلام)، وہ بھی تورات لینے کے لیے جب پہاڑ پر چڑھا تھا، وہاں چالیس روز بدلی کے درمیان خداوند کے حضور رہا تھا (خروج ۴۰۔۱۸) اسی طرح وہ بھی جو کوہِ سعیر (کوہِ زیتون) سے طلوع ہوا تھا (مسیح علیہ السلام)، اس سے پہلے کہ وہ خدا کی منادی شروع کرے، جنگل میں چالیس روز دن رات بھوکا اور پیاسا رہا تھا (متی ۴:۲)۔

پس ضرور تھا کہ وہ جو کوہِ فاران سے جلوہ گر ہونے والا تھا وہ بھی، اس سے پہلے کہ دس ہزار قدّوسیوں کے ساتھ وہ آئے، اور اس کے داہنے ہاتھ میں آتشیں شریعت ہو، وہ خداوند کے حضور بھوکا اور پیاسا رہے، تا کہ جو لکھا گیا ہے، وہ پورا ہو:

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُتِبَ عَلَيۡكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ. (۲:۱۸۳)

''مسلمانو! تم پر روزہ اسی طرح لکھا گیا ہے جس طرح تم سے پہلوں پر لکھا گیا تھا۔''

وجہ اتباعِ طریقہ محمدیہ

پس رمضان کی حقیقت کیا ہے؟ وہ ماہِ مقدّس جس میں داعی اسلام حسبِ اِتباعِ نوامیسِ نبوّت، تحمّل نزول قرآن کے لیے ضروریات مادیہ سے مستغنی رہا، اور اس لیے ضروری ہوا کہ پیروانِ ملّت اسلامیہ اور متبعین طریقت محمدیہ ان ایام میں ضروریات مادیہ عالم سے مستغنی رہیں، کہ اس توفیق و ہدایت کا شکریہ و ممنونیت اور اظہار اطاعت و عبودیت ہو، جو ان کو اس ماہ مقدس میں عطا ہوئی:

شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِىۡۤ اُنۡزِلَ فِيۡهِ الۡقُرۡاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ

بَیِّنَاتٍ مِّنَ الْھُدٰی وَالْفُرْقَانِ، فَمَنْ شَھِدَ مِنْکُمُ الشَّھْرَ فَلْیَصُمْهُ وَمَنْ کَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ، فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ، یُرِیْدُ اللّٰهُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ، وَلِتُکْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰی مَاهَدٰلکُمْ، وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ. (۲:۱۸۵)

''ماہ رمضان وہ ہے جس میں قرآن اترا، جولوگوں کے لیے ہدایت ہے، جو ہدایت اور تمیز حق و باطل کی نشانی ہے۔ پس جو اس مہینہ میں زندہ موجود ہو، وہ روزے رکھے، جو بیمار یا مسافر ہو، وہ ان کے بدلے اور دنوں میں روزے رکھ لے۔ خدا تمھارے ساتھ آسانی چاہتا ہے، سختی نہیں چاہتا، تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کر سکو (اور روزے کیوں فرض ہوئے؟) اس لیے کہ تم خدا کی بخشی ہوئی ہدایت پر اس کی بڑائی بیان کرو، نیز اس لیے کہ اس کی شکرگزاری میں سرگرم رہو!''

تشکّر نعمتِ عظیمہ واحسانِ اکبر

ہم کو صاف بتا دیا گیا کہ مفروضیّت صیام و رمضان صرف اس لیے ہے کہ ہم کو اس عطائے ناموسِ فرقان وہُدٰی (قرآن) پر خدا کا شکر بجا لائیں، اور اس کے نام کی تقدیس کریں۔ پس کون مسلم ہے جو خدا کے اس احسانِ اکبر اور نعمت عظیمہ کے شکر کے لیے تیار نہیں؟ اور اس کی تقدیس کے لیے آمادہ نہیں؟ اس کی تقدیس و تمجید میں خود کو فراموش کرو۔ اس کے کلام کی عظمت کو یاد کرو جس نے تم جیسی زار و نزار و کمزور قوم کو اپنی تسلی سے قوی کیا کہ جو پھر کبھی کمزور نہ ہوگی، جس نے ۱۳۴۴ برس ہوئے، توحید کی آگ تمھارے سینوں میں روشن کی کہ پھر کبھی نہیں بجھے گی، جس نے تمھارے سر پر تاج خیرالاممی رکھا، جو کبھی نہیں اتر سکتا۔

شبِ قدر کا بیان

عزت وحرمت کی رات

وہ کون سی شب مبارک تھی جس میں خدا کا کلام روح پرور، ایک انسان کے منہ میں ڈالا

گیا؟ وہ لیلتہ القدر یعنی عزت وحرمت کی رات تھی، بے شک وہ عزت وحرمت کی رات تھی، وہ رات تھی جو ہزار مہینوں سے بہتر تھی کہ اس میں خداوند گویا ہوا، وہ فرشتوں کی آمد کی رات تھی کہ آسمان والوں کی باتیں زمین والوں کو سنائیں۔ وہ امن وسلامتی کی رات تھی کہ اس میں دنیا کے لیے امن وسلامتی کا پیغام اترا:

اِنَّـا اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ، وَمَا اَدْرٰكَ مَالَیْلَةُ الْقَدْرِ، لَیْلَةُ الْقَدْرِ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ، تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ مِّنْ كُلِّ اَمْرٍ، سَلٰمٌ هِیَ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ. (۹۷:۱-۵)

''ہم نے قرآن کو عزت وحرمت والی رات میں نازل کیا، اور ہاں، تمھیں کس نے بتایا کہ عزت وحرمت والی رات کیا ہے؟ وہ رات جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے، جس میں ارواحِ مقدسہ اور فرشتے اذنِ خداوندی سے احکام لے کر نازل ہوتے ہیں اس رات میں طلوعِ آفتاب تک سلامتی ہے۔''

ظلمت کدہ عالم میں ایک روشن گوشہ

وہ شب کیا عجیب شب تھی! دنیا عصیان وحق ناشناسی کی تاریکی میں مبتلا تھی، دیو باطل کا تمام عالم پر استیلا تھا، توحید کا نورانی چہرہ، کفر وشرک کی ظلمت میں محجوب تھا، نیکیاں بدیوں سے شکست کھا چکی تھیں، دنیا کی تمام متمدن اور زبردست قومیں، قوت الٰہی سے بغاوت کا اعلان کر چکی تھیں، ایک نحیف وضعیف قوم بحرِ احمر کے کنارے کے ریگستانوں میں، غفلت وجہالت کے بستروں پر پڑی سو رہی تھی، لیکن اس ظلمت کدۂ عالم میں صرف ایک گوشہ تھا جو روشن تھا، وہ گوشہ غارِ حرا کا گوشہ تھا، اس بغاوت وطغیان عالم میں ایک شے تھی جو قوت الٰہی کے آگے اطاعت وتسلیم کے ساتھ سربسجود تھی، وہ عزلت نشین حرا کی جبین مبارک تھی اور ایک ہی قلب تھا جو بیدار تھا اور وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قلبِ اقدس تھا۔

تادیب عالم کے لیے نحیف وضعیف قوم کا انتخاب

یہ کیا عجیب وغریب شب تھی، جب قوموں کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا تھا، جب جبابرۂ عالم

کی تنبیہ و تادیب کے لیے ایک نحیف وضعیف قوم کا انتخاب ہو رہا تھا، جب نیکیوں کا لشکر دوبارہ مقابلہ کے لیے آراستہ کیا جا رہا تھا اور اس کی عسکری کے لیے وہ وجودِ اقدس منتخب ہو رہا تھا جو غارِ حرا کے غیر مصنوع حجرہ میں بیدار اور سر بسجود تھا' اور رحمت کے محافظ فرشتے اس کے اردگرد صف بستہ تھے۔

پُر از حکمت امور کا فیصلہ

اِنَّـا اَنْـزَلْنٰهُ فِىْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ' فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْـرٍ حَـكِيْـمٍ' اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَاط اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ' رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَط اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ. (۴۴:۳-۶)

''ہم نے اس کتابِ مبین کو ایک مبارک شب میں اتارا' کہ ہمیں انسانوں کو ڈرانا تھا۔ وہ مبارک شب جس میں پُر از حکمت امور کا ہمارے حکم سے فیصلہ کیا جاتا ہے' اور جس میں ہم نے انسانوں کے پاس اپنی رحمت سے ایک راہنما بھیجنا تھا' کیونکہ ہم پکارنے والوں کی دعائیں سنتے ہیں اور دنیا کے ذرّہ ذرّہ کا حال جانتے ہیں۔''

رحمت ہائے آسمانی کا نزول

پس یہ وہ شب ہے جس میں اقوام عالم کی قسمتوں کا فیصلہ ہوا، یہ وہ شب ہے جس میں برکاتِ ربانی کی ہم پر سب سے پہلی بارش ہوئی، یہ وہ شب ہے جب اُس سینہ میں جو خزینۂ نبوّت تھا' کلامِ الٰہی کے اسرار سب سے پہلے منکشف ہوئے اور رحمت ہائے آسمانی نے زمین میں نزول کیا۔

دعائے مسلم

پس ہر مسلم کا فرض ہے کہ وہ اس لیلۂ مبارکہ میں رحمتوں کا طالب ہو، اور اس رحمٰن و رحیم ہستی کے آگے سرِ نیاز خم کرے، جبین پُر معاصی کو زمین پر عجز و خاکساری سے رکھے اور

بصد خضوع وخشوع دستِ تضرع دراز کرے کہ خدایا:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ، کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِکَتِهٖ وَکُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ، لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ، وَقَالُوْا سَمِعْنَا، وَاَطَعْنَا غُفْرَانَکَ رَبَّنَا وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ. لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا، لَهَا مَا کَسَبَتْ وَعَلَیْهَا مَا اکْتَسَبَتْ، رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِیْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا، رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَا اِصْرًا کَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِنَا، رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَالَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ، وَاعْفُ عَنَّا، وَاغْفِرْلَنَا، وَارْحَمْنَا، اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکَافِرِیْنَ. (۲:۲۸۶)

''رسول جو کچھ اس پر نازل ہوا، اس پر ایمان لایا اور اہل ایمان بھی ایمان لائے، سب خدا پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور بلاتفریق اس کے سارے رسولوں پر ایمان لائے، اور پکار اٹھے: پروردگار! تیری باتیں سنیں، تیری اطاعت کا عہد باندھا، اب تیری مغفرت کے طالب ہیں، اور تو ہی ہمارا مرجع ہے، کسی کو تُو اس کی قوت سے زیادہ حکم نہیں کرتا اور خیر وشر سب انسان کی اپنی کمائی ہے۔ پس اے پروردگار! اگر ہم سے بھول چوک ہو، یا کوئی خطا سرزد ہو جائے۔ تو مواخذہ نہ کر۔ ہمارے رب! پہلوں کی طرح ہم کو گراں بار نہ بنا، اے ہمارے رب! ہماری طاقت سے زیادہ ہم پر بوجھ نہ ڈال، ہمیں معاف کر، ہمارے گناہ بخش، ہم پر، اے ہمارے آقا! رحم فرما اور کفار پر ہمیں غلبہ نصیب کر۔''

اِعتکاف کا بیان

اسوۂ نبویؐ

مسلمان ان ایام میں مساجد کے گوشوں میں عزلت نشین (معتکف) ہوتے ہیں کہ

غارحرا کا گوشہ نشیں بھی ان دنوں عزلت نشیں تھا۔ مسلمان ایامِ اعتکاف میں اس متکلمِ ازلی کے سوا جوان راتوں میں معتکف حرا سے گویا ہوا تھا' کسی سے نہیں بولتے کہ ایسا اس نے بھی کیا تھا جس کے منہ میں اس متکلمِ ازلی نے اپنی بولی ڈالی۔

لائحہ عمل مسلم

پس ہر مسلم آبادی میں چند نفوسِ مسلم کے لیے ضروری ہے کہ اواخر عشرہ رمضان میں مسجد کے ایک گوشہ میں شب و روز محویّت اتباعِ نبوی تلاوتِ کتابِ عزیز' تفکر خلق سماوات و ارض' ذکر نعم الٰہی' تذکرّ اسمائے حسنٰی اور تحیت و تسلیم و ادائے صلوٰۃ میں اس طرح بسر کریں کہ ان اوقات محدودہ کا کوئی لمحہ تذّکر و تفکّر سے خالی نہ ہو' تا کہ ان اشخاص مقدّسہ کا جلوہ اس کی آنکھوں میں پھر جائے۔

(۱) اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِھِمْ. (۱۹۱:۳)

''وہ ارباب دانش جو کسی حال میں بھی اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہوتے' وہ ہمیشہ اٹھتے بیٹھتے (ہر وقت) خدا کو یاد کرتے ہیں۔''

(۲) اَلَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِھَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّھِمْ وَھُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ' تَتَجَافٰی جُنُوْبُھُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ' یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا. (۱۶:۳۲)

''وہ جو،قرآن کی آیتیں جب ان کو یاد دلائی جاتی ہیں تو وہ سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور خضوع و خشوع کے ساتھ اپنے رب کی حمد و ثنا کرتے ہیں،ان کے پہلو راتوں کو بستروں سے الگ رہتے ہیں اور وہ امید و بیم کی حالت میں خدا سے دعائیں کرتے ہیں۔''

(۳) رِجَالٌ لَّا تُلْھِیْھِمْ تِجَارَۃٌ وَّ لَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ. (۳۷:۲۴)

''جن کو خرید و فروخت اور دنیاوی اشغال ذکر خدا سے غافل نہیں کرتے۔''

بناءِ مساجد کی غرض

اسماعیل وابراہیم علیہما السلام کی سب سے پہلی مسجد جن اغراض کے لیے تعمیر ہوئی'ان میں ایک غرض یہ بھی تھی کہ وہ عزلت گزینان عبادت کا مسکن ہو:

وَعَهِدْنَا اِلَى اِبْرَاهِيمَ وَاِسْمٰعِيلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ. (۲۔۱۲۵)

''ہم نے ابراہیمؑ واسماعیلؑ سے عہد لیا کہ وہ میرے گھر کو طواف، اعتکاف، رکوع اور سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھیں۔''

خلاصۂ مضمون

پس اے فرزندانِ اسماعیل وابراہیم، اپنے باپ کے عہد کو یاد کرو اور جس گھر کو رکوع و سجود کے لیے پاک رکھتے ہو، اسے اعتکاف کے لیے بھی پاک رکھو کہ تمھارے باپ اسماعیلؑ اور ابراہیمؑ کا عہد، خداوند کے حضور جھوٹا نہ ہو۔

قیامِ رمضان کا بیان

معتکف حرا کی تمثیل

کیا عجیب وہ جوشِ محویت ہے جب مسلمان دن بھر کی بھوک اور پیاس کے بعد رات کو خدا کی یاد کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں' اللہ! اللہ! وہ تکلیف جو راحت قلبی کا باعث ہو' معتکف حرا بھی اسی طرح خدا کی یاد کے لیے رات بھر کھڑا رہتا تھا کہ خدا کی ہدایت کا شکریہ بجالائے۔ یہاں تک کہ اس کے پاؤں میں ورم آ جاتا تھا۔

شیفتگان سنت محمدیہؐ

پس شب کو جب عالم سنسان ہے، اور دنیا کا ذرّہ ذرّہ خاموش اور محوخواب شیریں ہے، آؤ شیفتگانِ سنت محمدیہ! کہ ماہ مقدس آیا، ہم اپنے بستروں کو خالی کریں، خدا کی

تقدیس میں مشغول ہوں اور اس کی حمد وثنا کریں، جس نے اس ظلمت کدۂ عالم میں ہمیں ایک ایسا چراغ بخشا، جس سے ہمارے قلوب منور ہو گئے۔

چراغ تقدیس

سُبْحَانَ ذِی الْمُلْکِ وَالْمَلَکُوْتِ سُبْحَانَ ذِی الْعِزَّۃِ وَالْعَظْمَۃِ وَالْھَیْبَۃِ وَالْقُدْرَۃِ وَالْکِبْرِیَاءِ وَالْجَبَرُوْتِ، سُبْحَانَ الْمَلِکِ الْحَیِّ الَّذِیْنَ لَا یَنَامُ وَلَا یَمُوْتُ اَبَدًا اَبَدًا، سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ، رَبُّنَا وَرَبُّ الْمَلٰئِکَۃِ وَالرُّوْحِ.

''تقدیس ہو حکومت وشہنشاہی والے کی' تقدیس ہو عزت، عظمت، ہیبت، قدرت، کبریائی اور جبروت والے کی، تقدیس ہو اس زندہ بادشاہ کی جو نہ کبھی سوتا ہے، وہ ہمیشہ سے زندہ ہے اور ہمیشہ رہے گا، پاک، قدوس، ہمارا آقا اور تمام فرشتوں اور روحوں کا آقا!''

اعمال وحقیقت صوم

اسلام کی عیدِ اکبر

ہم نے فصول سابقہ میں بتلایا ہے کہ ماہ صیام کی اصل حقیقت نزول قرآن کی یادگار و تذکار اور حامل قرآن علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اسوۂ حسنہ اور سنّتِ مستحسنہ کی اتباع وتقلید ہے، کہ ان ایام میں آپؐ اسی طرح غار حرا میں قیام فرماتے تھے اور اسی اثنائے ایام میں وہ نامہ خیر و برکت اور دستور ہدایت وقرآن ہمیں عنایت ہوا، جس سے ہم نے جسم کی زندگی اور روح کی تسلی پائی۔ پس یہ یوم اکبر یعنی یوم نزول قرآن، جو لیلۃ القدر ہے، اسلام کی عید اکبر ہے اور حق ہے کہ تمام بندگان اسلام اور شیفتگانِ اسوۂ محمدیہ ان ایامِ مقدّسہ میں وہ زندگی بسر کریں جو قرآن کا مطلوب اور حاملِ قرآن کا نمونہ ہو۔

نتائج ثلاثہ صوم

قرآن مجید نے حکمِ صیام کے موقع پر جیسا کہ آیات سرعنوان میں مذکور ہے، ہم کو صوم کے تین نتائج کی اطلاع دی ہے:

(۱) لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔ تاکہ تم متقی ہو۔

(۲) وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَاهَدٰكُمْ.

تاکہ تم اس عطائے ہدایت پر خدا کی تکبیر وتقدیس کرو۔

(۳) وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ.

تاکہ تم اس نزولِ خیر وبرکت اور اس عطائے فرقان پر خدا کا شکر بجالاؤ۔

اس سے ثابت ہوا کہ صوم کی حقیقت تین اجزا سے مرکب ہے: اتقا، تکبیر و تقدیس اور حمد وشکر۔

فقدانِ صوم

پس جس طرح حقیقت مرکبہ کا وجود عین اجزا کا وجود ہے کہ بغیر وجودِ اجزا حقیقت معدوم، اسی طرح صوم بغیر وجود اجزائے ثلاثہ مذکورہ معدوم ومفقود ہے۔

نتائج اعمال کی امثلہ

اعمال انسانیہ کا وجود حقیقی ان کے نتائج وآثار کا وجود ہے۔ اگر نتائج وآثار وجود پذیر نہ ہوئے، تو یہ نہ کہو کہ ان اعمال کا وجود تھا۔ اگر ہم دوڑتے ہیں کہ مسافت قطع اور منزل قریب ہو، لیکن ہم بھٹک کر دوسرے راستے پر جاپڑتے ہیں، جس سے ہماری مسافت دورتر اور منزل بعیدتر ہوتی جاتی ہے تو ہماری سعی لاحاصل اور ہماری تگاپو عبث ہے۔ اگر ایک طبیب اپنے مریض کے لیے ایک دوا تجویز کرتا ہے لیکن جس فائدہ کے مترتّب ہونے کی امید کرتا ہے، وہ مترتّب نہیں ہوتا، تو یہ نہ سمجھو کہ طبیب نے دوا تجویز کی نہ ہی یہ کہو کہ مریض نے دوائی کھائی۔

مفہوم صوم و فاقہ کشی

پس صیام جو ہمارا علاجِ روحانی ہے، اگر اس سے شفائے روحانی حاصل نہ ہو تو حقیقت میں وہ صیام نہیں، فاقہ ہے اور ایسے صائم اور روزہ دار، جن کے صوم میں اتقاء، تقدیس اور شکر کے عناصرِ ثلاثہ نہیں، وہ فاقہ کش ہیں، جن کی تشنگی اور گرسنگی ایک پھول ہے جس میں رنگ و بو نہیں، ایک گوہر ہے جس میں آب نہیں، ایک آئینہ ہے جس میں جوہر نہیں اور ایک جسم ہے جس میں روح نہیں۔ اور کون نہیں جانتا کہ ایک گل بے رنگ و بو، ایک گوہر بے آب، ایک آئینہ بے جوہر، ایک جسم بے روح، بے حقیقت ہستیاں ہیں، جن کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

رُبَّ صائم لیس لہ من صیامہ الا الجوع' و رُبَّ قائم لیس لہ من قیامہ الا السھر (رواہ ابن ماجہ)

''کتنے روزہ دار ہیں، جن کو روزہ سے بجز گرسنگی کچھ حاصل نہیں، اور کتنے تہجد گزار ہیں جن کی نمازِ تہجد سے بیداری کے سوا کچھ فائدہ نہیں۔''

یہ کون لوگ ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کے جسم نے روزہ رکھا، لیکن دل نے روزہ نہیں رکھا۔ ان کی زبان پیاسی تھی، لیکن دل پیاسا نہ تھا، پس رحمت کا کوثر ان کے لیے نہیں کہ پیاسے نہ تھے۔

نظام الاوقاتِ زندگی

ہماری تقسیمات اوقات زندگی کی سب سے بڑی اور طویل تقسیم خود ہماری عمر اور سب سے مختصر لحظہ ہے۔ ہمارے لیے ہر لحظہ ایمان باللہ بما جاء الرسول، ہر روز پانچ بار سجدۂ نیاز، ہر ہفتہ نمازِ جمعہ، ہر سال صیامِ رمضان و زکوٰۃ اور عمر میں ایک بار زیارت مسجدِ خلیل و ادائے نماز ابراہیمی فرض ہے۔

سالانہ دو فرض

ہمارے سالانہ فرض دو ہیں، ایک جسمانی اور ایک مالی۔ فریضہ مالی (زکوٰۃ) محدود

باوقات مخصوصہ نہیں ہے لیکن ہمارا فریضہ جسمانی محدود باوقات ہے۔ پہلے سے خدا کی مسکین مخلوق ہر ساعت اور ہر حالت میں متمتع ہوتی ہے اور دوسرے سے وہ عام یک رنگی اور اظہار اجتماع و وحدت قلوب و اجسام متصور ہے، جو ہر روز مساجد میں' اور ہر سال ہر شہر کے کوچہ و بازار اور گھروں میں اور عمر میں ایک بار کوہِ فاران کے دامن میں نظر آتی ہے۔

کامل زندگی منزّہ و طاہر

پس ہمارے سال کا ایک مہینہ ہماری زندگی کا ایک ایسا حصہ ہونا چاہیے جو تنزّہِ جسم اور طہارتِ قلب کا کامل نمونہ ہو' تا کہ ہمارا کامل سال منزّہ اور طاہر ہو اور اس طرح ہماری کامل زندگی منزہ اور طاہر ہو۔ اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

مـن صـام رمـضـان ایماناً و احتساباً ، غفر لهٗ ماتقدّم من ذنبهٖ (رواہ البخاری)

''جس نے رمضان کے روزے ایمان اور احتساب کے ساتھ رکھے۔ اس کے اگلے گناہ معاف ہوئے۔''

مشروط معافی نامہ

گناہوں کی معافی اور مغفرت کا حصول، تمام اعمالِ انسانیہ کا مقصودِ وحید اور تمام نیکیوں اور برکتوں کا اساس کار ہے۔ لیکن کیا جس نے حصولِ مغفرت اور گناہوں کی معافی کی امید دلائی' اس نے یہ نہیں بتایا ہے کہ وہ مشروط بایمان و احتساب ہے۔

ایمان و احتساب کیا شے ہے؟ حقیقت صوم کے وہی عناصرِ ثلاثہ ہیں جن کی طرف کتابِ عزیز نے اشارہ کیا ہے۔ یعنی اتقاء، تقدیس و تکبیر اور حمد و شکر۔

ماہیتِ صوم

اتقاء کے لغوی معنی کسی چیز سے بچنے کے ہیں لیکن اسلام کی اصطلاح میں ''اتقا'' کے کیا معنی ہیں؟ تمام دنیاوی آلائشوں سے، تمام انسانی کمزوریوں سے، تمام جسمانی خواہشوں سے اور تمام نفسانی نجاستوں سے جسم و روح کا محفوظ رکھنا'' یہی حقیقت و ماہیت

صوم ہے، جس کے ساتھ ساتھ دل سے تقدیس و تکبیر کی صدائے غیر محسوس اور زبان سے حمد و شکر کی آوازِ جہر بلند ہونی چاہیے، تا کہ معتکف حراء کے اسوۂ حسنہ کا کامل اتباع ہو۔

ناقضانِ صوم

تم سمجھتے ہو کہ آلودگی، گناہ، آلائش ہویٰ اور ارتکابِ عصیان و نجاساتِ نفسانی، ناقضِ صوم نہیں؟ ممکن ہے کہ جسم کا روزہ نہ ٹوٹتا ہو، لیکن دل کا روزہ تو ضرور ٹوٹ جاتا ہے، اور جب دل ٹوٹا تو جسم میں کیا رکھا ہے؟

الصائم فی عبادة من حین یصبح الیٰ ان یمسی مالم یغتب، فاذا اغتاب خرق صومه. (رواہ الدیلمی)

''روزہ دار صبح سے شام تک عبادت خدا میں ہے، جب تک کسی کی برائی نہ کرے اور جب وہ برائی کرتا ہے تو اپنے روزے کو پھاڑ ڈالتا ہے۔''

ارشادِ نبوی

تم سمجھتے ہو کہ بغاوتِ نفس، اطاعتِ ہویٰ اور عملِ شر، منافیٔ صوم نہیں، لیکن میں تمہیں سچا سمجھوں یا اس کو (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو) جو کہتا ہے:

لیس الصیام من الاکل والشرب انما الصیام من اللغو والرفث (رواہ الحاکم فی المستدرک والبیهقی فی السنن)

''روزہ کھانے پینے سے پرہیز کا نام نہیں ہے بلکہ لغو و عملِ شر سے پرہیز کا نام ہے۔'' (حاکم نے مستدرک میں اور بیہقی نے اپنے سنن میں روایت کیا)

کیا تم سمجھتے ہو کہ قولِ زُور، عملِ بد اور طغیانِ قلب، مضر صحت صوم نہیں؟ لیکن میں کیا کروں کہ مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ آواز سنتا ہوں، جس کی میں تکذیب نہیں کرسکتا۔

من لم یدع قول الزور والجهل والعمل به فلا حاجة للّٰه ان یدع طعامه و شرابه. (رواہ البخاری والترمذی والنسائی وابن ماجة واللفظ له)

ہے۔ طغیاں ہونے سے بچاتا ہے اور خبثِ عمل سے بچاتا ہے، کیونکہ روزہ کی جزا خود خدا ہے، اور وہ خیرِ محض اور نیکی خالص ہے۔

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: قال اللّٰہ تعالٰی کل عمل ابن اٰدم لہٗ الا الصّیام فانہ لی و انا اجزی بہ و الصّیام جُنّة. (رواہ البخاری)

''(حدیث قدسی میں) رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ خدا نے فرمایا: انسان کا تمام عمل اس کے لیے ہے، لیکن روزہ میرے لیے ہے، میں اس کی جزا ہوں اور روزہ سپر ہے۔''

مبارک باد

پس مبارک ہے وہ جو اس سپر کو لے کر کارزارِ اعمال میں آتا ہے، کہ وہ حملۂ نفس سے زخمی نہ ہوگا، مبارک ہے وہ جو ان ایام میں بھوکا رہتا ہے کہ وہ آسودہ ہوگا۔ مبارک ہے وہ جو ان ایام میں پیاسا رہتا ہے کہ وہ سیراب ہوگا: سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ رَبُّنَا وَرَبُّ الْمَلٰئِكَةِ وَالرُّوْحِ.

تیّسراتِ صوم

مقصودِ عباداتِ اسلام وغیرِ اسلام

احکامِ صیام بمذاہبِ دیگر؟

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ. (۱۸۵:۲)

''خدا تمھارے ساتھ آسانی چاہتا ہے، سختی نہیں کرنا چاہتا۔''

آیتِ عنوان اس موقع کی آیت ہے جہاں خدائے پاک نے صیام کا حکم دیا ہے۔ لوگ

''جو حالت صوم میں کذب وزور اور جہالت کے کام کو نہیں چھوڑتا تو خدا کو کوئی ضرورت نہیں کہ روزہ دار اس کے لیے بیکار اپنا کھانا پینا چھوڑ دے!''

حالت ملکوتی کا ظہور

پس اچھی طرح سمجھ لو کہ صوم کی حقیقت کیا ہے؟ وہ ایک حالتِ ملکوتی کے ظہور کا نام ہے۔ صائم کا جسم انسان ہوتا ہے، لیکن اس کی روح فرشتوں کی زندگی بسر کرتی ہے، جو نہ کھاتے اور نہ پیتے ہیں، وہ تمام مادیاتِ عالم سے پاک اور ضروریاتِ دنیاوی سے منزّہ ہیں۔ ان کی زندگی کا فقط ایک مقصد ہوتا ہے: اطاعتِ اوامرِ الٰہی، اس لیے صائم نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے۔ وہ مادیات سے پاک اور ضروریات دنیاوی سے منزہ رہنے کی، جہاں تک اس کی خلقت وفطرت اجازت دیتی ہے، کوشش کرتا ہے۔

اِنِّیْ صَائِمٌ

صائم مجسّم نیکی ہے، وہ کسی کی غیبت نہیں کرتا، وہ کسی کو برا نہیں کہتا، وہ کسی سے جہالت نہیں کرتا، وہ بدی کا بدلہ بدی سے نہیں دیتا ہے، وہ اس کا امتثال امر کرتا ہے جو کہتا ہے (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم):

اذا کان یوم صوم احدکم فلا یرفث ولا یصخب فان سابّه احد اوقاتله فلیقاتل انی امرؤ صائم. (رواه البخاری)

''تم میں سے جب کسی کے روزے کا دن ہو تو نہ بدگوئی کرے نہ شور وغل کرے۔ اگر کوئی اسے برا کہے، یا اس سے آمادہ شمشیر زنی ہو تو اس سے کہہ دے کہ میں روزے سے ہوں۔''

روزہ سپر ہے

اللہ اکبر! وہ ہستیاں کہاں ہیں، جو تلوار کا وار روزہ کی سپر پر روکتی تھیں؟ روزہ سپر ہے، بے شبہ سپر ہے، وہ آخرت میں حملہ جہنم سے بچاتا ہے اور دنیا میں بغاوت نفس سے بچاتا

پوچھیں گے کہ صیام جیسے سخت اور مشکل العمل حکم میں خدا نے کیا آسانیاں ملحوظ رکھی ہیں؟ جواب سے پہلے یہ جان لینا چاہیے کہ دوسرے مذاہب میں روزے کے کیا احکام ہیں؟

عبادت بمعنی تعذیبِ جسمانی

انسان جسم اور روح سے مرکب ہے' اس بناء پر اس کی عبادت بھی جسم و روح سے مرکب ہونی چاہیے' لیکن چونکہ اصل مقصود طہارتِ روح ہے نہ تکلیفِ جسم' اس لیے تکلیف جسم کو اس قدر شدید اور ناقابلِ عمل نہیں بنا دینا چاہیے کہ وہ اصل مقصود قرار پا جائے۔

تقرب الی اللہ کا راستہ؟

اسلام اور دوسرے مذاہب میں ایک مختلف فیہ مسئلہ یہ بھی ہے کہ دوسرے مذاہب نے تکلیف و تعذیب جسمانی کو بھی ایک قسم کی عبادت بتایا ہے۔اس تخیل کا اثر یہ ہے کہ ہندو جوگیوں نے ریاضت شاقہ کی اور عجیب وغریب ورزش جسمانی کی بنیاد ڈالی؛ جس میں سالہا سال تک کھڑے رہنا، شدید دھوپ میں قیام کرنا، گرمی کے دنوں میں آگ کے شعلوں کے دائرہ میں بیٹھنا، جاڑوں میں برہنہ تن رہنا، دس دس برس تک ایک ہاتھ کو ہوا میں بلند رکھنا، سالہا سال تک ایک نشست پر قائم رہنا، ایک ایک چلہ تک ترکِ اکل وشرب کرنا، یہ سب اُن کے لیے تقرب الی اللہ کے حقیقی راستے تھے۔

جین و بدھ مت کی ابتدا

یہیں جینیوں کا فرقہ پیدا ہوا ہے' جو ناک' کان اور منہ کو بھی بند رکھتا ہے کہ کسی کیڑے کو اذیّت نہ ہو۔یہیں بدھ کا فرقہ پیدا ہوا' جس کے بھکشو جنگل اور پہاڑوں میں رہتے تھے' جو گھاس اور پتوں پر اور بھیک کے ٹکڑوں پر گزر کرتے تھے۔ ہندو جوگی چلے کھینچتے تھے' جن میں کھانا پینا بالکل چھوڑ دیتے تھے۔کبھی کبھی ایک دو لُقمے کھا لیتے تھے۔

نصرانی زہد وتقویٰ

نصرانی راہبوں نے رہبانیّت کی بنیاد ڈالی؛ جس کی رو سے شرعی بیاہ ان پر حرام ہوا۔ ترک آسائش ولذائذ جسمانی ان کی مرغوب عبادت تھی۔قربان گاہ صلیب اور کنواری کے بت کے سامنے

گھٹنوں کے بل، گھٹنوں تک جھکے رہنا، ہاتھ جوڑے ایک پاؤں پہ کھڑے رہنا، خاص خاص قسم کی تکلیف دہ ریاضتوں میں مشغول رہنا، کئی کئی روز کھانا پینا چھوڑ دینا، گویا زہد و تقویٰ کی انتہا تھی۔

یہودی قیود و پابندیاں

یہودیوں کے ہاں قربانی اس قدر طویل و کثیر رسوم پر مشتمل تھی۔ جس کے صرف شرائط و ضروریات کا بیان تورات کے چار پانچ صفحوں میں مذکور ہے۔ روزوں میں افطار کے بعد صرف ایک وقت کھا سکتے تھے اس کے بعد سے دوسرے روز کے وقتِ افطار تک کچھ نہیں کھاتے تھے۔ بغیر کھائے ہوئے اگر بدقسمتی سے نیند آ گئی تو پھر کھانا مطلق حرام تھا۔ ایام صیام میں بیویوں سے نہیں مل سکتے تھے۔

اسلام کی ہمہ گیر آسانی

خلافِ منشائے دین

لیکن اسلام اس تعذیب جسمانی اور ان ریاضت ہائے شاقہ کو خلاف منشائے دین سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ چیزیں انسانیت کی ضعیف گردن کے لیے بارگراں ہیں، جن کو وہ نہیں اٹھا سکتیں۔ قرآن نے بندوں کو یہ دعا تعلیم کی ہے:

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا، رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَالَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ. (۲:۲۸۶)

''خدایا! ہم پر ویسی بندشوں اور گرفتاریوں کا بوجھ نہ ڈالیو جیسا ان لوگوں پر ڈالا جو ہم سے پہلے گزر چکے ہیں! اے پروردگار! ایسا بوجھ ہم سے نہ اٹھوائیو جس کے اٹھانے کی ہم میں سکت نہیں۔''

داعیِ حق کی تلقین

چنانچہ خدا نے یہ دعا قبول کی اور ایک پیغمبر بھیجا جس کی شان یہ تھی۔

يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ

الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلَالَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ. (۷:۱۵۷)

''وہ (یہود و نصاریٰ کو) نیکیوں کا حکم کرتا ہے، برائیوں سے ان کو روکتا ہے، پسندیدہ چیزیں ان کے لیے حلال کرتا ہے، اشیائے خبیثہ کو ان پر حرام کرتا ہے اور ان کی گردنوں سے شدید احکام کی زنجیریں علیحدہ کرتا ہے اور انہیں ان پھندوں سے نکالتا ہے جن میں وہ گرفتار تھے۔''

بشارتِ الٰہی

اور اس نے وعدہ کیا!

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا. (۲:۲۸۶)

''خدا کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ کسی امر کا مکلف نہیں کرتا۔''

اور پھر فرمایا:

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ. (۲:۱۸۵)

''خدا تمھارے ساتھ آسانی چاہتا ہے، سختی نہیں چاہتا۔''

تحدید اوقاتِ صوم

اسلام نے سب سے پہلے اوقاتِ صیام کی تحدید کی۔ بعض لوگ شدت اتقاء سے عمر بھر روزے رکھتے تھے' اسلام نے اس سے بالکل روک دیا' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

لَا صَامَ مَنْ صَامَ الْاَبَدَ. (ابن ماجه)

جس نے ہمیشہ روزہ رکھا' اس نے (گویا) کبھی روزہ نہیں رکھا۔

تعیینِ مدت صوم

اسلام کے سوا اور ادیان میں شب و روز کا روزہ ہوتا تھا۔ اسلام نے روزہ کی مدت صرف صبح سے شام تک قرار دی:

حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ. (۲:۱۸۷)

''اس وقت سے جب رات کا تاریک خط صبح کے سپید خط سے ممتاز ہو جائے (یعنی ابتدائے شب تک روزے کو پورا کرو)۔''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صاف فرمایا ہے:

انما يفعل ذلك النصارىٰ يعنى الوصال ولكن صوموا كما امركم اللّٰه: ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى اللَّيْلِ فان كان الليل فافطروا. (الطبرانی)

''شب وروز کو ملا کر نصاریٰ روزہ رکھتے ہیں' تم اس طرح روزہ رکھو جس طرح خدا نے فرمایا ہے کہ روزہ رات کے ہونے تک پورا کرو اور جب رات شروع ہو جائے تو افطار کر لو۔''

رات کو کھانے کا جواز

رات کو سو جانے کے بعد پھر کھانا حرام تھا' اسلام نے اس کو منسوخ کیا:

روى البخارى: كان اصحاب محمد صلى اللّٰه عليه وسلم اذا كان الرجل منهم صائما فحضر الافطار فنام قبل ان يفطر لم ياكل ليلته ولا يومه حتى يمسى وان قيس بن صومة الانصارى كان صائما فلما حضر الافطار اتى امراته فقال لها اعندك طعام؟ قالت لا ولكن انطلق فاطلب لك وكان يومه يعمل فغلبته عينه فجائته امرته فلما رأته قالت خيبة لك فلما انتصف النهار غشى عليه' فذكر ذلك للنبى صلعم...... فنزلت: ''وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ

الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ." (۲:۱۸۷)

''بخاری کی روایت ہے کہ صحابہؓ ابتدائے اسلام میں جب روزہ رکھتے اور افطار کا وقت آ جاتا اور وہ افطار کرنے سے پہلے سو جاتے تو پھر رات بھر اور دن بھر دوسرے دن کی شام تک کچھ نہ کھاتے۔ اسی اثناء میں قیس بن صومہ انصاری نام کے ایک صحابی روزہ سے تھے۔ افطار کا وقت آیا تو وہ اپنی بیوی کے پاس آئے اور ان سے پوچھا کہ تمھارے پاس کچھ کھانے کو ہے؟ انھوں نے کہا ہے تو نہیں۔ لیکن میں چل کر ڈھونڈتی ہوں' قیسؓ دن بھر کام کر کے تھکے ہوئے تھے سو گئے' بیوی آئیں تو افسوس کر کے رہ گئیں' جب دوپہر ہوئی تو قیس کو غش آ گیا' یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیان کیا گیا۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: ''اس وقت تک کھاؤ پیؤ جب تک رات کا تاریک خط صبح کے سپید خط سے ممتاز نہ ہو جائے۔''

مقاربت کی اجازت

ایام جاہلیت میں دستور تھا کہ ایام صیام کی پوری مدت میں مقاربت سے محترز رہتے تھے۔ لیکن چونکہ یہ ممانعت خلافِ حکمِ فطری تھی' اس لیے اکثر لوگ اس میں خیانت کے مرتکب ہوتے تھے۔ اسلام نے اس حکم کو صرف وقت صوم تک محدود رکھا' جو صبح سے شام تک کا زمانہ ہے۔

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآءِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ، عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ، فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَ عَفَا عَنْكُمْ، فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ. (۲:۱۸۷)

''تمھارے لیے روزہ کی شب میں اپنی بیویوں سے مقاربت حلال کی گئی ہے' تمھارا ان کا ہمیشہ کا ساتھ ہے۔ خدا جانتا ہے کہ تم اس معاملہ میں خیانت کرتے تھے' پس اس سے تم کو معاف کیا اب ان سے ملو جلو' اور خدا نے تمھاری قسمت

میں جولکھا ہے اس کو ڈھونڈو۔''

تفسیر البخاری

بخاریؒ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

عن البراء بن عازبؓ لما نزل صوم رمضان کانوا لا یقربون النساء رمضان کله' وکان رجال یخونون انفسهم فانزل اللّٰه: عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَاعَنْكُمْ'' (۲:۱۸۷)

''براء بن عازبؓ سے روایت ہے کہ جب صوم رمضان کا حکم نازل ہوا تو لوگ رمضان بھر بیویوں کے پاس نہیں جاتے تھے' بعض لوگ اس میں خیانت کرتے تھے۔ تو خدا نے فرمایا: ''خدا جانتا ہے کہ تم خیانت کرتے تھے' پس اس نے تم کو معاف کیا۔''

روزے کی معافی

روزہ داروں میں بوڑھے' کمزور' معذور' بیمار' ہر قسم کے لوگ ہوتے تھے۔ اسلام سے پہلے کے مذاہب میں ہم اس قسم کے معذور اصحاب کے لیے کوئی استثناء نہیں پاتے' اسلام نے ان تمام اشخاص کو مختلف طریق سے مستثنیٰ کر دیا:

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ' وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ. (۲:۱۸۴)

''جو بیمار ہو یا مسافر ہو، وہ ایام رمضان کے علاوہ اور دنوں میں قضا روزے رکھ لے اور جو بمشکل روزے رکھ سکتے ہیں، وہ ہر روزہ کے بدلے ایک دن کا کھانا ایک مسکین کو دے دیں۔''

فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا

لیکن اس ممانعت میں اس نے اس قدر غلو نہیں کیا کہ اگر بایں ہمہ حالاتِ ضعف وعذر'

طالبان رضوان الٰہی روزے کا ثواب حاصل کرنا چاہیں تو نہ کرسکیں، بلکہ اس کو ان کی مرضی پر موقوف رکھا:

فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ، وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ. (۲:۱۸۴)

''جو اپنے دل سے کوئی نیک بات کرے تو بہتر ہے، اور روزہ رکھنا بہتر ہے، اگر تمھیں علم ہو۔''

روزہ کب موجبِ ثواب نہیں؟

حالت سفر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روزے بھی رکھے ہیں اور افطار بھی کیا ہے۔ حسبِ اختلاف حالات، لیکن اگر کوئی شخص باوجود ضعف وعدمِ تحمل شدائدِ صوم، سفر میں روزے رکھے، تو اسلام میں یہ ثواب کا کام نہیں شمار ہوگا۔

عن جابر بن عبداللہؓ، قال کان رسول اللہ صلعم، فی سفر فری زحاما و رجلاً قد ظل علیه فقال ماھٰذا؟ فقالوا صائم، فقال لیس من البر الصوم فی السفر. (بخاری)

''جابر بن عبداللہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلعم ایک سفر میں تھے تو ایک بھیڑ دیکھی اور دیکھا کہ ایک آدمی کو سایہ کیے ہوئے لوگ کھڑے ہیں۔ پوچھا کیا ہے؟ لوگوں نے کہا ایک روزہ دار ہے۔'' آپؐ نے فرمایا: سفر میں اس طرح روزہ رکھنا کوئی نیکی نہیں ہے۔''

عورتوں کا روزہ بحالتِ عذرات

عورتوں کے لیے مخصوص فطری عذرات کا لحاظ ضروری تھا، اس لیے ایامِ عادیہ، ایامِ حمل اور ایامِ رضاعت میں ان کے روزے معاف ہیں کہ وہ ضعف وناتوانی کے ایام ہیں، ان کے بجائے ان کی قضا وہ اور دنوں میں کرسکتی ہیں۔

قال النبی صلعم: الیس اذا حاضت لم تصل ولم تصم؟ (البخاری)

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: کیا عورت ان ایام میں نماز اور روزہ نہیں چھوڑ دیتی؟''

عن ابن عباسؓ و علی الذین یطیقونہ فدیة طعام مسکین' قل کانت رخصت للشیخ الکبیر والامراۃ الکرۃ وھما یطیقان الصوم ان یفطروا و یطعما مکان کل یوم مسکینا والحبلی والمرضع اذا خافتا. (ابو داؤد)

''ابن عباسؓ سے مروی ہے...... کہ حاملہ اور دودھ پلانے والی اگر اپنے ضعف کا اس کو خوف ہو یا بچہ کا خوف ہو تو روزے نہ رکھے اور فدیہ دے دے۔''

عن انسؓ' قال النبی صلعم: ان اللّٰہ وضع من الحامل والمرضع الصوم. (ترمذی)

''حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: حاملہ اور مرضع (دودھ پلانے والی) کے روزے معاف کیے گئے ہیں۔''

بھول چوک معاف

بھول چوک اور خطا ونسیان اسلام میں مغفور ہیں کہ خدا نے ہمیں بتلایا ہے کہ کہو:

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا. (۲۸۶:۲)

''پروردگار! ہمارے نسیان وخطاء پر ہمیں مواخذہ نہ کر۔''

اس لیے اگر حالت صوم میں کوئی بھول کر کچھ کھالے یا پی لے، تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

عن ابی ھریرۃ رضی اللّٰہ قال جاء رجل الی النبی صلعم فقال: یا رسول اللّٰہ! انی اکلت و شربت ناسیاً و انا صائم' فقال اطعمک اللّٰہ وسقاک. (ابو داؤد)

''ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور کہا' یا رسول اللہ! میں نے بھول کر روزے کی حالت میں کھا پی لیا

ہے۔آپؐ نے فرمایا: کچھ حرج نہیں تمھیں خدا نے کھلایا اور پلایا ہے۔''

عن ابی هريرةؓ قال النبی صلعم: من اكل اوشرب ناسيًا فلا يفطر فانما هو رزق اللّٰه. (ترمذی)

''ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: جو بھول کر کھالے یا پی لے تو اس کا روزہ نہیں ٹوٹتا' وہ خدا کی روزی ہے۔''

عذر قابلِ معافی

اسی طرح وہ افعال جو گو منافی صوم ہیں، لیکن انسان سے قصداً سرزد نہیں ہوئے، بلکہ وہ اس میں مجبور ہے، مثلاً محتلم ہو جانا' بلا قصد قے ہو جانی، ان چیزوں سے بھی نقضِ صوم نہیں ہوتا:

عن ابی سعيدؓ ثلاث لا يفطرن الصائم: الحجامة والقی والاحتلام. (ترمذی)

''حضرت ابوسعیدؓ سے مروی ہے کہ تین چیزوں سے روزہ نہیں ٹوٹتا: پچھنا یا سنگی کھنچوانے سے' قے ہونے سے اور احتلام ہو جانے سے۔''

من ذرعه القی فی شهر رمضان فلا يفطر و من تقيا عامد فقد افطر. (ابو داؤد)

''جس کو خود بخود روزہ میں قے ہو جائے تو روزہ نہیں ٹوٹے گا' البتہ جو قصداً قے کرے گا اس کا روزہ ٹوٹ جائے گا۔''

عن رجل من اصحاب النبی صلعم قال قال رسول اللّٰه صلعم' لا يفطر من قاء ولا من احتلم ولا من احتجم. (ابو داؤد)

''ایک صحابی سے روایت ہے: آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''قے، احتلام ہو جانے اور پچھنے سے روزہ نہیں جاتا۔

من ذرعه القی وهو صائم فليس عليه قضاء و من استقاء

فلیقض (رواہ ابو داؤد والترمذی و ابن ماجہ و الحاکم)

''جس کو خود بخود روزہ میں قے ہو اس پر اس کی قضا نہیں ہے (یعنی روزہ صحیح ہو گا) اور جو قصداً قے کرے اس پر قضا ہے۔''

استفراغ و قے کا حکم

بعض لوگ اس حدیث کی بنا پر کہ ایک بار آپ کو استفراغ ہوا تو آپؐ نے روزہ توڑ دیا' یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ استفراغ و قے ناقضِ صوم ہے' حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ آپؐ نے نفل روزہ رکھا تھا۔ اتفاقی استفراغ سے بنظرِ ضعف آپؐ نے روزہ توڑ دیا۔ امام ترمذیؒ لکھتے ہیں:

وروی عن ابی الدرداء و ثوبان و فضالة ان النبی صلعم قأ فافطر و انما معنی هذا الحدیث ان النبی صلعم کان صائمًا متطوعًا فقاء فضعف فافطر لذٰلک' هکذا روی فی بعض الحدیث مفسرًا. (جامع ترمذی)

''ابودرداء' ثوبان اور فضالہ سے روایت ہے کہ آپؐ نے قے کی پھر افطار کیا۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ نفل روزہ سے تھے' اس میں آپؐ کو قے ہوئی اور آپؐ کو ضعف محسوس ہوا تو روزہ توڑ دیا' اسی تفصیل کے ساتھ یہ واقعہ بعض روایتوں میں مذکور ہے۔''

تذکارِ انقلابِ عظیم الشان

مناظرِ قدرت وتغیراتِ کائناتِ ہستی

تغیر وتجدّد کا محشرستان

دنیا ایک تماشا گاہِ حوادث ہے' جس کے مناظر دمبدم متغیّر ہوتے رہتے ہیں۔ اس کا نقابِ جسم وصورت ایک جلوہ گر نیرنگی و بوقلمونی ہے، جو حوادث و انقلاباتِ عالم کے ہاتھوں

ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ یہ تغیر عام ہے اور تجدّ د و تبدّ ل کے قانون سے کائنات کی کوئی شے خالی نہیں۔ جس طرح انسان کی عظیم الشان آبادیوں اور بحر و بر کے بڑے بڑے رقبوں میں انقلابات و تبدلات ہوتے رہتے ہیں، اسی طرح ان غیر مرئی ذرّوں میں بھی ایک محشر تغیر اور رستخیز تجدّ د بپا ہے، جس سے جسم کائنات کے اجزاء طبیعیہ ترکیب پاتے ہیں اور جو اس قدر چھوٹے ہیں کہ انھیں انسان کی چشمِ غیر مسلح[8] نہیں دیکھ سکتی!

مظاہر فطرت کی نمود

ان انقلابات کا ایک بڑا نمونہ مظاہر فطرت کا نمود اور کائنات ہستی کے تغیرات طبیعیہ ہیں، جو آغاز تکوین سے جاری ہیں اور جنھوں نے نہیں معلوم کتنی مرتبہ کرۂ ارض کا نقشہ بدل دیا ہے؟ مثلاً وہ حوادث طبیعیہ جن کی وجہ سے دریا خشک ہو گئے، زمین کے بڑے بڑے رقبے سمندر میں مل کر فنا ہو گئے، دریاؤں نے اپنا رخ بدل دیا اور اپنی روانی کی جگہ خشکی کے بڑے بڑے ٹکڑے چھوڑ دیے۔ بحرِ انطلانطیک میں کبھی بیشمار جزیرے تھے۔ آج سب سے بڑی دریائی موجیں اسی میں اٹھتی ہیں۔ بحرِ عرب اور قلزم کے درمیان بہت بڑا حصۂ ارضی حائل تھا، مگر چند قرونِ حوادث بحریہ کے بعد اتنا کم رہ گیا کہ بآسانی ملا دیا گیا۔ یا مثلاً وہ انقلابات جو آتش فشاں پہاڑوں کے پھٹنے سے آئے اور دور دور تک انھوں نے زمین کی سطح بدل دی۔ یا وہ ہولناک زلزلے جنھوں نے ایک پوری اقلیم کو تہ و بالا کر دیا اور خشکی کے نشیب میں بالائی سطح کے دریا امنڈ آئے۔ اسی طرح وہ انقلاباتِ ارضیہ جو علم طبقات الارض کے موثرات طبیعہ سے ہمیشہ آتے رہتے ہیں، اور جن کی وجہ سے دریاؤں کے رخ بدلتے، خشکیوں کے قطعات غرق ہوتے، اور آبادی کی جگہ ویرانی اور زندگی کی جگہ موت طاری ہو جاتی ہے!

انقلابِ اقوام و امم

ہلاکت آفرینی و تماشا گاہِ ہستی

اسی طرح تماشا گاہ ہستی کا ایک بہت بڑا منظر وہ تغیرات بھی ہیں، جن کے طوفان

قوموں اور ملکوں کے اندر اٹھتے ہیں اور بڑی بڑی آبادیوں کو تہ و بالا کر دیتے ہیں' حتیٰ کہ آبادیوں کی جگہ ویرانیوں سے مبدّل ہو جاتی ہے' صحراؤں کی جگہ شہر بس جاتے ہیں' زندگی کی رونق پر موت کا سناٹا چھا جاتا ہے' اور انسانی عیش و نشاط کے بڑے بڑے محل مدفن قبور و مقبرہ اموات اور خرابہ سلب و نہب ہو کر نابود و مفقود ہو جاتے ہیں:

وَ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍم بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلاً وَّ كُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ. (۲۸:۵۸)

''اور کتنی ہی آبادیاں ہیں جنھیں ہم نے ہلاک کر دیا۔ حالانکہ اسباب حیات و معیشت سے وہ مالا مال تھیں' یہ بربادی کے خرابے اور تباہی کے کھنڈر انہی لوگوں کے گھر ہی تو تھے جو پھر آباد نہ ہو سکے اور آخر کار ان کے مال و متاع کے ہم ہی وارث ہوئے!''

امثلہ تدویل ایام

سکندر اعظم نے ایران کو جلا کر تباہ کر دیا، ایرانیوں نے بابل کی اینٹیں بجا دیں' بخت نصر نے بیت المقدس کو ویران کر کے بنی اسرائیل کو کئی قرنوں تک مقیّد رکھا، رومیوں نے ایشیا اور افریقہ کی آبادیاں بارہا غارت کیں، ٹیٹس نے شمالی افریقہ کے ریگ زاروں کے اندر عالیشان شہر آباد کیے، تاتاریوں کے اوّلین ظہور نے رومتہ الکبریٰ کی تاریخ ختم کر دی تھی اور جرمنی کے وحشیوں نے تمدّنِ قدیم کا نقشہ بدل دیا تھا:

وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ. (۱۴۰:۳)

''دراصل یہ (ہار جیت) کے اوقات ہیں جنھیں ہم انسانوں میں ادھر ادھر پھراتے رہتے ہیں۔''

انقلابِ مادی و روحانی

عالمِ جسم و ظاہر

لیکن یہ تمام انقلابات عالم جسم و ظاہر کے تغیرات ہیں' جو صرف دریاؤں اور

خشکیوں کو آبادیوں اور صحراؤں کو، پہاڑوں اور جنگلوں کو، انسانوں کے بسائے ہوئے شہروں اور ان کے مکانوں کی اینٹوں اور پتھروں کو بدل دیتے ہیں اور ان کے اندر سلطانِ تغیر و تقلب کی قوت اس سے زیادہ طاقت ور نہیں ہوتی۔

عالمِ ارواح

لیکن ان انقلابات سے بھی بالاتر ایک عالم تغیر و تبدّل ہے، جس کے انقلابات کی حکومت صرف مادے کی نمود اور جسم کی صورت ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس سے بھی آگے تک نکل گئی ہے۔ پہلی قسم کے انقلابات مٹی کے ذرّوں، اینٹ پتھر کے مکانوں، انسان کے جسموں اور صورتوں کو بدل دیتے ہیں، پر یہ انقلابات روحوں اور دلوں کی کائنات کو منقلب کر ڈالتے ہیں۔ اس عالم کے بحرِ ذخّار کے طوفان دنیا کے طوفانوں کی طرح نہیں ہیں، جو سمندروں میں اٹھتے ہیں اور کناروں سے ٹکرا کے رہ جاتے ہیں، بلکہ اس کی موجوں کا منبع آسمان کے اوپر ہے جہاں سے وہ جوش کھاتی ہوئی ابلتی ہیں اور کرہ ارضی کی سطح پر گرتی ہیں!

اعتقادات و اعمال کی اقلیمیں نابود

اس کے اندر جب زلزلے اٹھتے ہیں تو صرف زمین کے محدود رقبوں ہی کو جنبش نہیں دیتے، بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پورے کرۂ ارضی کو ہلا دیتے ہیں۔ کیونکہ ان کی پیدا کی ہوئی جنبش نظامِ اعتقاد و عمل کے اندر حرکت پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے آتش فشاں پہاڑوں کی آتش فشانی صرف پتھروں کے اڑانے ہی میں صرف نہیں ہو جاتی، بلکہ جب اس کے پہاڑ پھٹتے ہیں تو انسانی اعتقادات و اعمال کی بڑی بڑی اقلیموں کو اڑا کر نابود کر دیتے ہیں۔

دلوں کی اجڑی بستیاں آباد

پہلی قسم کے انقلابات شہروں کو ویران کرتے ہیں، پر یہ انقلاب وہ ہیں جو دلوں کی اجڑی ہوئی بستیوں کو آباد کر دیتے ہیں۔ اُن کی فتح و تسخیر جسم و زمین کی ہوتی ہے، مگر اِن کا احاطہ قلب و معنی کا ہوتا ہے، وہ زمین کی تبدیلیاں ہیں جو زمین والے انجام دیتے ہیں، مگر یہ

آسمانی تبدیلی ہے جسے ارواح سماویہ کا نزول وورود پورا کرتا ہے۔

جسموں کی تسخیر اور روحوں کا فاتح

وہ ویرانی اور موت لاتے ہیں، مگر یہ آبادی اور زندگی کی بشارت دیتے ہیں۔ وہ جسموں کو بدلتے ہیں جو فانی ہیں، مگر یہ روحوں کو بدل دیتے ہیں جو دائمی زندگی پاتی ہیں۔ ان کا شہر یار زمین کے رقبوں اور انسان کے جسموں کو مسخر کرتا ہے۔ تاکہ اپنی پادشاہت کا تخت بچھائے پر اس اقلیم کا فاتح جب اٹھتا ہے تو زمین کی جگہ آسمان کی برکتوں کو اور انسان کے جسموں کی جگہ ان کی روحوں کو فتح کرتا ہے تاکہ خدا کے تختِ جلال و کبریائی کا اعلان کر دے!

دنیا کے اصلی انقلابات

فی الحقیقت یہی تغیرات دنیا کے اصلی انقلابات ہیں جن سے کائنات انسانیہ کا نقشہ حیات و ممات مٹتا اور بدلتا رہتا ہے اور جن کی بدولت دنیا کی سعادت و ہدایت کا قیام اور عالم انسانیت کی ابدیت روحانی وامنیت قلبی کو بقا ہے۔

ان روحانی انقلابات کے آگے مادی انقلابات بالکل ہیچ ہیں اور ان کے سلطان تجدّد وتبدّل کی دائمی وعالمگیر طاقت کے آگے زمینوں اور مکانوں کے انقلابات کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔

مادی تغیرات کی حقیقت

ان کی ہستی اس سے زیادہ نہیں کہ زمین کے چند رقبوں کو بدل دیں یا چند لاکھ انسانوں کو نابود کر دیں۔ لیکن یہ انقلابات کروڑوں انسانوں کے ان اعتقادات واعمال کو بدل دیتے ہیں جو صدیوں سے ان کے دلوں میں جاگزیں ہوتے ہیں اور ان عالمگیر گمراہیوں اور تاریکیوں کو نابود کر دیتے ہیں جو تمام سطح ارضی پر چھائی ہوئی ہوتی ہیں۔ دریاؤں کو خشک کر دینا آسان ہے اور زمین کو سمندر بنا دینا مشکل نہیں، پر کروڑوں روحوں اور دلوں کو بدل دینا بہت مشکل ہے، جس کی قوت مادہ کی طاقتوں کو نہیں دی گئی۔

دنیاوی فاتحیت کی بے بسی

سکندر اعظم نے نصف دنیا فتح کر لی لیکن وہ ایک دل کو بھی فتح نہ کر سکا۔ رومیوں نے کیسے کیسے عظیم الشان شہر بسا دیے' لیکن دلوں کی اجڑی ہوئی بستی نہ بسا سکے۔ بخت نصر اتنا طاقتور تھا کہ ایک پوری قوم کو اس نے قید کر لیا اور ستر برس تک غلام بنائے رکھا' لیکن با ایں ہمہ وہ ان میں سے ایک کے دل کو بھی اپنا غلام نہ بنا سکا۔ ایرانیوں نے بابل کے لاکھوں انسانوں کو قتل کر دیا لیکن وہ ایک روح کی گمراہی کو بھی قتل نہ کر سکے۔ بلا شبہ دنیا میں بڑے بڑے مادی انقلابات گزر چکے ہیں، جنھوں نے عجب نہیں کہ درمیان کی زمینیں کاٹ کے سمندروں کو باہم ملا دیا ہو، لیکن کسی کی طاقت یہ نہ کر سکی کہ ایک انسان کو بھی اس کے خدا سے ملا دے' حالانکہ وہ اس سے دور نہیں:

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْكُمْ وَ لٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ. (۵۶:۸۵)

''اور ہم تم سے بھی زیادہ اس کے نزدیک ہوتے ہیں' لیکن تم ہمیں نہیں دیکھ سکتے۔''

عظمت وجلال کی سرفرازی

پس مادی طاقتوں کی تبدیلیاں کتنی ہی مہیب اور ہولناک ہوں' مگر وہ عظمت وجلال نہیں پا سکتیں جو روحانی انقلابات کے ایک چھوٹے سے چھوٹے ظہور کو بھی حاصل ہوتی ہے۔ سکندر اعظم کو تم دنیا کا سب سے بڑا فاتح کہتے ہو' لیکن بتلاؤ اس نے اپنی تمام عمر میں بدیوں کے کتنے لشکروں کو شکست دی اور ضلالتوں کے کتنے بت توڑے؟

بقائے ذِکر و دوامِ تذکار

تنازع لِلْبَقَاء

اسی کا نتیجہ ہے کہ انقلاب وتغیرات کے ''تنازع للبقاء'' میں ان انقلابوں کے تذکرے کو رفعتِ ذکر اور زندگی دوام نہیں ملتی' جو صرف کائنات کی صورت کو بدلنا چاہتے ہیں، پر وہ جو اس کی روح ومعنی کو بدلتے ہیں، ایک ایسی حیات قائم ودائم اور ہستی عام وغیر

محدود لے کر آتے ہیں کہ نہ تو وقت کا امتداد و بُعد ان کی یاد کو فنا کر سکتا ہے اور نہ حوادث و تغیرات کا ہاتھ ان کے ذکر کو مٹا سکتا ہے۔ صدیوں پر صدیاں گزر جاتی ہیں، مگر ان کا ذکر دنیا کو ایسا ہی یاد ہوتا ہے جیسا کہ ان کے ظہور کے پہلے دن تھا۔

یادگار تفویض

وہ اپنی یاد اور تذکار کو آئندہ باقی رکھنے کے لیے جمعیتِ بشری کے سپرد کر دیتے ہیں جو نسلاً بعد نسلٍ اس مقدس امانت کی حفاظت کرتی رہتی ہے اور کروڑوں انسان اپنے آپ کو اس کی یاد کا پیکر و تمثال بنا لیتے ہیں۔ پس جو قوت کہ ایک کی جگہ کروڑوں میں ہو اور جس امانت کے حامل و محافظ اوقات و ایام نہیں بلکہ ارواح و قلوب ہوں' ان کو کون مٹا سکتا ہے اور وہ کب نابود ہو سکتی ہے:

اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْۤ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ. (۳۶:۱۲)

''بیشک ہم مردوں کو زندہ کرتے ہیں اور ان کے اعمال کو جو وہ آگے بھیج چکے ہیں' ان کو بھی ہم لکھ لیتے ہیں اور ان کے (قدموں کے) نشانوں کو اور ہر چیز کو روشن کتاب (لوح محفوظ) میں احاطہ کر دیا ہے۔''

نابود ہو جانے والی نشانیوں کی سی گمنامی

سکندر کا نام تاریخ کے کہنہ صفحوں کے باہر کتنوں کو یاد ہے؟ روما کے فاتح اعظم کو آج کون ہے جو عمر بھر میں ایک مرتبہ بھی یاد کر لیتا ہو؟ شہروں کے بسانے والے' ملکوں کے فتح کرنے والے، دریاؤں کو کاٹنے والے اور پہاڑوں میں سے راہ نکالنے والے، اپنے اپنے وقتوں میں بڑے ہی طاقتور ہوں گے' انھوں نے ایسے ایسے عظیم الشان انقلابی کام کیے تھے' با ایں ہمہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ہی ان کا وجود اور ان کے انقلابات کا ذکر بھی فنا ہو گیا' اور دنیا نے انہیں یاد رکھنے کی ذرا بھی پرواہ نہ کی۔ حتیٰ کہ وہ آج مٹ جانے والی قبروں اور نابود ہو جانے والی نشانیوں کی طرح گمنام ہیں اور کسی کو اتنا بھی یاد نہیں ہے کہ وہ کب تھے؟

کہاں تھے؟ اور انھوں نے دنیا میں کیا کیا انقلابات برپا کیے؟

لَمْ یَكُنْ شَیْئًا مَّذْكُوْرًا. (۷۶:۱)

''وہ ایسے ہو گئے کہ قابل ذکر ہی نہ رہے۔''

انقلاب ۶۰۰ء عیسوی [۹]

سرچشمۂ ہدایت کا جوش آسمانی

ایسا ہی ایک انقلاب روحانی تھا جو اب سے ٹھیک ۱۳سو چوالیس برس پہلے دنیا میں ہوا جبکہ دنیا تغیر کے لیے بیقرار اور تبدیلی کے لیے تشنہ تھی' اور کوئی نہ تھا جو اس کی پیاس کو بجھائے اور اس کے لیے مضطرب ہو۔ وہ سمندروں کی طغیانی نہ تھی جو زمین کی بستیوں پر چڑھ آتی ہے' بلکہ سرچشمۂ ہدایت و فیضان الٰہی کا ایک سرجوش آسمانی تھا جو برسات کے پانی کی طرح زمین پر برسا' تاکہ اسے سیراب کر دے۔

عالمِ ارواح کا آسمانی زلزلہ

وہ زمین کی سطح کو ہلانے والا بھونچال نہ تھا، جس سے ڈر کر انسان روتا ہے اور پرندے اپنے گھونسلوں سے نکل کر چیخنے لگتے ہیں، بلکہ عالم روح و معنی کا ایک آسمانی زلزلہ تھا۔ جس کی جنبش نے دلوں کو غفلت سے بیدار کیا اور بیقرار روحوں کو امن اور راحت بخشی، تاکہ وہ سونے کی جگہ بیدار ہوں اور رونے کی جگہ خوشیاں منائیں۔

محبت و برکت کا الٰہی ظہور

وہ انسانوں کی درندگی نہ تھی جو اپنے ابنائے جنس کو سانپوں کی طرح ڈستی اور بھیڑیوں کی طرح چیرتی پھاڑتی ہے، بلکہ خدا کی محبت اور فرشتوں کی برکت کا ایک الٰہی ظہور تھا' جو نسل آدم کے بچھڑے ہوئے گھرانوں کو یک جا کرتا اور زمین کو اس کی چھنی ہوئی امنیت اور سعادت واپس دلاتا تھا۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ. (۹:۱۲۸)

''تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک رسول الٰہی آیا جس پر تمہاری تکلیف بہت ہی شاق گزرتی ہے اور تمہاری اصلاح کی اسے بڑی تمنا ہے۔ مسلمانوں پر نہایت شفیق اور بے حد مہربان ہے!''

تاریخ انقلابِ عظیم

لیلۃ القدر

یہ انقلاب جس نے دنیا کے لیالی وایام ہدایت کی تقویم بدل دی فی الحقیقت ایک مقدس رات تھی جو وادی بطحاء کے کنارے جبل بوقبیس کی ایک تنگ و تاریک غار کے اندر نمودار ہوئی' اور اس شبستان لاہوتی کے اندر مشرق ربوبیت اعلیٰ سے آفتاب کلام اللہ شروع ہوا۔

يَاۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا. (۴:۱۷۵)

''اے لوگو! تمھارے پروردگار کی طرف سے تمھارے پاس ''برہان مقدس'' بھیجی گئی اور ہم نے تمھاری طرف ایک نہایت روشن اور کھلا نور نازل کیا!''

ایام اللہ کا نیا موسم بہار

دنیا پر چھ صدیاں ضلالت کے سناٹے اور کفر کی خاموشی کی گزر چکی تھیں لیکن اب وقت آ گیا تھا کہ سینا کے موسیٰ کا خداوند اور کوہ زیتون کی روح القدس پھر گویا ہو اور ایام اللہ کا ایک نیا موسم بہار پھر آئے۔ پس ایسا ہوا کہ فضائے وحی الٰہی کی افق مبین پر نور و روشنی کی بدلیاں چھا گئیں' فیضان الٰہی کے بحور وانہار جوش میں آ گئے، ملاء اعلیٰ اور قدوسیانِ عالمِ بالا میں ہلچل مچ گئی' مدبّراتِ روحانیہ اور ملائکہ سماویہ کو حکم ہوا کہ زمین کی طرف متوجہ ہو جائیں، کیونکہ اب وہ آسمانوں میں مقہور و مخذول نہیں رہی۔

آتشیں شریعت کا نزول

آسمانوں کے وہ دروازے جو صدیوں سے زمین پر بند کر دیے گئے تھے' یکا یک کھل گئے۔ خزائین فیضان و برکات سماویہ جن کی بخشش کا سلسلہ رک گیا تھا' پھر مساکینِ ہدایت و سائلینِ رحمت کے منتظر ہو گئے۔ خداوند سینا اپنے دس ہزار قدوسیوں کو ساتھ لے کر فاران پر نمودار ہوا' تا آتشیں شریعت کو ہویدا کرے اور کوہِ سعیر کی روح القدس فارقلیطِ اعظم کی ہیکل میں متشکّل ہوئی' تا اس کو بھیج دے جو ناصرہ کے نبی کے آئے بغیر نہیں جا سکتا تھا:

اِنَّا اَنۡزَلۡنَاهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ' وَمَا اَدۡرَاکَ مَالَیۡلَةُ الۡقَدۡرِ' لَیۡلَةُ الۡقَدۡرِ خَیۡرٌ مِّنۡ اَلۡفِ شَهۡرٍ' تَنَزَّلُ الۡمَلَائِکَةُ وَالرُّوۡحُ فِیۡهَا' بِاِذۡنِ رَبِّهِمۡ مِّنۡ کُلِّ اَمۡرٍ' سَلَامٌ هِیَ حَتّٰی مَطۡلَعِ الۡفَجۡرِ. (۹۷:۱۔۵)

''ہم نے قرآن کو لیلۃ القدر میں اتارا' اور تم سمجھے کہ لیلۃ القدر کیا شے ہے؟ لیلۃ القدر (ایک عہد رحمت و دور برکت ہے جو) ہزار مہینوں سے افضل ہے۔ ملائکہ سماوی و روح الٰہی کا اس میں ہر طرف سے نزول ہوتا ہے۔ سلام اس پر یہاں تک کہ صبح طلوع ہو جائے۔''

ابرِ رحمت کی سیرابی

وہ آتش فشاں پہاڑوں کا پھٹنا نہ تھا، جن کی چوٹیوں سے آگ ابلتی اور ہلاکت و موت بن کر اجسامِ حیوانیہ پر برستی ہے، بلکہ وہ فاران کی چوٹیوں پر نمودار ہونے والا ابرِ رحمت تھا جو انسانیت کی سوکھی کھیتیوں کو سبز کرنے اور کائنات ارضی کی تشنگیِ سعادت کو سیراب کرنے کے لیے امنڈ اٹھا، تا کہ جس طرح یروشلم کے مرغزاروں کو ہدایت کی بہشت بنایا گیا تھا' اسی طرح عرب کی ریتلی اور بنجر زمین کو بھی شگفتہ و شاداب کر دے:

فَانۡظُرۡ اِلٰی اٰثَارِ رَحۡمَةِ اللّٰهِ! کَیۡفَ یُحۡیِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا؟ اِنَّ ذٰلِکَ لَمُحۡیِ الۡمَوۡتٰی' وَهُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡر. (۳۰:۴۹)

''پس رحمتِ الٰہی کی نشانیوں کو دیکھو کہ کس طرح وہ موت کے بعد زمین کو حیات بخشتا ہے! بیشک وہ مردوں کو زندہ کرنے والا ہے اور وہ ہر بات پر قادر ہے۔''

انقلاب آفریں پیغام

مہبط و مورد قرآن

یہ قرآنِ حکیم اور فرقان مبین کا نزول تھا، جس نے قلب محمد ابن عبداللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنا مہبط و مورد بنایا، جبکہ وہ غار حرا کے اندر بھوکا پیاسا، تمام مادیاتِ عالم سے کنارہ کش ہو کر اپنے پروردگار کے حضور میں سر بسجود تھا:

وَاِنَّـهٗ لَتَنْزِيْـلُ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ، عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذَرِيْنَ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ، وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ. (۲۶:۱۹۲۔۱۹۶)

''بیشک وہ پروردگار عالم کا اتارا ہوا کلام ہے روح الامین نے تیرے قلب پر نازل کیا، تا کہ تو ضلالت و فساد کے نتائج سے دنیا کو ڈرانے والوں میں سے ہو اور سعادت و فلاح کی طرف دعوت دے۔ یہ کلام نہایت کھلی اور واضح زبان عربی میں نازل ہوا اور پچھلی کتابوں میں اس کی خبر دی جا چکی ہے۔''

دنیا کی سیرابی

وہ غذائے آسمانی کی طلب میں زمین کی پیداوار سے کنارہ کش ہو کر بھوکا پیاسا تھا۔ پس خداوند نے اس کی بھوک اور پیاس کو دنیا کی سیری اور سیرابی کے لیے قبول کر لیا:

هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ ٥ (۲۶:۷۹)

''(میں بھوکا ہوتا ہوں تو) وہ مجھ کو کھلاتا ہے اور (میں پیاسا ہوتا ہوں تو) وہ مجھ کو پلاتا ہے۔''

نظارہ جمال کی ٹھنڈک

وہ انسانیت کی غفلت و سرشاری کے دور کرنے کے لیے راتوں کو اٹھ اٹھ کر جاگتا تھا۔

پس اللہ نے اس کی بے خواب آنکھوں کو اپنے نظارۂ جمال سے ٹھنڈک بخشی:

قُرَّةَ عَيْنِىْ فِىْ الصَّلٰوةِ.

''میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔''

اور تمام عالم کے لیے اسے بصیرت عطا کی:

قَدْ جَآءَ كُمْ بَصَائِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ. (۶:۱۰۴)

بیشک تمھارے پاس تمھارے پروردگار کی طرف سے بصیرت نازل ہوئی۔

خدا کی آواز

وہ انسانوں کو سرکشی اور تمرّد کے عصیاں سے نکالنے کے لیے شہنشاہِ ارض وسما کے آگے سربسجود تھا، پس رب الافواج نے اس کے سر کو الفت و یگانگت کے ہاتھوں سے اٹھایا اور زمینوں اور آسمانوں میں سربلندی دی، تاکہ اس کی روح اس کے کلام کی حامل ہو اور اس کے منہ سے خدا کی آواز نکلے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى، اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْىٌ يُّوْحٰى. (۵۳:۴)

''وہ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کہتا، جو کچھ کہتا ہے، وہ بذریعہ وحی الٰہی نازل شدہ بات ہوتی ہے۔''

تاریخ نزول

سعادت بشری کا یہ پاک پیغام جس کی تبلیغ نبیِ اُمی کے سپرد ہوئی، وحی الٰہی کا یہ فتح باب جو غارِ حرا کے عزلت گزیں پر ہوا، خدا کا یہ مقدّس کلام جو بلسانِ عربی مبین اس کے منہ میں ڈالا گیا، سب سے پہلے جس رات میں اس کا ظہور ہوا، وہ ''لیلة القدر'' تھی اور لیلة القدر جس مہینے میں آئی وہ رمضان المبارک تھا:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِىْ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ، هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانَ. (۲:۱۸۵)

''رمضان کا مہینہ وہ ہے، جس میں قرآن نازل ہوا جو انسانوں کے لیے سرتاپا

ہدایت ہے اور جس کی تعلیم ہدایت وتمیز حق و باطل کی نشانی ہے۔"

انقلابِ عظیم کی حقیقت

تاریخ عالم کا صفحہ الٹ دیا

قرآنِ حکیم، فرقان مجید، نور و کتاب مبین، بصائر للناس، ھدی وموعظۃ للمتقین، شفاء لما فی الصدور نے نازل ہوتے ہی تاریخ عالم کا صفحہ الٹ دیا اور کشورِ انسانیت کی از سر نو تعمیر شروع کی۔ وہ تمام تاریکیاں جنھوں نے نور سعادت سے دنیا کو محروم کر دیا تھا اور عالم ارضی یکسر شب تاریک ہو رہا تھا، اس آفتاب ہدایت کے طلوع ہوتے ہی نابود ہو گئیں اور ظلمت و تاریکی کی جگہ نور اور روشنی کا عہد رحمت شروع ہوا۔

ماسوی اللہ طاقتیں سرنگوں

اس نے کفر و ثنیّت کے طوق سے انسانوں کو نجات دلائی، انسانی غلامی و استبداد کی زنجیروں سے انھیں رہا کیا، نیکیوں کا ایک لشکر ترتیب دیا، جس نے صدیوں کی پھیلی ہوئی بدیوں اور جمی ہوئی گمراہیوں کو شکست دی اور خدا کی بندگی اور پرستش کی ایک ایسی پادشاہت قائم کر دی، جس کے آگے دنیا کی تمام ماسوی اللہ طاقتیں سرنگوں ہو گئیں:

قَدْ جَاءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ، يَهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلَامِ وَ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمَاتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَ يَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ. (۱۶:۵)

"بیشک اللہ کی طرف سے تمھارے پاس نور اور واضح و روشن کتاب آئی، اللہ اس کے ذریعہ ان لوگوں پر سلامتی کی راہیں کھول دیتا ہے، جو اس کی رضا کی متابعت کرتے ہیں، وہ انھیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے اور صراطِ مستقیم کی طرف ان کی ہدایت کرتا ہے۔"

ماہِ مقدس کا یادگار واقعہ

ذریعہ نزول برکت سماوی

پس رمضان المبارک کا مہینہ فی الحقیقت اس سعادت انسانیت اور ہدایت امم کے ظہور کی یادگار ہے۔ جس کا دروازہ قرآن حکیم کے نزول سے دنیا پر کھلا اور خدا اور اس کے بندوں میں ہجر و حرماں کی جگہ وصل و محبت کے راز و نیاز شروع ہوئے۔

یہی مہینہ ہے جو اس آسمان کی سب سے بڑی برکت کے نزول کا ذریعہ بنا اور یہی مہینہ ہے جو اپنے ساتھ زمین کی سب سے بڑی سعادت لایا۔

عظمت وشوکت کا عہد

اسی موسم میں خدا کی رحمتوں کی پہلے پہل بارش ہوئی اور اسی عہد میں دنیا کی وہ سب سے بڑی خشک سالی ختم ہوئی جو صدیوں سے کائناتِ روح و قلب پر چھائی ہوئی تھی۔ ہدایتوں کے فرشتے اسی میں اترے، سعادت کے قدوسی اسی میں زمین پر پھیلے۔ خدا نے سب سے پہلے اسی مہینے میں بندوں کو پیار کیا اور بندوں نے بھی سب سے پہلے اسی ماہ میں اس کی محبت کا جام پیا۔ یہ پاکیزگی اور بزرگی کا وقت تھا کہ پاک تعلیمات کا منبع بنا اور عظمت وشوکت کا عہدِ مقدّس تھا کہ خدا کا کلام اس کے بندوں پر نازل ہوا۔

روحانی انقلاب

پس جبکہ دنیا طرح طرح کی مادی یادگاروں کو منانا چاہتی تھی تو مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اس روحانی انقلاب کی یادگار کے امانت دار بنیں اور جس ماہ مبارک کو اپنی برکتوں اور رحمتوں کے نزول کی وجہ سے خداوند نے قبول کرلیا ہے اس کی قبولیّت سے انکار نہ کریں۔ دنیا خون ریزیوں کی یادگار مناتی ہے لیکن یہ سچے امن اور حقیقی رحمت کی یادگار ہے۔ دنیا لڑائیوں کو یادرکھنا چاہتی ہے، یہ صلح وامنیّت کے ورود کی یادگار ہے۔

دلوں کی فتح اور روحوں کی تسخیر

دنیا نے تخت نشینوں کو سب سے بڑا سمجھ کر یاد رکھنا چاہا، مگر یاد نہ رکھ سکی۔ خدا نے بتلایا کہ سب سے بڑا انسان ایک غارنشیں تھا جس کی یادگار زندہ رکھی گئی اور ہمیشہ زندہ رہی۔ دنیا نے ملکوں کی فتح اور زمینوں کی تسخیر کو بڑا واقعہ سمجھا' اور اس کی یاد میں خوشیاں منائیں، مگر ہمیں تعلیم کیا گیا کہ دلوں کی فتح اور روحوں کی تسخیر ہی سب سے بڑی بات ہے اور اسی کی یادگار منانی چاہیے!

وَرَفَعْنَالَکَ ذِکْرَکَ' (۴:۹۴)

''اور ہم نے تیرے ذکر کو رفعت اور بقائے دوام عطا فرمایا۔''

اُسوۂ ابراہیمیؑ و اُسوۂ محمدی ﷺ

سُنت اللہ

اللہ تعالیٰ کا قاعدہ ہے کہ وہ اپنے قدوسوں اور محبوبوں کے کسی فعل کو ضائع نہیں کرتا اور اسے مثل ایک مظہر فطرت کے دنیا میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیتا ہے۔

قدوس دوستوں کی ادائیں

حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خانہ کعبہ کی دیواریں چنیں اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اس قربان گاہ کا طواف کیا۔ خدا کو اپنے دوستوں کی یہ ادائیں کچھ اس طرح بھا گئیں کہ اس موقع کی ہر حرکت کو ہمیشہ کے لیے قائم کر دیا اور اس کی یادگار منانا تمام پیروانِ دین حنفی پر فرض کر دیا۔ ہر سال جب حج کا موسم آتا ہے تو لاکھوں انسانوں کے اندر سے اسوۂ خلیل اللہ جلوہ نما ہوتا ہے۔ اور ان میں سے ہر متنفس وہ سب کچھ کرتا ہے جو اب سے کئی ہزار سال پہلے خدا کے دو دوستوں نے وہاں کیا تھا۔

قیام ذکر خیر

یہی معنی ہیں اس بیان الٰہی کے کہ:

وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا. (۱۹-۵۰)

''ہم نے حضرت ابراہیمؑ اوران کی ذرّیت جسمانی وروحانی کواپنی رحمت میں سے بڑاحصہ دیا'اوروہ یہ تھا کہ ان کے لیےایک اعلیٰ واشرف ذکرِخیر دنیامیں باقی رکھا۔''

التجائے خلیلؑ کی حقیقت اعلیٰ

یہ تو اسوہ ابراہیمیؑ کی یادگار تھی' لیکن جب وہ آیا جس کے لیے خود ابراہیم خلیلؑ نے خداوند کے حضور التجا کی تھی:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولاً مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِکَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ' اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ. (۲:۱۲۹)

''اے پروردگار! میری ذرّیت میں ایک ایسا رسول بھیج جو اُنھیں اللہ کی آیتیں پڑھ کر سنائے' کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور دلوں اور روحوں کا تزکیہ کرے۔ بیشک تو ہی عزیز وحکیم ہے۔''

پھر دنیا کے لیے اسوۂ محمدیؐ کی حقیقت الحقائق اعلیٰ رونما ہوئی' اور ہدایت و سعادت کی دیگر تمام حقیقتیں بے اثر ہوگئیں۔ اس اسوۂ عظیمہ کا سب سے پہلا منظر عالم ملکوتی کا وہ استغراق واستہلاک تھا، جبکہ صاحب فرقان نے انسانوں کو ترک کر کے خدا کی محبت اختیار کر لی تھی اور انسان کے بنائے ہوئے گھروں کو چھوڑ کر غارِ حرا کے غیر مصنوع حجرے میں عزلت گزیں ہوگیا تھا۔ وہ اس عالم میں مسلسل بھوکا پیاسا رہتا تھا اور پوری پوری راتیں جمال الٰہی کے نظارے میں بسر کر دیتا تھا تا آنکہ اس تنگ و تاریک غار کی اندھیاری میں طلیعۂ قرآنی کا نورِ بے کیف طلوع ہوا اور مشرقستان الوہیّت سے نکل کر اس کے قلبِ مقدس میں غروب ہوگیا:

تَبَارَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعَالَمِيْنَ نَذِيْرًا. (۲۵:۱)

''تمام حمد وثنا اس خدا کے لیے جس نے فرقان اپنے بندے پر نازل کیا' تا کہ وہ دنیا جہان کے لیے ڈرانے والا ہو!''

اولین داعی و آخری متمّم ومکمّل

پس جس طرح خداتعالیٰ نے دین حنیفی کے اولین داعی کے اسوہ کو حیات دائمی بخشی تھی، اسی طرح اس آخری متمّم ومکمّل وجود کے اسوۂ حسنہ کو بھی ہمیشہ کے لیے قائم کردیا:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ. (۲۱:۳۳)

''بیشک تمھارے لیے رسول اللہ کے اعمال حیات میں ارتقاء انسانیت کا اعلیٰ ترین نمونہ رکھا گیا ہے۔''

سنت اعتکاف کی یاد

وہ بھوکا پیاسا رہتا تھا، پس تمام مومنوں کو حکم دیا گیا کہ تم بھی ان ایام میں بھوکے پیاسے رہو، تاکہ ان برکتوں اور رحمتوں میں سے حصہ پاؤ جو نزول قرآنی کے ایام اللہ کے لیے مخصوص تھیں۔ وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر ایک تنہا گوشے میں خلوت نشیں تھا، پس ایسا ہوا کہ ہزاروں مومن اور قانت روحیں ماہ مقدس میں اعتکاف کے لیے مسجد نشیں ہونے لگیں اور اسطرح غارحرا، کے اعتکاف کی یاد ہر سال تازہ ہونے لگی۔

قیامِ لیل وتلاوتِ قرآن

وہ راتوں کو حضورِ الٰہی میں مشغول عبادت رہتا تھا، پس پیروان اسوۂ محمدیہ ومتّبِعان سنّت احمدیہ بھی رمضان المبارک کی راتوں میں قیام لیل کرنے لگے اور تلاوت وسماعت قرآنی کے وسیلہ سے وہ تمام برکتیں ڈھونڈنے لگے، جو اس ماہِ مبارک کو اس کے نزول وصعود سے حاصل ہیں!

فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهَرَ فَلْيَصُمْهُ. (۲:۱۸۵)

''پس تم میں سے جو اس مہینے کو پائے، اسے چاہیے کہ روزہ رکھے۔''

قائم ودائم اسوتین

جس طرح اسوہ ابراہیمؑ کی یادگار حج کو فرض کر کے قائم رکھی گئی اور لاکھوں انسانوں کو

اسوہ ابراہیمیؑ کا پیکر بنایا گیا، اسی طرح اسوہ محمدی ﷺ کی بھی یہ یادگار ہے جو ماہِ رمضان کی صورت میں قائم رکھی گئی اور جو تیرہ سو برس کے گزر جانے کے بعد بھی زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گی!

خدائی یادگاروں کا بقاء وقیام

خدا کی قائم کی ہوئی یادگاریں کاغذوں، اینٹ اور پتھر کی دیواروں، اور فانی زبانوں کی روایتوں میں باقی نہیں رکھی جاتیں کہ یہ انسانوں کے کام ہیں، وہ اپنے جس بندے کو بقائے دوام کے لیے چن لیتا ہے، اس کی یادگار کو مجمع انسانیت کے سپرد کر دیتا ہے اور نوع بشری اس کی حامل بن جاتی ہے، پس نہ تو وہ مٹ سکتی ہے اور نہ کوئی اسے مٹا سکتا ہے!

اُسوۂ محمدیؐ کی روحانیت کُبریٰ

آج بھی کروڑوں انسان کرۂ ارض پر موجود ہیں جو ماہ مقدس کے آتے ہی اپنی زندگی کو یکسر بدل دیتے ہیں اور اس یادگارِ عظیم وقدّوس کو اس طرح اپنے جسم ودل پر طاری کر لیتے ہیں کہ اسوۂ محمدی ﷺ کی روحانیت کبریٰ کروڑوں روحوں کے اندر سے **"اَنَـا الْـحَـيِّ الـقيـوم الَّـذِیْ لَا یَـمُوْتُ"** (میں زندہ وباقی ذات میں فنا ہو کر خود بھی ہمیشہ کے لیے زندہ وباقی ہو گیا ہوں) کی صدائے حقیقت سے غلغلہ اندازِ عالم وعالمیاں ہوتی ہے۔ پھر کیسی مقدس واقدس تھی وہ بھوک، جس ایک بھوک کی یاد میں خدا نے اپنے لاتعداد ولاتحصی بندوں کو بھوکا رکھا اور کیسی پاک اور بزرگ تھی وہ ذات، جس کی حیات طیبہ کا کوئی فعل گمنامی کے لیے نہیں چھوڑا گیا!

اسوۂ حسنہ کے اتباع میں فنا!

پس اے پیروانِ دینِ حنیفی! واے وابستگانِ اسوۂ محمدیؐ! آؤ کہ نزول ہدایت و سعادت کے اس انقلاب عظیم کی یادگار منائیں اور جس طرح صاحب قرآن اس ذات حیّ و قیّوم میں فنا ہو گیا تھا، ہم بھی اس کے اسوۂ حسنہ کے اتباع میں اپنے تئیں فنا کر دیں۔ کیونکہ محض جسم کی بھوک اور پیاس سے وہ حقیقت ہم پر طاری نہیں ہو سکتی، جب تک کہ روح اور دل پر بھی جسم کی طرح روزہ نہ طاری ہو جائے۔

فَسُبْحَانَ ذِیْ الْمُلْکِ وَالْمَلَکُوْت، سُبْحَانَ ذِیْ الْعِزَّةِ وَالْعَظْمَةِ وَالْهَیْبَةِ وَالْقُدْرَةِ وَالْکِبْرِیَاءِ وَالْجَبَرُوْتِ، سُبْحَانَ الْمَلِکِ الحَیِّ الَّذِیْ لَا یَنَامُ وَلَا یَمُوْتُ اَبَدًا اَبَدًا، سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ رَبُّنَا وَ رَبُّ الْمَلٰئِکَةِ وَالرُّوْحُ!

''پس پاک ہے وہ ذات جس کے قبضہ میں زمینوں اور آسمانوں کی سلطنت ہے! پاک ہے وہ ذات جو ساری عزت' عظمت، ہیبت' قدرت' بزرگی اور جبروت کی مالک ہے! پاک ہے وہ شہنشاہ جو ہمیشہ سے زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا' اُس کے لیے نہ سونا ہے اور نہ اونگھنا اور وہ کبھی بھی فنا نہیں ہوگا۔ پاک ہے وہ پاک ذات جو ہمارا پروردگار ہے اور فرشتوں اور ارواح کا بھی پروردگار ہے!''

اعمال واخلاقِ انسانی کی پرفتن منزل

ماہِ مقدس اور جماعت ہائے ثلاثہ

نوعِ بشری کی قدرتی تقسیم

قرآن کریم نے اعتقاد و اعمال اور تعلق الٰہی کے لحاظ سے انسانوں کو تین جماعتوں میں تقسیم کردیا ہے۔

فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ، وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ، وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَیْرَاتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ. ذٰلِکَ هُوَ الْفَضْلُ الْکَبِیْرُ. (۳۲:۳۵)

''پس ان میں سے ایک گروہ تو احکام الٰہی سے سرتابی کر کے اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے۔ ایک گروہ درمیانی حالت میں ہے' اور ایک ایسا بھی ہے کہ خدا کے حکم سے نیکیوں کے کرنے میں آگے بڑھا ہوا ہے۔ سو یہ آخری حالت خدا کا بہت ہی بڑا فضل ہے جو وہ اپنے بندوں پر کرتا ہے!''

فی الحقیقت انسان کے اعمال و اخلاق کی یہ ایک ایسی جامع اور قدرتی تقسیم ہے، جس کی صداقت ہر حیثیت اور ہر پہلو سے دیکھی جا سکتی ہے اور نیکی کے کاروبار کا کوئی میدان ایسا نہیں ہے جہاں یہ تینوں گروہ نظر نہ آتے ہوں۔

تقسیم بلحاظ تعمیل حکم صیام

ماہِ رمضان المبارک کے احترام و تعظیم اور حکم صیام کی تعمیل کے لحاظ سے بھی غور کرو تو آج ہم میں یہ تینوں گروہ موجود ہیں: ایک گروہ تارکین صیام کا ہے، جو روزہ رکھتا ہی نہیں۔ دوسرا صائمین کا ہے، جو روزہ تو رکھتا ہے، پر افسوس کہ اس کی حقیقت اپنے اوپر طاری نہیں کرتا۔ تیسرا گروہ ان مومنین صالحین کا ہے، جنھوں نے روزہ کی اصلی حقیقت کو سمجھا ہے اور وہ احتساب اور تقویٰ کے ساتھ یہ ماہِ مقدس بسر کرتا ہے۔ وَهُمْ قَلِيْلٌ! فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ." میں آج ان جماعتوں کے متعلق چند کلمات کہنا چاہتا ہوں۔

تارکینِ احکام وطاعات

خاسرین کی غلطی

ان میں سے پہلا گروہ "ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ" کا ہے۔ یہ اپنے نفس کے لیے اس لیے ظالم ہیں کہ انھوں نے خدا کو اور اس کے ذکر کو بھلانا چاہا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خود اپنے نفس ہی کو بھول گئے:

كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسَاهُمْ اَنْفُسَهُمْ، اُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ.[9] (۱۹:۵۹)

"ان لوگوں کی طرح کہ انھوں نے اللہ کو بھلا دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اپنے ہی نفس کی طرف سے غافل ہو گئے۔ یہی لوگ ہیں کہ دونوں جہاں کے گھاٹے اور ٹوٹے میں ہیں۔"

اسراف وتبذیر کا راستہ

یہ "ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ" اس لیے ہیں کہ انھوں نے عدالتِ حقہ کا راستہ چھوڑ کر اسراف و

تبذر کا راستہ اختیار کیا۔ ظلم کہتے ہیں زیادتی کو اور عدالت حقہ صرف اسی راہ میں ہے جسے صراطِ مستقیم، میزان الموازین اور قسطاس مستقیم کہا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرمایا:

اَلَّذِیۡنَ اَسۡرَفُوۡا عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ. (۵۳:۳۹)

''وہ لوگ کہ جنھوں نے اپنے نفسوں پر زیادتی کی ہے۔''

ہوائے نفس کا اتباع

ہوائے نفس کی لذتوں نے انھیں پاگل کر دیا ہے:

کَمَا یَتَخَبَّطُہُ الشَّیۡطٰنُ مِنَ الۡمَسِّ. (۲:۲۷۵)

''جیسے وہ آدمی جسے شیطان کی چھوٹ نے باؤلا کر دیا ہو۔''

ان کی زندگی کی غایت صرف غذا اور روٹی ہے۔ خدا نے انھیں انسان بنایا تھا تا کہ وہ قوائے انسانیتِ اعلیٰ سے کام لیں، پر وہ مثل چار پایوں کے بن گئے، جو صرف اپنا چارا ڈھونڈتا ہے، اور صرف اپنی غذا کے لیے دن بھر دوڑتا اور لڑتا رہتا ہے:

اُولٰٓئِکَ کَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ ہُمۡ اَضَلُّ، اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡغٰفِلُوۡنَ. (۷:۱۷۸)

''یہ لوگ مثل چار پایوں کے ہیں، بلکہ ان سے بھی بدتر، اور یہی ہیں کہ غفلت میں ڈوب گئے ہیں۔''

حکومت الٰہیہ سے بغاوت

سو ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ خدا کی حکومت سے باغی ہیں، اس کے قوانین سے انھوں نے علانیہ سرکشی کی، اس کے پاک حدود و مواثیق کو انھوں نے یکسر توڑ ڈالا۔ وہ انسانوں کے آگے جھکتے ہیں۔ مگر فاطر الارض والسماوات کے آگے جھکنے سے انھیں شرم آتی ہے۔

دنیاوی حکومت کی طاعت

وہ دنیاوی حاکموں سے ڈرتے ہیں، پر احکم الحاکمین کا ان کے دلوں میں خوف نہیں۔ انسانی پادشاہت کا اگر ایک چھوٹے سے چھوٹا قانون بھی ہو تو اس سے سرتابی کرنے کی انھیں ہمت نہیں

ہوتی، کیونکہ ان کو یقین ہے کہ اگر وہ ایسا کریں گے تو عدالت سزا دے گی اور حاکم وقت باز پرس کرے گا۔ پر شہنشاہِ ارض و سما کے بڑے سے بڑے قانون کو بھی ٹھکرا دینے اور ذلیل و حقیر کرنے سے وہ نہیں ڈرتے۔ کیونکہ خدا پر انھیں یقین نہیں رہا اور اس کی سزاؤں کو وہ نہیں مانتے۔

ضلالت و گمراہی کی وجہ

وہ اپنی نفسانی خواہشوں کے پورا کرنے کا اختیار اگر کسی انسان کے ہاتھ میں دیکھتے ہیں، تو کتّے کی طرح اس کے پاؤں پر لوٹتے ہیں، گدھے کی طرح اس کا مرکب بن جاتے ہیں اور غلاموں اور چاکروں کی طرح اس کے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑے رہتے ہیں تاکہ وہ انھیں کچھ عرصہ کے لیے روٹی دے یا تانبے اور چاندی کے چند سکے حوالے کر دے۔ پر وہ جس نے انھیں پیدا کیا، جس کی ربوبیّت ان کے جسم کے ایک ایک ذرّے اور خون کے ایک ایک قطرہ کو پالتی اور ہلاکت سے بچاتی ہے۔ جو ان کی فریادوں کو درد اور دکھ کے وقت سنتا اور جب وہ ہر طرف سے مایوس ہو جاتے ہیں تو انھیں امید اور مراد بخشتا ہے۔ سو اس رب الارباب کے لیے ان مغروروں کے پاس عاجزی کا ایک سجدہ، بندگی کی ایک پیشانی، بے قرارئ محبت کی ایک پکار، تقویٰ اور احتساب کا ایک روزہ، اور خلوص و صداقت کے ساتھ انفاق فی سبیل اللہ کا ایک پیسہ بھی نہیں ہے!

فَوَيْلٌ لِّلْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ، اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ. (۳۹:۲۲)

''پس صد افسوس اور صد حسرت ان دلوں پر جو ذکر الٰہی کی طرف سے بالکل سخت ہو گئے ہیں، اور یہی لوگ ہیں کہ جو پرلے درجے کی گمراہی میں مبتلا ہیں۔''

ایمان باللہ کا فقدان

یقین و اعتماد

انسان کے تمام کاموں کی جڑ یقین کا رسوخ اور اعتماد کا استحکام ہے۔ اس کو شریعت

''ایمان'' کے لفظ سے تعبیر کرتی ہے۔ لیکن ان کے دل میں ایمان کا درخت مرجھا گیا ہے' اس لیے اعمالِ صالحہ کے پھل نہیں لگتے۔

خشیت و محبتِ الٰہی

خدا کا تصوّر یا تو محبت کی شکل میں انسان کو اپنی طرف کھینچتا ہے یا خوف کی عظمت و ہیبت دکھلا کر اپنے آگے جھکاتا ہے۔ اس کے دیکھنے والوں نے ہمیشہ انہی دو نقابوں میں سے اسے دیکھا ہے۔ پر نہ تو ان کے دلوں میں محبت ہے کہ اپنے محبوب کے لیے دکھ اٹھائیں' اور نہ خوف ہے کہ ڈر کر اور ہیبت میں آ کر اس کے آگے جھک جائیں۔

طوقِ شیطانی

خدا کے رشتے سے کوئی زنجیر ان کے پاؤں میں نہیں رہی۔ کیونکہ نفس و شیطان کی غلامی کے طوق ان کے گلوں میں پڑ گئے:

اِنَّا جَعَلْنَا فِیْ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِیَ اِلَی الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ. (۳۶:۸)

''ہم نے گمراہی اور شیطان کی غلامی کے طوق ان کی گردنوں میں ڈال دیے جو ان کی ٹھڈیوں تک آ گئے ہیں اور ان کے سر پھنس کے رہ گئے ہیں!''

عبودیّت سے اجنبیّت

پس ان کی فطرت کو عبودیّت الٰہی سے کچھ اس طرح کی اجنبیت ہو گئی ہے کہ اگر ایک لمحہ اور ایک دقیقہ بھی اس کی عبادت و ذکر میں بسر کرنے کے لیے کہا جاتا ہے تو انھیں ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی بڑی ہی سخت مصیبت اور بڑے ہی جانکاہ عذاب میں پڑ گئے ہیں۔ حالانکہ اصلی عذاب کی انہیں خبر نہیں جس میں واقعی پڑنے والے ہیں اور جو واقعی سخت و جانکاہ ہے:

قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ اَلنَّارُ' وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِیْنَ

كَفَرُوْا، وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ. (٢٢:٧٢)

''اے پیغمبر! ان سے کہہ دے کہ تمہیں ذکر الٰہی سے بڑی ہی تکلیف ہوتی ہے، لیکن اس سے بھی بڑھ کر ایک مصیبت کی تمہیں خبر دوں جو آنے والی ہے؟ آتشِ دوزخ! جس کا خدا نے منکروں سے وعدہ کیا ہے اور جو بڑا ہی برا ٹھکانا ہے!''

عصیان وضلالت کی تاریکی کا نتیجہ

ان کی فطرت پر شدتِ عصیان اور استغراق ضلالت وفساد سے ایک ایسی تاریکی چھا گئی ہے جو نور ایمان سے بالکل مغائر ہے، اور اس کے ساتھ عبودیت الٰہی کا نور جمع نہیں ہوسکتا۔ پس نماز سے بھی اسے انکار ہے اور روزہ کی بھی اسے توفیق نہیں۔ شریعت کے تمام حکموں کو اس نے چھوڑ دیا ہے اور اس کی زندگی یکسر ابلیسی ہوگئی ہے، جس میں خدا پرستی کے لیے چند گھڑیاں اور چند منٹ بھی نہیں ہیں:

اُولٰئِکَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَ اَبْصَارِهِمْ، وَاُولٰئِکَ هُمُ الْغَافِلُوْنَ. (١٦:١٠٩)

''یہ وہ لوگ ہیں کہ خدا نے ان کے دلوں، ان کے کانوں، اور ان کی آنکھوں پر مہر لگا دی ہے اور یہ وہ ہیں کہ غفلت میں گم ہو گئے ہیں!''

اُمرائے فُسّاق و روسائے فجار

برکات رمضان سے محرومی

پس رمضان المبارک میں ایک گروہ تو تارکین صیام کا ہے، جن کے لیے ماہ مقدس کی برکتوں میں کوئی حصہ نہیں رکھا گیا، اور جن کی نفس پرستی پر روزہ رکھنا بہت ہی شاق گزرتا ہے۔

انہماک شہوات

ان میں ایک جماعت امرا اور روسا کی ہے، جو فسق وفجور کی تاریکی میں ایسے کھوئے گئے

ہیں کہ تقویٰ اور احتساب کی ایک ہلکی سی شعاع بھی ان کے سیاہ خانہ عمل پر نہیں پڑتی، اور استغراقِ لہوولعب اور انہماکِ شہوات ولذات نے انھیں بالکل اپنی طرف مشغول کرلیا ہے!

ضبطِ جذبات کا فقدان

روزہ کی اصل صبر اور تقویٰ ہے۔ صبر کی حقیقت یہ ہے کہ خواہشوں میں ضبط وتحمل پیدا ہو اور کسی مقصد اعلیٰ کے لیے شدائد اور تکالیف برداشت کی جائیں۔ پس اس کے لیے ضبط و تحمل کی، ایثار و احتساب کی، القائے روح اور طہارت نفس کی ضرورت ہے۔ مگر ان کا نفسِ شریر اپنی بہیمی خواہشوں میں اس درجہ بے قابو ہوگیا ہے کہ وہ تکلیف اور ایثار کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اور ان کی طبیعت خواہشوں کی غلام ہے اور نفس پرستیوں کی عادی ہوچکی ہے۔ پس وہ ایک گھنٹہ بھی ضبطِ جذبات وتحملِ نفس کے ساتھ بسر نہیں کر سکتے۔

آسمانی لعنتوں کی بارش

وہ ماہِ مقدس جو نزول سعادت کی یادگار تھا، جو مومنوں کے لیے نیکیوں اور خدا پرستیوں کا سرچشمہ تھا، جو ہمیں تحمل مصائب اور مرضات الٰہیہ کی راہ میں ایثار نفس کی تعلیم دیتا تھا، آتا ہے اور گزر جاتا ہے، پر ان کے اعمالِ شیطانیہ اور افعالِ خبیثہ میں رائی برابر بھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ پھر ان میں کتنے ہیں جو عین رمضان المبارک کے اندر شرب خمر اور زنا وفسق میں چارپایوں اور حیوانوں کی طرح ڈوبے رہتے ہیں اور ماہ مقدس کی برکتوں کی جگہ آسمانی لعنتوں کی ان پر بارش ہوتی ہے!

> اذا دخل شهر رمضان فتحت ابواب الجنة و اغلقت ابواب النار و صفدت الشياطين. (رواه البخاری)
>
> ''جب رمضان کا مہینہ آتا ہے تو نیکیوں کے بہشتی دروازے کھل جاتے ہیں، برائیوں کے جہنمی دروازے بند ہوجاتے ہیں، اور ارواح شریرہ وشیطانیہ کا عمل باطل مرجاتا ہے۔''

ارواحِ شریرہ کا تسلّط

لیکن ان کی حالت اس کے بالکل برعکس ہے' ان کے لیے جہنمی دروازے اور زیادہ وسعت کے ساتھ کھل جاتے ہیں اور ارواحِ شریرہ کا تسلّط ان پر اور زیادہ سخت ہو جاتا ہے:

وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ. (۳۶:۴۳)

''اور جو شخص ذکرِ رحمٰن سے جی چراتا ہے' ہم اس پر شیطان کو مسلّط کر دیتے ہیں' پھر وہی (شیطان) اس کا ہم نشین و مشیر ہوتا ہے۔''

حلقۂ شیاطین و مجمعِ ابالسہ

ان کے وہ مصاحب اور ندیم جو ہر وقت ذریّت شیطانی کی طرح ان کے اردگرد رہتے ہیں اور ان کے وہ عمّال اور نوکر چاکر جو خدا کی طرح انھیں پوجتے اور مشرکوں کی طرح ان کے آگے زمیں بوس ہوتے ہیں، یہ سب کچھ دیکھتے ہیں' مگر شیطان نے ان کی زبانوں پر مہر لگا دی ہے' اور انسان کی بندگی کی خباثت نے خدا کا خوف ان کے دلوں سے محو کر دیا ہے۔ پس ان میں سے کسی کی بھی زبان نہیں کھلتی کہ حق و معروف کی صدا بلند کرے اور گونگا شیطان نہ بنے' جو ایمان کی موت اور خدا پرستی کا خاتمہ ہے۔

فتنۂ علمائے سُوء

فریسیوں اور صدوقیوں کا سا غرور

پھر اس سے بھی بڑھ کر ماتم انگیز منظر یہ ہے کہ ان امرائے فاسقین رؤسائے فاجرین کے حاشیہ نشینوں اور وابستگان دولت کی فہرست میں بہت سے علماء و صوفیا کے نام بھی نظر آتے ہیں' جو اپنے تئیں مسندِ نبوّت کا جانشین اور فضائلِ رسالت کا وارث حقیقی سمجھتے ہیں اور اپنے اتقاء و تقدّس کے دامنوں کو ہزاروں انسانوں سے سنگِ اسود کی طرح بوسہ دلاتے اور اپنے بڑے بڑے دامنوں کی عباؤں کو عہد مسیح کے فریسیوں اور صدوقیوں کی طرح غرور فضیلت و کبرِ

تقدس سے حرکت دیتے ہیں!

توہینِ شریعت

ان کو اس فضیلت و پیشوائی کا بڑا ہی گھمنڈ ہے۔ وہ جب اپنے مریدوں اور معتقدوں کے جمگھٹے میں تسبیح مکر و سجادۂ زُور کے ساز و سامانِ فریب کے ساتھ بیٹھتے ہیں تو خدا کی الوہیّت اور رسولوں کی قدوسیّت سے اپنے تقدّس و کبریائی کو کسی طرح کمتر نہیں سمجھتے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کا وجود شریعت کی توہین اور دین الٰہی کی سب سے بڑی تذلیل ہے۔

قوم کے لیے شدید ترین فتنہ

قوم کا بدتر سے بدتر اور جاہل سے جاہل گروہ بھی ان خلفائے شیاطین و نائبینِ ابلیسِ لعین سے زیادہ نیک اور زیادہ راستباز ہے۔ کیونکہ یہ علمائے سوء ہیں' اور ان کے فتنہ سے بڑھ کر قوم کے لیے کوئی فتنہ نہیں۔ ہواء نفس ان کی شریعت ہے' درہم و دنانیران کا قبلہ ہے' نفس و شیطان ان کا معبود ہے اور طلب جاہ و مال ان کا ذکر و فکر ہے۔

زبان بندی کی وجہ

چونکہ ان کو امرائےفُسّاقُ اور روسائے و فجار کے دربار سے بڑے بڑے وظائف و مناصب ملتے ہیں اور نذر و نیاز کی فتوحات کا پیہم سلسلہ جاری رہتا ہے' اس لیے ان کی زبانیں گونگی ہوگئی ہیں اور اپنے منصبوں اور تنخواہوں اور نذر و نیاز کی لعنت کے بند ہو جانے کے خوف سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ایک لفظ بھی اپنی زبان سے نہیں نکالتے۔

استحقاق عذاب کا باعث

وہ اپنی آنکھوں سے رمضان المبارک کی توہین کا تماشا دیکھتے ہیں اور چپ رہتے ہیں۔ ان کے سامنے ماہ مقدس کے اندر حکم الٰہی کو ٹھکرایا جاتا ہے اور وہ خوش ہوتے ہیں۔ نہ تو کسی شیطانِ اخرس کی زبان معروف کے لیے کھلتی ہے نہ کسی خلیفۂ ابلیس کو شریعت کی علانیہ توہین پر غیرت آتی ہے۔ امر بالمعروف کو انہوں نے یکسر بھلا دیا ہے اور نہی عن المنکر کو اپنے مقاصد

نفسانیہ کے خلاف دیکھ کر نسیاً منسیاً کر دیا ہے۔ اگر وجودِ مقدس حضرت صادق مصدوقؐ کا حکم باطل نہیں تو میں کہتا ہوں کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب ایسے ہی علمائے سوء کو ہوگا:

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰه علیه وسلم: ان اشد الناس عذابًا یوم القیامة' عالم لم ینفعه اللّٰه بعلمه (رواہ ابن عساکر عن ابی هریرة والبیهقی فی شعب الایمان و الطبرانی فی الصغیر والحاکم فی المستدرک.)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: قیامت کے دن جن لوگوں کو سخت ترین عذاب ہوگا' ان میں سے ایک وہ عالم بھی ہے جس کے علم سے کچھ نفع و فائدہ نہیں پہنچتا۔ اس حدیث کو ابن عساکر نے ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ بیہقی نے شعب الایمان میں' طبرانی نے صغیر میں اور حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے۔"

فتنۂ الحاد و متفرنجین

حدود اللہ کے خلاف نفسانی جسارت

پھر تارکینِ صیام کے گروہ میں اس سے بھی بڑھ کر ایک فتنے نے سر اٹھایا جس کا اثر بہت شدید اور جس کی آفات سخت متعدی ہیں اور جس کے اندر شریعت کا استخفاف و استہزاء پہلے سے کہیں زیادہ اور حدود اللہ کے خلاف نفسانی جسارت پہلوں سے کہیں بڑھ کر ہے۔ نہایت درد اور رنج کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ ان لوگوں کا فتنۂ الحاد و اباحت ہے جنہیں' افسوس ہے کہ الحاد سے بھی جہل کے سوا اور کچھ نہ ملا حالانکہ الحاد نے اکثر غرور علم کے ساتھ ظہور کیا ہے۔

استخفافِ شریعت

یہ لوگ نشئتِ مدنیہ حدیثہ کی مہذب و متمدن مخلوق ہیں جو نئی درس گاہوں کی کائناتِ جہل و غرور میں پیدا ہوئی ہیں اور جو فی الحقیقت غرورِ ادعاء اور جہل افساد کے سوا اور کچھ نہیں ہیں۔ پہلی جماعت کی اگر غفلت شدید تھی اور معصیت جُرأت اور جسارت تک پہنچ گئی تھی' تو

افسوس کہ اس گروہ کے اندر غفلت کی جگہ جسارت اور اعتراف کی جگہ انکار و سرکشی اور کھلم کھلا استخفافِ شریعت و استہزاء حدود اللہ پایا جاتا ہے۔

بدترین اقوالِ باطلہ

ان میں سے اکثروں کے نزدیک روزہ عرب جاہلیت کے فقر و فاقہ کی ایک وحشیانہ یادگار ہے جو یا تو اس لیے قائم کی گئی تھی کہ غذا میسّر نہیں آتی تھی یا منجملہ ان عالمگیر غلط فہمیوں کے ایک توہم پرستی تھی جو اہل مذاہب میں ابتدا سے پھیلی ہوئی ہیں اور انھوں نے ترک لذائذ اور تعذیب جسم کو وسیلہ نجات سمجھ لیا ہے! **فاعاذنا اللّٰه سبحانه مما يعتقد الزنادقة!**

مفسدہ پردازی کی حد ہوگئی!

ان میں بہت سے لوگ اپنے الحاد کو شریعت کی نسبت سے انجام دینے کے شائق ہیں۔ وہ **تطبیق بین العقل و النقل' العلوم الجدیده و الاسلام** اور **الاسلام هو الفطرة و الفطرة هِيَ الاسلام**" کا راستہ اختیار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر فرض ہوا بھی تھا تو: **وَالَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ طَعَامٌ فِدْيَةٌ**" نے ثابت کر دیا کہ ایک مسکین کو کھانا کھلا کر ہم روزے کے پنجۂ عذاب سے نجات پا سکتے ہیں۔ پس یہ ہمارے لیے بس کرتا ہے:

فاولئک هم المتفرنجون الذين يفسدون فى الارض و لا يصلحون!

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ' اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ. (۱۲:۱۱)

''اور عجب تو یہ کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین پر فساد نہ پھیلاؤ تو کہتے ہیں کہ ہم تو قوم کے مصلح ہیں! یقین کرو کہ یہی لوگ ہیں جو دنیا کے لیے مفسد ہیں مگر اپنے فساد سے واقف نہیں ہیں!''

مرتدانہ شوخی

پھر آہ! میں ان لوگوں کی حالت تم سے کیا کہوں کہ میرے سامنے صدہا نمونے بڑے

ہی دردانگیز موجود ہیں۔ جس ملحدانہ جسارت، جس مارقانہ جرأت اور جس مرتدانہ شوخی کے ساتھ میں نے انہیں عین رمضان المبارک کے ایام میں (باوجود صحت و عافیت' قوت اور توانائی و بغیر سفر و عذراتِ شرعیہ) اپنے دوزخ شکم کی ایندھن جمع کرتے دیکھا ہے' میں نہیں سمجھتا کہ اسے کیونکر بیان کروں؟ وہ اس بے پروائی کے ساتھ ماہ مقدس میں کھاتے پیتے ہیں گویا انھیں اس گروہ سے کوئی تعلق نہیں جس کے لیے رمضان کاوُرُودِ صبر و اتقاء کا پیغام تھا!

جرم و بغاوت کا فتنہ

احکامِ الٰہیہ کا استہزاء

ایک چیز غفلت و تساہل ہے اور ایک انکار و تمرد ہے۔ بلاشبہ پرانے لوگوں میں بھی ہزاروں اشخاص ایسے موجود ہیں جن میں تسلّطِ نفس و شیطان سے معاصی و ذنوب کی نہایت کثرت ہوگئی ہے اور ان پر غفلت و تساہل نے ایک دینی موت طاری کر دی ہے۔ علی الخصوص امراء و روسائے مسلمین کہ ان میں سے اکثر احکام و اوامر شرعیہ سے بے پروا و غافل ہیں۔ تاہم ان میں ایک فرد بھی ایسا بمشکل ملے گا جو احکامِ الٰہیہ کا صریح استہزاء کرتا ہو اور خدا کے شعائر کی بے باکانہ ہنسی اڑاتا ہو۔ مگر میں نے اس ''متمدّن و روشن خیال'' طبقہ میں بکثرت ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو علانیہ احکام اسلامیہ کی ہنسی اڑاتے ہیں اور تعجب کرتے ہیں کہ لوگ کیسے احمق اور نادان ہیں جو مفت میں بھوکے رہتے اور اپنے نفس کو تکلیف و مشقت میں ڈالتے ہیں؟

قَالُوْا: مَاهِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا' نَمُوْتُ وَ نَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ. (۲۴:۴۵)

''ہماری یہ دنیاوی زندگانی کچھ بھی نہیں ہے' ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہمیں کوئی مارتا نہیں' زمانہ کی روش ہی ایسی چلی آتی ہے۔''

قُلْ أَبِاللّٰهِ وَاٰيَاتِهٖ وَرُسُلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ! (۹:۶۵)

''ان ملحدوں سے کہو کہ آیا تم اللہ اس کی آیات اور اس کے رسولوں کے ساتھ ہنسی کرتے ہو!''

مماثلتِ یہود و نصاریٰ

آغاز اسلام میں یہود و نصاریٰ احکامِ شریعت کی ہنسی اڑاتے تھے، جن کا حال سورۂ مائدہ میں خدا نے بیان فرمایا ہے:

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَکُمْ ھُزُوًا وَّلَعِبًا. (۵:۵۷)

''اے مسلمانو! ان لوگوں کا رشتہ نہ پکڑو جنھوں نے تمہاری شریعت کو ہنسی ٹھٹھا اور ایک طرح کا کھیل بنالیا ہے۔''

ان کا حال یہ تھا کہ:

وَاِذَا نَادَیْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ اتَّخَذُوْھَا ھُزُوًا وَّ لَعِبًا، ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَوْمٌ لَّا یَعْقِلُوْنَ. (۵:۵۸)

''جب تم نماز کے لیے صدا بلند کرتے ہو تو یہ ہنسی اور ٹھٹھا کرتے ہیں۔ یہ اس لیے ہے کہ ان کی عقلیں کھوئی گئی ہیں۔''

سورۂ بقرہ میں انھیں کی نسبت فرمایا ہے:

زُیِّنَ لِلَّذِیْنَ کَفَرُوا الْحَیَاۃُ الدُّنْیَا وَیَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا. (۲:۲۱۲)

''کافروں کی نظروں میں صرف دنیا کی زندگی ہی سما گئی ہے۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ تمسخر کرتے ہیں جو اللہ پر ایمان لائے ہیں۔''

ضلالت گاہِ تمدن

سو آج یہ حالت، خود مسلمانوں کا یہ نیا متمدّن فرقہ ہمیں دکھلا رہا ہے اور ضمناً خبر دیتا ہے کہ اس کا شجرۂ نسبِ ضلالت کن لوگوں سے ملتا ہے؟ نماز سے بڑھ کر اس گروہ کے لیے

کوئی مبغوض ومکروہ حکم نہیں، کیونکہ علاوہ ایک وحشیانہ حرکت ہونے کے اس کے اکثر اجزاء ایسے ہیں جو متمدن زندگی کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ وضو سے سوٹ کی آستینوں کا کلف خراب ہو جاتا ہے اور سجدہ میں جانے سے پتلون پر گھٹنوں کے پاس شکنیں پڑ جاتی ہیں:

وَاِذَا قِيلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ. (۷۷:۴۸)

''اور جب انھیں نماز پڑھنے کو کہا جاتا ہے تو وہ لوگ نماز ادا نہیں کرتے!''

ہلاکت آفرین مزلّت

جب نماز کے ساتھ یہ سلوک ہے تو روزہ کی نسبت پوچھنا ہی عبث ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ موجودہ متمدن زندگی نے دن میں پانچ مرتبہ اقلاً غذا کا حکم دیا ہے، کوئی وجہ نہیں کہ ایک مہینے تک کے لیے انسان بالکل غذا ترک کر دے:

قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ. (۹:۳۰)

''خدا انھیں غارت کرے، وہ کہاں بھٹکے جا رہے ہیں!''

اَلْمُصْلِحُوْنَ الدَّجَّالُوْن کا فتنہ

رسولوں کی سی فغاں سنجی

پھر عجیب تو یہ کہ اس گروہ میں ایک جماعت مصلحین ملّت وائمہ اُمّت کی ایسی بھی ہے جو اپنے تئیں تمام قوم کا پیشوا اور ہادیٔ حقیقی سمجھتی ہے اور چونکہ اسے یقین ہے کہ ابھی مسلمان احکامِ شریعت سے متنفر نہیں ہوئے ہیں، گو غافل ہیں، اس لیے جب کبھی مجلسوں اور کانفرنسوں کے اسٹیجوں پر ان کے سامنے آتی ہے، تو یکسر پیکرِ اسلام وایمان و مجسمۂ شریعت واسلامیّت بن جاتی ہے اور جس شریعت کے اولین ارکان وعبادات تک سے اسے عملاً انکار ہے اس کے ماننے والوں کے ادبار وغفلت پر نبیوں کی طرح روتی اور

رسولوں کی طرح فُغاں سنج ہوتی ہے۔

تذلیل وتحقیر احکامِ شرعیہ

پھر نماز کا فلسفہ اس کی زبان پر ہوتا ہے۔ روزہ کی فلاسفی پر اس سے بہتر کوئی لیکچر نہیں دے سکتا۔ اسلامی عبادات کے مصالح وحکم کے اعلان کا اس سے بڑھ کر کوئی واعظ نہیں حالانکہ خود اس کے نفس کا یہ حال ہے کہ احکامِ شریعت کی تذلیل وتحقیر کا اس سے بڑھ کر کوئی فتنہ نہیں ہے اور اس کا وجود الحاد وزندقہ کے سوا اور کچھ نہیں:

يُخَادِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّا اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ. (۲:۱۰)

''یہ لوگ ہیں کہ اللہ کو اور مسلمانوں کو اپنے نفاق سے دھوکا دینا چاہتے ہیں' مگر نہیں جانتے کہ درحقیقت وہ اپنے نفس ہی کو دھوکا دے رہے ہیں!''

ایک بشارت عظمٰی

مبارک تغیر وانقلاب کے آثار

البتہ دو تین سال سے تعلیم یافتہ طبقہ میں ایک مبارک تغیر وانقلاب کے آثار ضرور نظر آ رہے ہیں اور میں بہت سے ایسے اربابِ انابت ورجوع الی اللہ کو جانتا ہوں' جن کے دلوں پر پچھلے مصائب اسلامی سے تنبیہ واعتبار کی ایک کاری چوٹ لگی ہے اور ان کے اندر مذہبی اعمال کی طرف یکا یک میلان ورجوع پیدا ہو چلا ہے۔ سوفی الحقیقت ایسے مبارک نفوس اس گروہ کی عام حالت سے بالکل مستثنیٰ ہیں اور اگر ان کو استقامت وثبات نصیب ہو تو کچھ شک نہیں کہ ہم سب کو چاہیے کہ ان کے ہاتھوں کو جوشِ عقیدت سے بوسہ دیں اور مقدس عباؤں کے دامنوں کی جگہ ان کے فرنگی کوٹوں کے دامنوں کو آنکھوں سے لگائیں۔ کیونکہ موجودہ عہد میں اسلام وملت کی خدمت کے لیے اس گروہ سے بڑھ کر اور کوئی جماعت مفید تر نہیں ہو سکتی اور اس کی اصلاح سے بڑھ کر عالم اسلامی کے لیے کوئی بشارت نہیں!

لَعَلَّ اللّٰهُ یُحۡدِثُ بَعۡدَ ذٰلِکَ اَمۡرًا. (۶۵:۱)

''بہت ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے بعد کچھ نہ کچھ کام ہی نکال لے!''

عاملینِ احکام وصائمینِ رمضان

ظاہر وباطن کا فرق

وابستگانِ دامنِ شریعت کی سراغ رسانی

......یہ حال تو تارکین صیام کا تھا۔ اب آؤ ان کو دیکھیں جو عاملین وصائمین میں داخل ہیں۔ یہ سرگزشت ان کی تھی جنہوں نے شریعت کو چھوڑ دیا' لیکن آؤ' اب ان کے سراغ میں نکلیں جو ابھی تک دامنِ شریعت سے وابستہ ہیں۔ اب آؤ ان کو جو دریا کے کنارے خیمہ زن ہیں!

پھر کیا وہ سیراب ہیں؟ کیا وہ پہلوں کی طرح پیاسے نہیں؟

حقیقت سے ناآشنائی

افسوس کہ حقیقت کی آنکھیں اب تک خونبار ہیں اور عشقِ مقصود کا قدم یہاں تک پہنچ کر بھی کامیاب نہیں۔ یہ سچ ہے کہ پہلوں نے دریا کی راہ چھوڑ دی اور دوسرے نے اس کے کنارے اپنا خیمہ لگایا اور اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اس کا اجر انھیں ملنا چاہیے، لیکن اگر دریا کا قرب دریا کے لیے نہیں، بلکہ دریا کے پانی کے لیے تھا تو پہلا گروہ پانی سے دور رہ کر پیاسا رہا اور دوسرے اس تک پہنچ کر پیاسے ہیں!

اُنہیں کشتی نہیں ملتی' اُنہیں ساحل نہیں ملتا!

احکامِ الٰہی کا مغز وچھلکا

یہ وہ لوگ ہیں کہ انہوں نے شریعت کے حکموں کو تو لے لیا ہے مگر اس کی حقیقت چھوڑ دی ہے۔ یہ وہ ہیں کہ انہوں نے چھلکے پر قناعت کی اور اس کے مغز کو ان لوگوں کی طرح چھوڑ دیا جنہوں نے چھلکا اور مغز دونوں کو چھوڑ دیا ہے۔

جسم بغیر روح انسان نہیں

یہ جسم کو انسان سمجھتے ہیں، حالانکہ جسم بغیر روح کے ایک سڑ جانے والی لاش ہے۔ یہ نقاب کو چہرۂ محبوب سمجھتے ہیں حالانکہ عیش نظارہ اس نے پایا جس نے نقاب کی جگہ صورت سے عشق کیا۔

بے نتیجہ کارکردگی سے بیکاری بہتر

کاشت کار پھل کے لیے بیج بوتا ہے اور پھولوں کی ساری محبوبیّت اس میں ہے کہ اس کی خوشبو سے دماغ معطّر ہو جاتا ہے۔ پس اگر بیج پھل نہ لایا اور پھولوں نے خوشبو نہ دی تو کاشت کار کے لیے ہل جوتنے کی جگہ بہتر تھا کہ وہ گھر میں آرام سے سوتا اور بے خوشبو کے پھولوں سے وہ خشک ٹہنی زیادہ قیمتی ہے جو چولھے میں جلائی جا سکے:

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ. (۱۰۷:۴-۵)

”ان نمازیوں کے لیے ہلاکت ہے جو اپنی نمازوں سے غفلت شعاری کرتے ہیں!“

عبادات کی غرض وغایت اور ذریعہ حصول

ضروری اجزاء احکام شریعت

نماز ہو یا روزہ، شریعت کے جتنے احکام اور جتنی طاعات ہیں، سب کا حال یہ ہے کہ ایک شے تو ان میں مقصودِ بالذّات ہوتی ہے اور ایک اس مقصود کے حاصل کرنے کا وسیلہ۔

نماز کا مقصود و نتیجہ

نماز میں اصلی شے عبودیّت الٰہی، انکسار و تذلّل، خضوع و خشوع، ابتہال و توجہ الی اللہ، و انقطاع و تبتل ہے اور نتیجہ اس کا تمام فواحش و منکرات اور رذائل و خبائث سے اجتناب و تحفّظ ہے۔

مقصد حج اور اس کا فلسفہ

حج کا مقصود دعوت اسلامی کی نشاۃِ اولیٰ کی یادگار، اسوۂ ابراہیمیؑ کی تجدید، مرکز توحید پر تمام

شعوب وقبائل موحدین کا اجتماع‘ اور وحدت اسلامی واتحاد ممالک وامم کا ظہور وقیام ہے اور نتیجہ اس کا تعلق الٰہی کی تقویت‘ احکام شریعت کا انقیاد اور رفع انشقاق واختلاف‘ وانسدادِ تفریق وتشتتِ کلمہٴ اسلام ہے۔

روزہ، فاقہ کشی کا نام نہیں

اسی طرح روزہ بھی صرف بھوک پیاس کا نام نہ تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر فقیر عابد ہوتا اور ہر فاقہ کش مومن کامل‘ حالانکہ بہت سے بے نصیب مسکین ہیں جن کی فاقہ کشی انہیں وہ شے نہیں دے سکتی جو ایک خدا پرست پادشاہ لذائذ ونعائم کے خوان ہائے پرتکلف کے سامنے بیٹھ کر پالیتا ہے۔

روزہ کی فلاسفی

اصل شے روح کا تقویٰ‘ نفس کی طہارت‘ خواہشوں کا حبس‘ قوتوں کا احتساب‘ اور جذبات کا ایثار ہے اور چونکہ مخلوقات کے لیے غذا کی خواہش سب سے بڑی مجبور کن خواہش ہے‘ اس لیے درسِ صبر‘ تعلیمِ تحمل‘ تولیدِ فضائل اور نفوذِ اتّقاء وایثارِ نفس کے لیے اسی خواہش کے ترک کرنے کا حکم دیا گیا‘ اور اس کو تمام روحانی فضائل کے کسب اور تمام اخلاقی رذائل سے اجتناب کا وسیلہ قرار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ روزہ کا حکم دینے کے بعد اس کی علّت ایک نہایت ہی جامع ومانع اصطلاح شریعت میں واضح کر دی گئی کہ:

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ! (تا کہ تم برائیوں سے بچو (اور پرہیزگار بننے کی صلاحیت پیدا کرو)

تقویٰ بچنے اور پرہیز کرنے کو کہتے ہیں۔ قرآن حکیم کی اصطلاح میں اس سے مقصود تمام برائیوں اور ذلتوں سے بچنا اور پرہیز کرنا ہے۔

فضیلتِ روزہ

اصلِ مقصود

پس روزہ وہ ہے جو ہمیں پرہیزگاری کا سبق دے‘ روزہ وہ ہے جو ہمارے اندر تقویٰ اور طہارت پیدا کرے‘ روزہ وہ ہے جو ہمیں صبر اور تحمل شدائد وتکالیف کا عادی بنائے‘ روزہ وہ

ہے جو ہماری تمام بہیمی قوتوں اور غضبی خواہشوں کے اندر اعتدال پیدا کرے‘ روزہ وہ ہے جس سے ہمارے اندر نیکیوں کا جوش‘ صداقتوں کا عشق‘ راستبازی کی شیفتگی اور برائیوں سے اجتناب کی قوت پیدا ہو۔ یہی چیز روزہ کا اصلِ مقصود ہے اور باقی سب کچھ بمنزلہ وسائل و ذرائع کے ہے۔

محض بھوک و پیاس

اگر یہ فضیلتیں ہمارے اندر پیدا نہ ہوئیں تو پھر روزہ‘ روزہ نہیں ہے بلکہ محض بھوک کا عذاب اور پیاس کا دکھ ہے۔ کیا نہیں دیکھتے کہ احادیث نبویہ میں روزہ کی برکتوں کے لیے ''احتساب'' کی بھی شرط قرار دی گئی؟

من مام صیام رمضان ایمانا و احتسابا غفرلہٗ ما تقدم من ذنبہٖ. (رواہ البخاری)

''جس شخص نے رمضان کے روزے احتساب نفس کے ساتھ رکھے‘ سو خدا اس کے تمام پچھلے گناہ معاف کردے گا۔''

لاحاصل روزہ

پھر کتنے لوگ ہیں جو روزہ رکھتے ہیں اور ساتھ ہی ایک سچے صائم کی پاک اور ستھری زندگی بھی انہیں نصیب ہے؟ آہ! میں ان لوگوں کو جانتا ہوں جو ایک طرف تو نمازیں پڑھتے اور روزے رکھتے ہیں‘ دوسری طرف لوگوں کا مال کھاتے‘ بندوں کے حقوق غصب کرتے‘ اعزہ و اقارب کے فرائض پامال کرتے‘ بندگان الٰہی کی غیبتیں کرتے‘ ان کو دکھ اور تکلیف پہنچاتے‘ طرح طرح کے مکروفریب کو کام میں لاتے ہیں یعنی اپنے دل کے شکم کو تو گناہوں کی کثافت سے آسودہ اور سیر رکھتے ہیں جبکہ ان کے جسم کا پیٹ بھوکا ہوتا ہے۔ کیا یہی وہ روزہ دار نہیں جن کی نسبت فرمایا کہ:

کم من صائم لیس لہ من صومہ الا الجوع والعطش

(بخاری و ابن ماجہ)

''کتنے ہی روزہ دار ہیں جنہیں ان کے روزے سے سوا بھوک اور پیاس کے کچھ نہیں ملتا!''

بے سود قیام

وہ راتوں کی تراویح میں قرآن سنتے ہیں اور صبح کو اس کی منزلیں ختم کرتے ہیں، لیکن اس کی نہ تو ہدایتیں ان کے سامعہ سے آگے جاتی ہیں اور نہ اس کی صدائیں حلق سے نیچے اترتی ہیں:

و رب قائم ليس له من قيامه الا السهر . (رواه ابن ماجه)

''اور کتنے راتوں کو ذکر و تلاوت کا قیام کرنے والے ہیں کہ انہیں اس سے سوائے شب بیداری کے اور کچھ فائدہ نہیں!''

پھر فرمایا:

رب تَلا للقرانٰ والقرانٰ يلعنه.

''بہت سے قرآن تلاوت کرنے والے ایسے ہیں کہ قرآن ان پر لعنت بھیجتا ہے۔''

کیونکہ انھوں نے اپنی بدکرداریوں اور بے عملیوں سے قرآن کی تلاوت وسماعت کو لہو ولعب بنا رکھا ہے!

روزہ باعثِ زحمت

پھر کتنے ہی روزہ دار ہیں، جن کا روزہ برکت ورحمت ہونے کی جگہ بندگانِ الٰہی کے لیے ایک آفت ومصیبت ہے اور بہتر تھا کہ وہ روزہ نہ رکھتے۔ دن بھر بھوکا رہ کر اور رات کو تراویح پڑھ کر وہ ایسے مغرور و بدنفس ہو جاتے ہیں، گویا انہوں نے خدا پر، اس کے رسولؐ پر، اور اس کے تمام بندوں پر ایک احسان عظیم کر دیا ہے اور اس کے معاوضہ میں انہیں کبریائی اور خود پرستی کی دائمی سند مل گئی ہے۔ اب اگر وہ انسانوں کو قتل بھی کر ڈالیں جب بھی ان سے کوئی پرسش نہیں۔ وہ تمام دن درندوں اور بھیڑیوں کی طرح لوگوں کو چیرتے پھاڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم روزہ دار ہیں!

خطا کار معترف

سو ایسے لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ زمین اور آسمان کا خداوند ان کے فاقہ کرنے کا محتاج نہیں ہے' اور ان کے اس روزہ رکھنے سے' اس عاجز و درماندہ اور اپنی خطاؤں کا اعتراف کرنے والے گناہ گار کا روزہ نہ رکھنا ہزار درجہ افضل ہے۔ جو کو خدا کا روزہ نہیں رکھتا' مگر اس کے بندوں کو بھی نقصان نہیں پہنچاتا۔

انکسار و شکستگی کے بغیر روزہ نامقبول

روزہ کا مقصود' نفس کا انکسار اور دل کی شکستگی تھی۔ پھر اے شریر انسان! تو روٹی اور پانی کا روزہ رکھ کر خون اور گوشت کو کھانا کیوں پسند کرتا ہے؟

اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا؟ فَکَرِھْتُمُوْهُ. (۱۲:۴۹)

''آیا تم میں سے کوئی پسند کرے گا کہ وہ اپنے بھائی کا مردہ گوشت کھائے؟ نہیں' تم اسے ناپسند کرو گے۔''

(حدیث میں ہے):

من لم یدع قول الزور والعمل به' فلیس للّٰه حاجة فی ان یدع طعامه و شرابه' (رواه البخاری)

''جس شخص نے مکر و فریب نہ چھوڑا اور اتقائے صیام پر عمل نہ کیا' سو خدا کو کوئی حاجت نہیں کہ اس کے کھانے اور پینے کو چھوڑائے اور اسے بھوکا رکھے۔''

خدا فرماتا ہے:

لَنْ یَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلٰکِنْ یَّنَالُهُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ. (۳۷:۲۲)

''اللہ تک تمہاری قربانیوں کا گوشت نہیں پہنچتا اور نہ ان کا خون' لیکن تمہارا تقویٰ اور تمہاری نیت پہنچتی ہے۔

مردم آزار صائم

اگر قربانی کا گوشت خدا تک نہیں پہنچتا' تو اے مغرورِ عبادت اور مردم آزار صائم! تیری بھوک اور پیاس بھی خدا تک نہیں پہنچتی' بلکہ وہ چیز پہنچتی ہے جو تیرے دل اور تیری نیت میں ہے۔ اگر تجھے وہ نعمت حاصل نہیں' تو تجھے معلوم ہو کہ تیری ساری ریاضت اکارت گئی اور تیری ساری مشقّت بیکار ہے!

محرومی کی ایک مثال

پس وہ لوگ جنھوں نے روزہ نہ رکھا اور خدا کا حکم توڑا اور وہ جنھوں نے (روزہ) رکھا' پر اس کی حقیقت حاصل نہ کی' ان دونوں کی مثال ان دو لڑکوں کی سی ہے' جن میں سے ایک تو مدرسہ جانے کی جگہ گھر میں پڑا رہتا ہے اور دوسرا مدرسہ میں تو حاضر ہوتا ہے' لیکن پڑھنے کی جگہ دن بھر کھیلتا ہے۔ پہلا لڑکا مدرسہ نہ گیا اور علم سے محروم رہا۔ دوسرا گیا اور پھر بھی محروم رہا۔ البتہ جانے والے کو نہ جانے والے پر ایک درجہ فضیلت حاصل ہے' لیکن اگر وہ مدرسہ جا کر لوگوں کو تکلیف پہنچاتا ہے تو بہتر تھا کہ نہ جاتا۔

شریعت کی غربت اور حالت زار

پھر خدارا غور کرو کہ ہمارا ماتم کیسا شدید اور ہماری بربادی کیسی الم ناک ہے؟ کس طرح حقیقت ناپید اور عملِ صحیح مفقود ہو گیا ہے؟ اس سے بڑھ کر شریعت کی غربت اور احکام الٰہیہ کی بیکسی کیا ہو گی کہ مسلمانوں نے یا تو اسے چھوڑ دیا ہے' یا لباس لے لیا ہے' لیکن صورت چھوڑ دی ہے! آہ' یہ کیسی رُلا دینے والی بدبختی اور دیوانہ بنا دینے والا ماتم ہے! کہ یا تو تم اس کے حکموں پر عمل نہیں کرتے' یا کرتے ہو تو اس طرح کرتے ہو' گویا خدا سے ٹھٹھا اور تمسخر کر رہے ہو! فوا اسفا' واحسرتا' وامصیبتا! جب حالت یہاں تک پہنچ چکی ہے تو تنزل کا شکوہ کیوں' اور تباہی ملت کی شکایت کیا؟ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ؟ (۵۴:۱۵تا۵۱)

ارکان وعباداتِ اسلامیہ کی فلاسفی

تاریخ فرضیتِ صوم

اہمیّتِ صوم

عباداتِ اسلامیہ کی ترتیبِ فرضیّت اگر اسرار ومصالح پر مبنی نہ ہوتی تو تمام عبادات میں سب سے پہلے رمضان کے روزے فرض ہوتے۔

نماز کی تقدیم

تقدمِ زمانی کے لحاظ سے تمام فرائض میں سب سے پہلے نماز فرض ہوئی۔ ابتداء میں وہ اگرچہ نہایت سادہ ومختصر عبادت تھی، تاہم تکبیر وتہلیل اور قرأت سے اس کا پیکرِ روحانی خالی نہ تھا۔ جب کفرزار مکہ کی فضاء میں قرآن مجید کی نامانوس مگر مقدّس آیتیں گونجتی تھیں تو کفار اس مختصر عبادت میں بھی رکاوٹ پیدا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کفار نے نماز میں قرأت سے صرف اس بناء پر روک دیا تھا کہ اسکا اثر ان کے بال بچوں پر شدت کے ساتھ پڑتا تھا اور انہیں خوف تھا کہ کہیں وہ مسلمان نہ ہو جائیں۔

تشکیل روزہ

لیکن روزہ ایک غیر محسوس فریضۂ الٰہی ہے۔ رکوع، سجود، قیام، قعود، تکبیر وتہلیل، سے اس کی ترکیب نہیں ہے، جس کی صدائیں دوسروں تک پہنچتی اور انھیں خبردار کر دیتی ہیں۔ وہ ایک عدمی چیز ہے۔ منہیات کے سلب ونفی سے اس کی ترکیب وتقویم ہوتی ہے۔ یعنی اس کا وجود محض بعض خواہشوں کے روک دینے اور بعض ضروریاتِ جسمی کے حبس وضبط سے متشکل ہوتا ہے۔ پس ظاہر ہے کہ ایسی غیر محسوس چیز میں کسی کو رکاوٹ پیدا کرنے کا اور مانع آنے کا کیا موقع مل سکتا۔

عقلی تقدّم وتاّخر

اس سے ظاہر ہوا کہ جب اسلام ہر طرف سے تیروں اور برچھیوں کے حصار میں گھرا

ہوا تھا تو اس حالت میں صرف روزہ ہی ایک ایسی عبادت تھی جو خاموشی کے ساتھ بے روک ٹوک ادا کی جاسکتی تھی۔ پس عقلاً سب سے پہلے اسی کو فرض ہونا چاہیے تھا کہ آغازِ عہد کی مظلومیت و مسکنت میں بآسانی ادا کیا جاسکتا تھا۔

لیکن تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز تو پہلے ہی دن فرض کر دی گئی، مگر روزہ ۲ھ میں فرض ہوا جبکہ مال غنیمت سے مدینہ کا دامن بھر گیا تھا اور تکبیر و تہلیل کی صداؤں کو ایک فضائے غیر محدود مل گئی تھی۔

آخر اس کے اندر کون سی حکمت پوشیدہ ہے؟ کیا اسلام کا نظامِ عبادت ترکیبِ معکوس پر قائم ہے؟

علتِ تقدم صلوٰۃ

اسرارِ تقدیم و تاخیر

اسلام ایک دین قیم ہے۔ ترتیب و نظام اس کی حقیقت میں داخل ہے۔ پس ضرور ہے کہ عبادات کی فرضیت کی تقدیم و تاخیر میں بھی اسرار و علل پوشیدہ ہوں، اور تدبر و تفکر سے کام لیا جائے تو فی الحقیقت نماز کی تقدیم اور روزے کی تاخیر میں ایک دقیق و اہم نکتہ پوشیدہ ہے۔

مجبورانہ تقویٰ

اگر ہمارے پاس غذائے لطیف نہیں۔ آبِ خوشگوار نہیں، زوجۂ جمیلہ نہیں، غرض وہ تمام چیزیں نہیں، جن کے استعمال سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے تو ایسی حالت میں ان تمام چیزوں سے منہ موڑ لینا کوئی حقیقی تقویٰ نہ ہوگا، بلکہ ایک مجبوری کی شکل ہوگی۔ کیونکہ اگر روزہ نہ رکھیں، جب بھی دن بھر فاقہ ہی سے گزرتی ہے پس اگر مکہ میں روزہ فرض کر دیا جاتا تو وہ اسی قسم کا ایک مجبورانہ تقویٰ ہوتا۔

دلیلِ قوت ایمانی

لیکن مدینہ کی حالت اس سے مختلف تھی، وہاں زمین اپنے خزانے اگل رہی تھی، خوبصورت کنیزیں ہر طرف سے آآ کر جمع ہو رہی تھیں، فتوحات کے آغاز نے طرح طرح

کی نعمتوں کے انبار لگا دیے تھے اور آزادی کے احساس نے ان جذبات کو اور بھی مشتعل کر دیا تھا۔ ایسی حالت میں اگر کوئی شخص ان لذائذ طیّبہ سے احتراز کرتا تو یہ بے شبہ اس کے قوت ایمان وضبط نفس کی دلیل ہوتی۔

صبر وتوکل کی آزمائش گاہ

اسلام درحقیقت صبر وتوکل کی ایک آزمائش اور زہد وتقویٰ کی امتحان گاہ ہے' اس لیے صبر وقناعت کے لیے اس نے مسلمانوں کے زہد وتقویٰ کو روزے کے ساتھ آزمایا اور ایسے وقت میں آزمایا جبکہ لغزش اور ٹھوکر کے اسباب فراہم ہونا شروع ہو گئے تھے۔

آغازِ صیام

عیسائیوں کے روزے کی پابندیاں

جمہور مفسرین کا بیان ہے کہ ابتدائے اسلام میں مسلمانوں نے بھی روزہ بالکل انھیں خصوصیات کے ساتھ اختیار کیا تھا۔ جس کی مثال عیسائیوں کے سلسلۂ عبادات میں قائم ہو چکی تھی۔ یعنی عیسائیوں کے یہاں روزہ نہایت سخت شرائط کا پابند تھا۔ مثلاً اگر کوئی شخص افطار کر کے سوجاتا تھا تو اس پر کھانا پینا' عورت کے پاس جانا حرام ہو جاتا تھا اور اسی نیند کی ابتدا ہی اس کے روزہ کی ابتدا قرار پاتی تھی۔

اسلامی روزے کی آسانی

آغازِ اسلام میں مسلمان بھی انھی شرائط کے پابند تھے، لیکن بعض صحابہؓ نے حالتِ روزہ میں دن بھر کام کیا' شام کے وقت پلٹے تو کھانا تیار نہ تھا۔ بی بی نے کھانا پکانا چاہا۔ مگر ان کو کھانے سے پہلے ہی نیند آ گئی اور بغیر افطار کیے ہوئے سو گئے۔ اس فاقہ کی حالت میں دوسرے روز کا روزہ بھی رکھنا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیہوش ہو گئے۔ یہ تو مجبوری کی صورت تھی۔ لیکن بعض لوگ ضبط نفس بھی نہ کر سکے خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی بی بی سے علیحدہ نہ رہ سکے۔ اس بناء پر خداوند تعالیٰ نے تشریحِ مزید کر دی کہ شریعتِ اسلامیہ کا روزہ اقوامِ سابقہ کے سے شدائد پر مبنی نہیں ہے' بلکہ اس میں ہر طرح کی آسانیاں اور سہولتیں رکھی گئی ہیں:

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ، هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ، عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَكُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ، (۲:۱۸۷)

تمہارے لیے روزے کی راتوں میں بیوی کے پاس جانا جائز کر دیا گیا ہے' کیونکہ عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو' خدا کو معلوم ہوا کہ تم لوگ چھپا کے ایسا کرتے تھے۔ یہ گویا اپنے نفس کے ساتھ خیانت تھی۔ پس خدا نے تمہاری توبہ قبول کر لی اور معاف کر دیا۔ اب رات بھر اطمینان سے کھاؤ پیؤ یہاں تک کہ سفید دھاگا صبح کے سیاہ ڈورے سے ممتاز ہو جائے۔''

مناسبت صلوٰۃ وصوم

احتساب اور تقویٰ

نماز ایک محتسب ہے' جو ہم کو ہر برائی سے بچاتی ہے:

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ. (۲۹:۴۵)

''نماز بری باتوں سے روکتی ہے۔''

لیکن محض احتساب سے تقویٰ حاصل نہیں ہوسکتا' طبیب ہم کو پرہیز بتاتا ہے اور ہم اس کی ہدایت پر عمل نہیں کرتے' اس لیے پرہیز کا اصل مقصد یعنی صحت حاصل نہیں ہوتی۔

نماز کا عملی و اصلی نتیجہ

نماز ہم کو تقویٰ کی راہ دکھاتی ہے' لیکن روزہ ایک ایسی عبادت ہے جو ہم کو نماز کے احتساب کا نتیجہ عملی صورت میں دکھا دیتا ہے۔ نماز ہم کو تقویٰ سکھاتی ہے اور ہم نے روزے میں تمام منہیات سے احتراز کر کے تقویٰ حاصل کر لیا۔ پس نماز کا اصلی نتیجہ روزہ ہے۔ یہی

وجہ ہے کہ وہ نماز کے بعد فرض کیا گیا' کیونکہ نتیجہ کبھی اصل علّت سے منفک نہیں ہوسکتا۔

زکوٰۃ وصیام کا میلان

روزہ دار کا جذبۂ صادقہ

روزہ اگرچہ نماز کا عملی نتیجہ ہے' لیکن وہ خود زکوٰۃ کی علّت بن جاتا ہے۔ انسان جب روزہ رکھتا ہے تو خود بھوکا پیاسا رہ کر غریبوں اور مسکینوں کی بھوک پیاس کا اچھی طرح اندازہ کر لیتا ہے۔ پس اسے وہ فقراء ومساکین یاد آ جاتے ہیں جو بارہ مہینے اس تکلیف میں مجبوراً مبتلا رہتے ہیں۔ جس تکلیف کو روزہ دار نے اپنی خوشی سے ایک ماہ کے لیے اختیار کیا اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس کے دل میں ان کی اعانت کا حقیقی جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اور جب کبھی کسی بھوکے پیاسے کو دیکھتا ہے تو ٹھیک ٹھیک سمجھ لیتا ہے کہ اس پر کیسی مصیبت طاری ہے؟

وجوبِ صدقۂ فطر کی وجہ

یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رمضان المبارک میں معمول سے زیادہ انفاق کیا کرتے تھے اور یہی سبب ہے کہ رمضان کے بعد صدقۂ فطر واجب کیا گیا۔

زکوٰۃ کا تیسرا درجہ

اس لحاظ سے عبادات کے سلسلہ میں زکوٰۃ کا تیسرا درجہ اتفاقی نہیں بلکہ عقلی ہے' کیونکہ وہ روزہ کا نتیجہ ہے۔ عبادات کے سلسلہ میں روزے کا چونکہ دوسرا درجہ تھا' اس لیے اس کے نتیجہ کا تیسرا اثر زکوٰۃ قرار پایا۔

حج وصیام کا تعلق

عباداتِ سہ گانہ کا مُرقّع

حج ان تمام عبادات کا جامع ہے۔ اس کے علاوہ وہ اسلام کا آخری فرض ہے۔ نماز بھی اس کا

ایک جزو ہے جو خطبہ و جماعت کے ساتھ ادا کی جاتی ہے وہ روزہ زکوٰۃ کا بھی ذریعہ بن سکتا ہے:

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْبِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْنُسُكٍ ' (۲:۱۹۶)

''تو تم میں سے جو مریض ہو یا اس کے سر میں کوئی مرض ہو تو وہ روزے کا یا صدقہ کا یا قربانی کا فدیہ ادا کرے۔''

پس وہ اسلام کی عباداتِ سہ گانہ کا ایک جامع مرقع ہے جو دنیا کو علی الاعلان دکھایا جاتا ہے۔

تقویٰ کا بہترین مظہر

لیکن درحقیقت حج بھی روزے کا آخری نتیجہ ہے، روزے کا بہترین نتیجہ اور تقویٰ کا ایک بہترین مظہر اعتکاف ہے، جس میں انسان پر وہ چیزیں بھی حرام ہو جاتی ہیں جو خود روزے کے زمانہ میں حلال تھیں۔

وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عَاكِفُوْنَ فِي الْمَسَاجِدِ' تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا' كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ. (۲:۱۸۷)

''اور اپنی عورتوں کے پاس حالتِ اعتکاف میں نہ جاؤ' یہ خدا کے حدود ہیں' ان سے بچو! اسی طرح خدا اپنی آیتوں کو انسان کے لیے بیان کرتا ہے کہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔''

خصائصِ اعتکاف

اعتکاف تقویٰ کا بہترین مظہر ہے' اس لیے اس کے لیے وہ تمام شرائط لازمی ہیں جن کے آغوش میں تقویٰ نشو و نما پاتا ہے۔ اعتکاف کے لیے روزہ ضروری ہے جو مجسّمِ تقویٰ ہے۔ مسجد کے حدود سے باہر کوئی شخص معتکف نہیں ہوسکتا اور مسجد ہی وہ گھر ہے جس کو خدا نے موسّس علی التقویٰ کہا ہے' پس اعتکاف روزہ کا ایک جزو اور اس کی ایک اعلیٰ ترین شکل ہے اور حج کی غرض سے ہم جس مقدّس گھر کی زیارت کو جاتے ہیں' اس کی تعمیر کا بھی ایک مقصد اعتکاف تھا:

وَعَهِدْنَا اِلٰی اِبْرَاهِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَهِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّائِفِیْنَ وَ الْعَاكِفِیْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ. (۲:۱۲۵)

''اور ہم نے ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کو وصیّت کی کہ تم ہمارے گھر کو طواف کرنے والوں کے لیے اور مجاوروں کے لیے اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے ہمیشہ پاک کرو! (اور ظلم و معصیّت کی گندگیوں سے آلودہ نہ کرو!)''

شہر رمضان کی صفت

روزہ کی برکت

لیکن ہم کو سب سے زیادہ اس چیز پر غور کرنا چاہیے، جس کی بناء پر قرآن مجید رمضان میں نازل کیا گیا۔ ہم نماز پڑھتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں، حج کرتے ہیں، لیکن ہم پر کوئی آیت نازل نہیں ہوتی۔ صرف روزہ ہی ایک ایسی عبادت ہے، جس کی برکت سے ہم پر پورا قرآن نازل ہوا:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ. (۲:۱۸۵)

''یہ رمضان کا مہینہ ہے، جس میں قرآن کا نزول (شروع) ہوا ہے۔''

تقویٰ کی راہداری

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کو صرف متّقین کے لیے نازل فرمایا ہے:

ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ. (۲:۳)

''اس کتاب میں کوئی شبہ نہیں، وہ ان پرہیزگاروں کے لیے راہنما ہے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں اور ہم نے جو کچھ انھیں دے رکھا ہے اسے (نیکی کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔''

تخاطبِ قرآن

روزہ صرف تقویٰ کا نام ہے، اس بناء پر قرآن مجید کا حقیقی ظرف رمضان، اور اس کا

حقیقی مخاطب صرف روزہ دار ہی ہوسکتا ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَانَ. (۲:۱۸۵)

''رمضان ہی وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا' قرآن جو ہدایت ہے لوگوں کے لیے اور اس میں نہایت واضح اور روشن دلیلیں امتیاز و ہدایت کی' موجود ہیں۔''

کمالِ انسانی

امام رازیؒ نے لکھا ہے کہ خدا نے سورہ بقرہ کے اول میں هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ لکھا تھا اور یہاں هُدًی لِّلنَّاسِ ہے' اس لیے ان دونوں آیتوں کے ملانے سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی وہی ہے جو پرہیز گار ہے۔ جو پرہیز گار نہیں وہ آدمی نہیں۔ دوسرے الفاظ میں اس مفہوم کو یوں بھی ادا کر سکتے ہیں کہ کامل انسان وہی ہے جو روزہ دار ہے۔ یعنی ضبط و صبر اور ایثار کی قوت رکھتا ہے۔ جو روزہ دار نہیں' وہ انسان ہی نہیں۔ کیونکہ انسان وہی ہے' جس میں چارپایوں سے کچھ زیادہ جوہر ہو۔ اور وہ جوہر اس کی ملکوتیّت ہے۔

کیفیت الٰہیہ کا مظہر

روزے سے انسان کے قلب میں تقویٰ و طہارت کی جو کیفیت الٰہیہ پیدا ہو جاتی ہے' اس کا مظہر اگرچہ اس کی زندگی کا ہر حصہ ہوسکتا ہے' تاہم اس کے اظہار کا حقیقی موقع معاملات تمدنی ہیں، جہاں انسان کا قدم ڈگمگا جاتا اور حلال و حرام کے درمیان جو مشتبہات ہیں' ان کی تمیز اٹھ جاتی ہے۔

زُہد کا مظہر

کسی نے امام محمدؒ سے کہا کہ آپ نے زہد میں کوئی کتاب نہیں لکھی؟ انھوں نے فرمایا؟ میں نے معاملات میں کتابیں لکھ دی ہیں' زہد کا مظہر اس سے بڑھ کر کیا ہوسکتا ہے؟

نتائج روزہ کا مظہر

معاملات، اس لحاظ سے تمہارے روزے کے نتائج کے اظہار کا بہترین ذریعہ ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روزے کے احکام کے بعد فرمایا:

وَلَا تَاْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَا اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَ اَنْتُم تَعْلَمُوْنَ. (۱۸۸:۲)

''اور اپنے مال کو باہم ناجائز طریقہ سے نہ کھاؤ' اور نہ حُکّام کو رشوت دو کہ وہ لوگوں کے مال کا ایک حصہ ناجائز طریقہ سے کھائیں۔''

روزہ کی روح

نظمِ کلام و ترتیبِ آیات کے لحاظ سے ان احکام کو بظاہر روزے سے کوئی مناسبت نہیں معلوم ہوتی' لیکن حقیقت یہ ہے کہ روزے کی روح یہی اکلِ حلال ہے۔ روزہ نے انسان پر اکلِ حلال صرف اس لیے حرام کر دیا کہ وہ اگر سدِّ رمق پر قناعت نہیں کر سکتا تو اس کو کم از کم زہد و قناعت کا خوگر ہو کر اکلِ حرام سے تو ضرور بچنا چاہیے۔

فطرتِ سلیمہ کی راہنمائی

قرآن مجید کا طرز خطاب یہی ہے کہ وہ مقدّمات قائم کر دیتا ہے' ان کے نتائج پیش کر دیتا ہے' لیکن یہ نہیں بتلاتا کہ اس میں کون سا مقدّمہ ہے اور کون سا نتیجہ؟ تاہم فطرتِ سلیمہ خود بخود ان کی طرف ہدایت کرتی ہے:

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِىْ لِلَّتِىْ هِىَ اَقْوَمُ. (۹:۱۷)

''بلاشبہ یہ قرآن اس راہ کی طرف راہنمائی کرتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھی راہ ہے!''

تفسیر سورۂ لیلۃُ القدر

فیصلہ کی رات

تقدیر اور فیصلہ ازل

عالمِ تقدیر خاموش نہیں ہے۔ وہ ایک امامِ ناطق ہے۔ اس نے مجموعی طور پر تمام عالم کی

قسمت کا فیصلہ ازل ہی میں کر دیا تھا' لیکن اشخاص واقوام کی تقدیر کا فیصلہ ہمیشہ ہوتا رہتا ہے۔

بختِ خفتہ کے احیاء کی رات

کارکنان قضاوقدر بہت سی قوموں کی قسمت کا فیصلہ کر چکے تھے' مگر ایک بادیہ نشین قوم پہاڑوں کے دامن میں دبی پڑی تھی' انہی پہاڑوں کے غار سے آتشیں شریعت کا ایک شرارہ اڑا اور دفعتہً خرمنِ جہل وضلالت پر برقِ خاطف بن کر گرا۔ اس مردہ قوم کی سوئی ہوئی تقدیر نے مدت کے بعد ایک خاص رات میں کروٹ بدلی' اس لیے اس رات کو ''لیلتہ القدر'' کہا گیا' کیونکہ اسی رات میں اس کے کارنامۂ اعمال کو قرآن حکیم کے ذریعہ سے معیّن ومقدّر کر دیا گیا تھا:

اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ'

''ہم نے اس کو لیلتہ القدر میں نازل کیا۔''[1]

پس اس سے ثابت ہوا کہ لیلتہ القدر سے رمضان ہی کی رات مراد ہے۔ نزول قرآنی سے مقصود یہ ہے کہ نزول کا آغاز لیلتہ القدر اور رمضان المبارک میں ہوا' ورنہ یہ ظاہر ہے کہ پورا قرآن نجماً نجماً ۲۳ برس میں نازل ہوا ہے۔

''قرآن'' اور ''الکتاب'' کا اطلاق جس طرح کل پر ہوتا ہے' اسی طرح اس کے ایک جزو پر بھی ہوسکتا ہے۔ قرآن کے ہر ٹکڑے کو اللہ نے ''قرآن'' اور ''الکتاب'' کہا ہے۔

لیکن بعض مفسرین کو خیال ہوا کہ ''اِنَّـا اَنْـزَلْـنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ'' سے مقصود پورے قرآن کا نزول ہے' اس لیے انہوں نے طرح طرح کی تاویلیں کیں' مثلاً کہا گیا کہ قرآن کریم رمضان کی بیس راتوں میں جبریل علیہ السلام کو دیا گیا اور انھوں نے ۲۰ سال کے اندر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کیا۔ لیکن قاضی ابوبکر ابن عربی لکھتے ہیں:

ومن جهالة المفسرين انهم قالوا ان السفرة القته الٰى جبريل فى عشرين ليلة والقاه جبريل الٰى محمد عليهما السلام فى عشرين سنة و هذا باطل ليس بين جبريل و

بین اللّٰہ واسطة ولا بین جبریل و محمد علیهما السلام واسطة. (احکام القرآن جلد۲ص ۳۱۷)

''اور مفسرین کی یہ جہالت ہے جو وہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم بیس راتوں کے اندر خدا نے جبریل علیہ السلام کو دیا اور انہوں نے بیس سالوں کے اندر محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر نازل کیا۔ سو ایسا کہنا بالکل باطل ہے، نہ تو خدا اور جبریل میں کوئی واسطہ ہے، اور نہ جبریل اور آنحضرت علیہما السلام میں کوئی واسطہ ہے۔''

لیلة القدر: قیل لیلة الشرف و الفضل و قیل لیلة التدبیر والتقدیر وهوا قرب. (احکام القرآن لابن عربی)

''اور وہ لیلۃ القدر کی رات تھی، اسے شرف وفضیلت کی رات بھی کہا جاتا ہے، نیز تدبیر وتقدیر کی رات بھی۔''

اعجاز بیانِ قرآن

متکلم ضمیریں

عربی زبان میں متکلم کے لیے ''اِنّی'' و ''اَنَا'' کی دو ضمیریں ہیں، جو بہ ترتیب ''واحد متکلم'' و ''جمع متکلم'' کے لیے مستعمل ہوتی ہیں۔

ضمیر واحد کی حکمت

اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم علیہ السلام کو دنیا کی نشاۃِ اولیٰ کا موسس بنانا چاہا تو فرمایا:

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً. (۲:۳۰)

''میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے معمولی صیغۂ واحد متکلم کا استعمال کیا ہے، کیونکہ اشیاء وامثال کا پیدا کرنا اس کی قدرت کاملہ کے نزدیک کوئی غیر معمولی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔

ضمیر جمع متکلم کی فلاسفی

لیکن بطون وارواح کی نشاۃِ جدیدہ دنیا کے لیے مایۂ صدرحمت وبرکت تھی' اس لیے اللہ تعالیٰ نے جب کسی پیغمبر کو اس نشاۃِ حقیقہ کا ذریعہ بنایا ہے' تو اس موقع پر اپنے لیے ضمیر جمع متکلم کا صیغہ استعمال کیا ہے جو واحد کے لیے تعظیم وشرف کا پہلو رکھتا ہے۔

تعظیمی ضمیر کی وجہ

یہ تعظیم درحقیقت اس جدید روح سعادت وہدایت کی اہمیت وعظمت کو نمایاں کرتی ہے جو دنیا میں ظہور پذیر ہونا چاہتی ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام نے دنیا کا قالبِ موزوں تیار کر دیا تھا۔ لیکن وہ روح سے یعنی ترقی یافتہ دین الٰہی کی حقیقی روح سے خالی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کو یہ امانت دے کر دنیا کی طرف بھیجا جو ایک عظیم الشان روحانی انقلاب تھا۔ پس ضمیر تعظیمی سے اس کا اظہار کیا:

اِنَّا اَرْسَلْنَا نُوْحًا. (۷۱:۱)

ہم نے نوحؑ کو بھیجا۔

عظیم الشان انقلاب

چونکہ یہ روح امتدادِ زمانہ سے فرسودہ ہوگئی تھی' بلکہ سچ تو یہ ہے کہ بالکل مردہ ہوگئی تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے ذریعہ اس روحِ مردہ کو' اس گُلِ پژمردہ کو' اس بختِ خفتہ کو' پھر زندہ کیا' شگفتہ کیا' بیدار کیا۔ یہ ایک عظیم الشان انقلاب تھا' جس نے نقشۂ عالم کو یکسر پلٹ دیا تھا۔ پس ہمیشہ اس کی اہمیت بھی ضمیر تعظیمی کے پردے میں نمایاں کی گئی:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ. (۱۵:۹)

''ہمیں ہیں کہ ہم نے اپنے ذکر کو نازل کیا۔''

اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ.

''ہم نے اس کو لیلۃ القدر میں نازل کیا۔''

دیگر تذکار عظیم الشان

اسی کتاب ذوالخطر والبال کو خدا نے ''کوثر'' بھی کہا ہے کہ وہ مایۂ خیر کثیر ہے:

اِنَّا اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ. (۱:۱۰۸)

''ہم نے تم کو کوثر یعنی قرآن عطا فرمایا۔''

یہاں بھی قرآن کا ذکر (ضمیر) متکلم جمع تعظیمی سے کیا۔

اسی کے ذریعہ دین ابراہیمی زندہ ہوا ہے اس لیے اس تیغ خیر کے عطا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کی سب سے بڑی یادگار ''قربانی'' کے کرنے کا حکم دیا:

فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ. (۲:۱۰۸)

''تو اپنے خدا کی نماز پڑھ اور قربانی کر!''

اللہ تعالیٰ نے اسی دین کے ذریعہ ابراہیم علیہ السلام کی یادگار اور ذکرِ عظیم کو قائم رکھا:

وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا. (۱۹:۵۰)

''اور ہم نے اس کے ذکر خیر کو رفعت و بلندی عطا کی۔''

آنحضرت ﷺ کا ذکرِ جمیل بھی اسی کی برکت سے غلغلہ اندازِ عالم روح و ایمان ہے: وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ'' اس لیے ان دونوں مقامات میں بھی جمع متکلم کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

تنزیلِ ملائکہ وارواح سے مراد

روح مذہبی کا اعادہ

مذہب کی پاک روح مردہ ہو گئی تھی، لیکن اس رات میں اعادۂ معدوم اور حیات بعد الممات ہوا۔ وہ کتم عدم سے عالم شہود میں اتری:

تَنَزَّلُ الْمَلٰئِکَةُ وَالرُّوْحُ فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ. (۹۷:۴)

''اس رات میں فرشتے اور ارواح اپنے رب کے حکم سے اترتے ہیں۔''

فرشتے اور روح اس رات میں اترتے ہیں' مگر بتدریج پورے ایک مہینے میں اترتے ہیں' کیونکہ دنیا کا دامن دفعتاً ان برکات وفضائل کے سمیٹنے کی وسعت نہیں رکھتا:

دامانِ نگہ تنگ' گل حسنِ تو بسیار
گلچیں' نگاہِ تو ز داماں گلہ دارد

برکاتِ امن وسلامتی

لیکن یہ ملائکہ کیا ہیں؟ اور اس روح کی حقیقت کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے خود اسی آیت میں اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے:

مِنْ کُلِّ اَمْرٍ' سَلَامٌ. (۹۷:۴۔۵)

''یعنی وہ ملائکہ اور روح امن اور سلامتی ہیں۔''

جو دنیا کو یکسر امنیّت اور سلامتی کی برکتوں سے معمور کر دیتے ہیں!

معجزنما پیش گوئی

یہ سکون' یہ اطمینانِ کامل' یہ سلامتی' یہ امنِ عام جو ہم پر آسمان سے اترا' صرف عرب کے لیے مخصوص نہ تھا' بلکہ وہ مشرق ومغرب دونوں کو محیط ہے۔ ہمارا آفتاب اگرچہ مغرب سے طلوع ہوا تھا' جو ہمارا قبلۂ ایمان ہے' لیکن اس کی شعاعوں نے مشرق کے افق کو بھی روشن کر دیا' جہاں سے دنیا کا سورج نکلتا ہے اور جہاں سے صبح کا ستارہ طلوع ہوتا ہے:

هِیَ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ. (۹۷:۵)

''وہ امن وسلامتی کا پیغام صبح کے طلوع ہونے کی جگہ تک یعنی مشرق تک پہنچ جائے گا۔''

دنیا نے اس وعدے کی صداقت کو دیکھ لیا' جب خدا کے فرشتے یعنی قرآن نے مشرق ومغرب دونوں کو اپنے پروں کے نیچے چھپا لیا:

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ.

بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر حاوی ہے۔

رحمتِ الٰہی کا نزول

امن عام کا یہ پیغام کیا ہے؟ اور وہ کیونکر مشرق و مغرب تک پہنچایا جائے گا؟ قرآن حکیم نے دوسری آیتوں کے ذریعہ اس نکتہ کو حل کر دیا ہے:

اِنَّـا اَنْـزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِیْنَ، فِیْهَا یُفْرَقُ كُلُّ اَمْـرٍ حَـكِیْـمٍ، اَمْـرًا مِّـنْ عِـنْدِنَا اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِیْنَ، رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ، اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ. (۴:۴۴)

''ہم نے قرآن کو مبارک رات میں اتارا' کیونکہ ہم دنیا کو اس کی ضلالت کے نتائج سے ڈرانے والے تھے۔ تمام انتظاماتِ الٰہیہ جو حکمت و مصلحت عالم پر مبنی ہیں' اسی رات میں طے پاتے رہیں۔ از انجملہ قرآن کا نزول جو اسی رات میں شروع ہوا۔ نیز ہمیں اپنا رسول بھیجنا مقصود تھا' جس کا ظہور اللہ کی رحمت کا نزول ہے۔''

شانِ عرفانِ مصنف

اب ان دونوں سورتوں کے تطابق و تشاکل پر غور کرنا چاہیے' اللہ تعالیٰ نے سورۂ قدر میں فرمایا:

اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ. (۱:۹۷)

''ہم نے اس قرآن کو لیلۃ القدر کی رات میں اتارا۔''

اور یہاں فرمایا:

اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ. (۳:۴۴)

''ہم نے اس کو لیلہ مبارکہ میں اتارا۔''

اس لیے یہ دونوں راتیں ایک ہی ہیں۔ وہاں فرمایا تھا: تَـنَـزَّلُ الْـمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِیْهَـا بِـاِذْنِ رَبِّهِمْ مِّنْ كُلِّ اَمْرٍ سَلٰمٌ. اور یہاں فرمایا: فِیْهَـا یُـفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِیْمٍ اَمْـرًا مِّـنْ عِنْدِنَا. اس بناء پر یہ ''امر سلام'' اور یہ ''امر حکیم'' جس کی تنزیل و تقسیم لیلۃ القدر

میں خدا کے حکم سے کی گئی ہے، دونوں ایک ہی چیزیں ہیں۔

امرِ سلام اور امرِ حکیم

لیکن سوال یہ ہے کہ خود وہ "امرِ سلام" اور "امرِ حکیم" کیا چیز ہے؟ دوسری آیتوں نے اس کی بھی تفسیر کر دی ہے:

الٓرٰ قف تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْحَکِیْمِ، اَکَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَیْنَآ اِلٰی رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ. (۱۰:۱-۲)

"یہ قرآن حکیم کی آیات ہیں، پھر کیا لوگوں کو تعجب ہے کہ ہم نے انہی میں سے ایک آدمی پر وحی کی، تا کہ وہ لوگوں کو ڈرائے اور مومنوں کو اس بات کا مژدہ سنائے کہ خدا کے تخت کے نیچے ان کا قدم جم گیا ہے؟"

اس لیے یہ "امرِ حکیم" اور یہ "امرِ سلام" خود قرآن کریم ہے جو لیلۃ القدر میں نازل کیا گیا۔

حاملِ قرآن کی شان

مطلع الفجر

اللہ تعالیٰ نے سورۂ قدر میں قرآن حکیم کی چند خصوصیات کا اجمالی ذکر فرمایا تھا، لیکن اس آیت میں وہ خصوصیتیں بہ تفصیل بیان فرمائی ہیں:

سورۂ قدر میں فرمایا تھا کہ: وہ سورج کے طلوع ہونے کی جگہ تک پھیل جائے گا۔ یہ نہایت مجمل طرز خطاب تھا۔ سورہ دخان میں اس کی تفسیر بھی کر دی: فِیْهَا یُفْرَقُ کُلُّ اَمْرٍ حَکِیْمٍ اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا" یعنی قرآن حکیم کی آیتیں ہمارے حکم سے ایک پیغمبر پر تقسیم کی جاتی ہیں تا کہ وہ دنیا کے سامنے ان آیتوں کو لے کے جائے اور ہر شخص کے آگے اس قرآن کریم کو بچھا دے تا کہ ہر شخص اپنا حصہ لے لے: اِنَّا کُنَّا مُرْسِلِیْنَ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّکَ. (۴۴:۶)

تنذیرِ ربانی کا مقصد

لیکن دنیا غفلت کی نیند سو رہی تھی، اس لیے یہ ابرِ رحمت پہلے گرجا تاکہ دنیا جاگ اٹھے۔ اس نے اپنی چادرِ غیب سے پہلے اس ہاتھ کو نکالا جس میں بجلی کا تازیانہ تھا:

يَاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ، قُمْ فَاَنْذِرْ!

''او چادر اوڑھنے والے! اٹھ اور ڈرا!''

پہلے اس کو گرجنے اور تڑپنے کی ضرورت تھی، اس لیے وہ گرجا، چمکا، تڑپا، اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِیْنَ. لیکن درحقیقت اس کا یہ وصف عارضی تھا، ورنہ رفق و ملاطفت اس کا مایۂ خمیر اور عنصرِ حقیقی ہے۔

عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْكُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَؤُفٌ رَّحِیْمٌ. (۹:۱۲۸)

''تمہارا رنج و کلفت میں پڑنا اس پر بہت شاق گزرتا ہے، وہ تمھاری بھلائی کا بڑا ہی خواہش مند ہے وہ مومنوں کے لیے شفقت رکھنے والا اور رحمت والا ہے۔''

لطف و کرم کا مجسمہ

اس لیے وہ روئی کے گالے سے بھی زیادہ نرم و سفید بادل کا ایک ٹکڑا تھا، جو آبِ شیریں کا خزانہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اگرچہ ابتدا میں بجلی کی کڑک اس کا مظہر ورود ہوئی۔ یہ انداز وعید، یہ قہر و غضب اس قوم کی شامت اعمال کا نتیجہ تھی، ورنہ پیغمبر اُمی ﷺ خدا کی طرف سے صرف بشارت رحمت اور لطف و کرم کا مجسمہ بنا کر بھیجا گیا تھا: اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِیْنَ، رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ. (۴۴:۵-۶)

رحمۃ للعالمین

لیکن خدا کی یہ رحمت صرف عرب کے ساتھ نہ تھی، بلکہ اس ابرِ کرم نے تمام مشرق و مغرب کو جل تھل کر دیا۔ چنانچہ دوسری جگہ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ کی تفسیر کر دی گئی:

مَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ. (۲۱:۱۰۷)

''ہم نے تجھ کو تمام دنیا کے لیے صرف رحمت ہی رحمت بنا کے بھیجا۔''

فضیلت کی وجہ

نزولِ قرآن

''لیلتہ القدر'' کوتمام راتوں پراس لیے فضیلت نہیں ہے کہ اس میں عبادت کا ثواب تمام راتوں سے زیادہ ملتا ہے' بلکہ اس بناء پر بھی کہ اس میں ہم کوایک کتاب دی گئی اور ہم کو مشرق ومغرب میں اس کی منادی کرنے کا حکم دیا گیا۔

خدا کی منادی

پادشاہوں کی منادی طبل وعلم کے ساتھ کی جاتی ہے' لیکن خدا کی منادی تہلیل وتکبیر کے ساتھ ہونی چاہیے۔ رمضان کے بعد عید کا حکم اسی لیے دیا گیا تاکہ تہلیل وتکبیر کی مقدس صداؤں میں اسلام کے جاہ وجلال نفوذ وقوت اور وسعت واثر کا سماں دنیا کو نظر آجائے:

وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَاهَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ. (۲:۱۸۵)

''اور اللہ نے یہ جوراہ سعادت تم پر کھول دی ہے تو اس لیے کہ تم اس پر اس کی بڑائی کا اعلان کرو' نیز اس کی شکرگزاری میں سرگرم رہو!''

منادیٔ قرآن

پھر آہ تمھاری غفلت کیسی شدید اور تمھاری گمراہی کیسی ماتم انگیز ہے کہ تم لیلتہ القدر کو تو ڈھونڈتے ہو' پر اس کو نہیں ڈھونڈتے جو لیلتہ القدر میں آیا' اور جس کے وُرُود سے اس رات کی قدرومنزلت بڑھی۔ اگر تم اسے پالو تو تمھارے لیے ہر رات لیلتہ القدر ہے:

ہر شب شبِ قدر است اگر قدر بدانی!

مستثنیاتِ روزہ

مفسرّین کا اختلاف

افطار وفدیہ

وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ. (۲:۱۸۴)

''اور جولوگ ایسے ہوں کہ ان کے لیے روزہ رکھنا نا قابل برداشت ہوتو ان کے لیے روزہ کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا ہے۔''

اس آیت سے اجمالاً ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں ایک گروہ ایسا بھی قرار دیا گیا ہے جو روزہ کا فدیہ ادا کر کے اس فرض سے مستثنیٰ ہو جاتا ہے۔ لیکن گفتگو یہ ہے کہ وہ کون سا گروہ ہے؟ مفسرّین کرام نے متعدد وجوہ نقل کیے ہیں:

اختیارِ عام اور اس کی تنسیخ

(۱) ابتدائے اسلام میں ہر شخص کو روزہ رکھنے یا فدیہ دینے کا عام اختیار تھا۔ جس کا جی چاہتا تھا' روزہ رکھتا تھا اور جس کا جی چاہتا تھا' فدیہ دے دیتا تھا' لیکن چند دنوں کے بعد:

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ.

''جو تم میں سے یہ مہینہ پائے' تو وہ روزہ رکھے۔''

نے اس عام حکم کو منسوخ کر دیا۔

بوڑھوں کے لیے حکم

(۲) یہ حکم ابتداء ہی سے بوڑھوں کے ساتھ مخصوص تھا' بعد کو ان کے لیے بھی منسوخ ہو گیا۔ اس بناء پر ''يُطِيْقُوْنَ'' سے پہلے ''لا'' کو محذوف ماننا پڑے گا یا طاقۃ کو باب افعال کی خاصیّتِ سلب ماخذ پر قیاس کرنا ہوگا۔ کیونکہ یطیقونہ کے معنی طاقت رکھنے کے ہیں۔ حالانکہ بوڑھوں کو یہ آسانی

اس لیے دی گئی ہے کہ وہ طاقت نہیں رکھتے۔

عدم وجوبِ قضاءِ صوم

(۳) لیکن بعض اصحابِ تفسیر نے "یطیقونه" کے بدلے "یطوقونه" پڑھا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ جو لوگ بہ تکلف و بہ مشقت روزہ رکھ سکتے ہیں، ان کو فدیہ دینا چاہیے۔ اس بناء پر اس آیت کے تحت میں بوڑھے، ضعیف، اپاہج، حاملہ عورت، اور دودھ پلانے والی عورتیں بھی داخل ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ امام سفیان ثوری، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کے نزدیک حاملہ اور دودھ پلانے والی عورتوں پر قضاء واجب نہیں۔ وہ بھی فدیہ دے سکتی ہیں۔[1]

اقسامِ مسافر و مریض

(۴) یہ آسانی مسافروں اور مریضوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ مسافروں اور مریضوں کی دو قسمیں ہیں: ایک مسافر اور مریض تو وہ ہیں جو روزہ رکھنے کی بالکل طاقت نہیں رکھتے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو طاقت تو رکھتے ہیں مگر روزہ رکھنا ان پر نہایت شاق گزرتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے پہلی قسم کے مریضوں اور مسافروں کو حکم بتا دیا:

پہلی قسم

فَمَنْ كَانَ مِنكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ. (۱۸۴:۲)

"جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں سے روزے کی گنتی پوری کر لے۔"

لیکن وہ مریض اور مسافر رہ گئے تھے جو بہ تکلف روزہ رکھ سکتے تھے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے روزہ رکھنے یا فدیہ دینے کا اختیار دیا:

دوسری قسم

فَمَنْ كَانَ مِنكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ. وَ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ، فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ. (۱۸۴:۲)

''جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں سے روزے کی گنتی
پوری کر لے اور ان بیمار اور مسافروں کے لیے جو روزے کی طاقت نہیں رکھتے' یہ
حکم ہے کہ ایک محتاج کو اپنے روزے کے بدلے کھانا کھلا دیں۔ البتہ جو شخص اپنی
خوشی سے زیادہ نیکی کرنا چاہے تو یہ اس کے لیے زیادہ بہتر ہے اور اگر غور کرو تو
روزہ رکھنا تمھارے لیے بہر حال بہتر ہے۔''

انتخابِ قولِ مرجح

نسخ قرآن کا مسئلہ

اب ہم کو ان تمام اقوال میں سے قولِ مرجح کا انتخاب کر لینا چاہیے۔ یہ ظاہر ہے کہ پہلے دونوں احتمالات کے لیے نسخ لازم ہے، لیکن جو لوگ قائل نسخ ہیں' ان میں بھی محققین کا مذہب یہ ہے کہ قرآن مجید میں بہ اشد ضرورت و بہ احتیاط تمام نسخ کا دعویٰ کرنا چاہیے۔ پس جب ہم واضح و بہتر تفسیر کر کے اس قسم کی احتیاط کر سکتے ہیں تو ہم کو ان اقوال کے ماننے کی کون سی ضرورتِ داعیہ ہے؟

مناسبت سیاق وسباق

تیسری توجیہہ اگر چہ نسخ سے خالی ہے تاہم اس میں بھی قرأۃِ شاذہ کا اتباع کرنا پڑتا ہے۔ صرف چوتھی توجیہہ البتہ نسخ و قرأۃِ شاذہ دونوں سے خالی ہے اور آیت کے سیاق وسباق سے مناسبت بھی رکھتی ہے۔

ربطِ آیات

پہلے خدا نے مریضوں کا حکم بتایا ہے' اس کے بعد یہ آیت آتی ہے۔ پس اگر یہ آیت بھی کسی خاص قسم کے مریضوں کے ساتھ متعلق کر دی جائے تو آیت میں نظم و ترتیب پیدا ہو جائے گی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ''اگر تم روزہ رکھو تو یہ تمھارے لیے بہتر ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس آیت سے بوڑھے مراد نہیں لیے جا سکتے' کیونکہ وہ تو سرے سے روزہ کی طاقت ہی نہیں رکھتے' ان کی نسبت وَاَنْ تَصُوْمُوْا کہنا بالکل بے معنی ہوگا۔

عام خیال

عام خیال یہ تھا کہ اس آیت سے پہلی صورت مقصود تھی، لیکن بعد کو یہ فیاضانہ حکم: فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ" سے منسوخ کر دیا گیا۔ لیکن اس آیت کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ. (۲:۱۸۵)

''خداتمھارے ساتھ آسانی چاہتا ہے، سختی نہیں چاہتا۔''

پس اگر آیت کے یہ معنی مراد لیے جائیں کہ پہلے ہر شخص بجائے روزہ رکھنے کے فدیہ دے سکتا تھا، اور اب نہیں دے سکتا، کیونکہ اس کو روزہ ہی رکھنا چاہیے، تو یہ آیت کے مفہوم سے بالکل مختلف ہوگا۔ کیونکہ یہ تو آسانی نہ ہوئی، بلکہ آسانی کو سختی کے ساتھ بدل دینا ہوا۔ شیخ فانی، مرضعہ، اور حاملہ بھی اسی چوتھی قسم میں داخل ہوسکتی ہیں۔ وہ درحقیقت مریض ہیں، یا کم از کم روزہ ان میں امراض کی استعداد پیدا کرسکتا ہے۔

اسلامی رواداری

اسلام کی رُوحِ اعتدال کے ساتھ بھی یہی تفسیر مناسبت رکھتی ہے۔ اسلام نہ تو اس قدر فیاض ہے کہ قوی، صحیح، تندرست، اور مقیم آدمی کو افطار کی اجازت دے اور نہ وہ اس قدر بخیل ہے کہ ہر شخص پر بلا استثناء مشقتوں کا بوجھ لاددے۔ وہ ایک معتدل مذہب ہے، اس لیے وہ انھی لوگوں کے ساتھ نرمی کرتا ہے جو اس کے مستحق ہیں۔ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ کا تعلق بھی اسی قسم کے مسافروں اور مریضوں کے ساتھ موزوں معلوم ہوتا ہے، کیونکہ وہ روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے۔

خیر مقدم اسلام

مذاہب عالم اور ان کی ابتداء

ابتدائے قیام مذہب میں اگرچہ اکثر لوگوں پر مذہبی احکام کی پابندی نہایت شاق گزرتی تھی، لیکن اس سے کوئی کلیہ قائم نہیں کیا جاسکتا۔ ہر مذہب کی ابتدائی تاریخ اپنے ساتھ پُر جوش اور مخلص فدائیوں کی بھی ایک مختصر جماعت پیش کرسکتی ہے اور اسلام کے دامن کو تو ابتداء ہی سے اس زرِ

خالص نے مالا مال کر دیا تھا۔

فرضیتِ صوم کا استقبال

پس جب روزہ پہلے پہل فرض کیا گیا، تو اللہ تعالیٰ نے چند آسانیوں کے ساتھ لوگوں کو اس کی طرف مائل کیا۔ لیکن اکثر لوگ ایسے بھی تھے جو آسانی کے متمنّی نہ تھے، وہ سختی چاہتے تھے کہ خلوص و جوش الٰہی کا جوہر آئینہ سے زیادہ لوہے کی تلوار میں نظر آتا ہے۔ انبیائے گذشتہ کا اسوۂ حسنہ ان کے سامنے تھا، وہ جوش ایثار و فدویّت میں ان کی تقلید کرنا چاہتے تھے۔

اتباعِ اُسوۂ نوحؑ

حضرت نوح علیہ السلام ہمیشہ روزہ رکھتے تھے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے بھی دن کو متصل روزہ رکھنا اور رات کو متصل قیام کرنا چاہا۔

تلقینِ نبویؐ

لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپؐ نے فرمایا: تم میں اس کی طاقت نہیں چنانچہ روزہ بھی رکھو، افطار بھی کرو! نماز بھی پڑھو، اور خوابِ شیریں کا بھی لطف اٹھاؤ! ہر مہینے میں صرف تین دن روزہ رکھا کرو۔ نیکی کا معاوضہ دس گنا ملتا ہے، اس لیے تین روزوں کا ثواب ۳۰ دنوں کے برابر ملے گا، جو صوم دہر کا اصلی مقصد ہے۔" مگر انھوں نے کہا کہ "میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں۔" اس پر آپؐ نے ایک دن روزہ رکھنے اور دو دن افطار کرنے کی اجازت دی۔ ان کو اس پر بھی تسکین نہ ہوئی، تو آپؐ نے ایک روز کے افطار اور دوسرے دن کے روزے کا حکم دیا۔ انھوں نے اس پر بھی ترقی کرنا چاہی تو آپؐ نے فرمایا کہ "اب اس کے بعد فضیلت کا کوئی درجہ نہیں[۱۲]۔"

استحقاقِ اتباع کی مثال

لیکن انبیائے گذشتہ سے زیادہ حق بالا تباع خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسوۂ حسنہ تھا۔ آپؐ متصل روزے رکھتے تھے، جن کو صومِ وصال کہتے تھے۔ چنانچہ صحابہؓ نے بھی اس کی تقلید کرنی چاہی، لیکن آپؐ نے منع فرمایا۔ تو ان لوگوں نے کہا کہ خود آپؐ بھی تو صومِ وصال رکھتے ہیں! آپ نے جواب دیا:

لست کا حد منکم انی اطعم و اسقنی.

میں تم لوگوں کی طرح نہیں ہوں؛ مجھ کو تو خدا کی طرف سے کھلایا پلایا جاتا ہے۔

لیکن جب لوگوں نے زیادہ اصرار اور غلو کیا تو آپ سخت ناراض ہوئے اور عملاً اپنی ناراضی کا اس طرح اظہار فرمایا کہ کئی کئی رات اور کئی کئی دن کے روزے رکھنے شروع کر دیے اور صحابہؓ نے بھی اس کی تقلید کی۔ اتفاق سے عید کا چاند ہو گیا' ورنہ آپ کا ارادہ تھا کہ برابر روزے رکھتے ہی چلے جائیں تا کہ لوگ خود گھبرا کر باز آئیں۔

صوم وصال کی تنسیخ

آپؐ نے اگر کسی کو صومِ وصال کی اجازت بھی دی ہے تو صرف ایک شب و روز کی۔ اس سے زیادہ روزہ کسی کے لیے جائز نہیں رکھا۔

لیکن بعض محدّثین کے نزدیک سرے سے رات کو روزہ رکھا ہی نہیں جا سکتا۔ اگر کوئی شخص رات کو بھی روزہ رکھے گا' تو وہ روزہ' روزہ نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے خود کہا ہے:

اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ. (۲:۱۸۷)

''رات ہونے تک روزے کو ختم کردو۔''

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رات روزے کی انتہا ہے۔ اس سے آگے تجاوز نہیں کر سکتے[۱۳]۔

خصوصیاتِ صوم

ان آسانیوں کے علاوہ اور بھی متعدد آسانیاں رکھی گئیں۔ مثلاً یہود سحر میں کھانے سے پرہیز کرتے تھے' لیکن آنحضرتؐ نے سحری کو یہود اور مسلمانوں کے روزے کے درمیان مابہ الامتیاز قرار دیا[۱۴]۔

افطار میں عجلت اور سحر میں تاخیر کرنا بھی سنت ہے۔ احادیث سے ثابت ہے کہ آنحضرتؐ کی سحری اور نماز فجر میں صرف اس قدر وقفہ ہوتا تھا کہ پچاس آیتوں کی تلاوت کر سکتے تھے[۱۵]۔

حواشی

۱ سب سے پہلی مرتبہ یہ تحریر ۱۶ اگست ۱۹۱۳ء کو شائع ہوئی۔

۲ رمضان کے معنی شدت حرارت کے ہیں۔ اس سے اور دیگر اسمائے مشہور کے قرینہ سے مستنبط ہوتا ہے کہ عرب میں قبل اسلام ناقص طور پر شمسی مہینے جاری تھے۔ اس لیے رمضان گرمی کا مہینہ ہوگا۔

۳ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مراد ہے۔

۴ صوم وصال۔

۵ وحی قرآن۔

۶ نزول قرآن کی ابتدا رمضان میں ہوئی تھی۔ کما سیاتی۔

۷ اشارہ ہے تورات کی اس بشارت کی طرف: ''خداوند سینا سے آیا اور سعیر سے طلوع ہوا اور فاران کے پہاڑ سے جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا۔ اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشین شریعت تھی۔'' (تورات، سفر التثنیہ ۳۳:۲)

۸ چشم غیر مسلح یعنی بغیر کسی آلہ کے دیکھنے والی آنکھ۔

۹ یہ مقالہ سب سے پہلی مرتبہ ۱۵ اگست ۱۹۱۴ء کو شائع ہوا۔ اب ۱۹۴۵ء گزر رہا ہے، لہٰذا ۱۳۶۵ء برس شمار کرلو۔

۱۰ اصل مضمون میں یہاں خاسرون کا لفظ تھا۔ جس کا ترجمہ مندرج ہے۔ لیکن اب ترجمہ یہ ہوگا کہ شریعت کی حدیں توڑ کر بے لگام ہوجانے والے لوگ۔' (ناشر)

۱۱ غلطی سے اس جگہ مُبِیـــن کی بجائے بَـــعِیـــد تھا، لہٰذا ترجمہ میں پرلے درجے کی جگہ کھلم کھلا ہونا چاہیے۔ (ناشر)

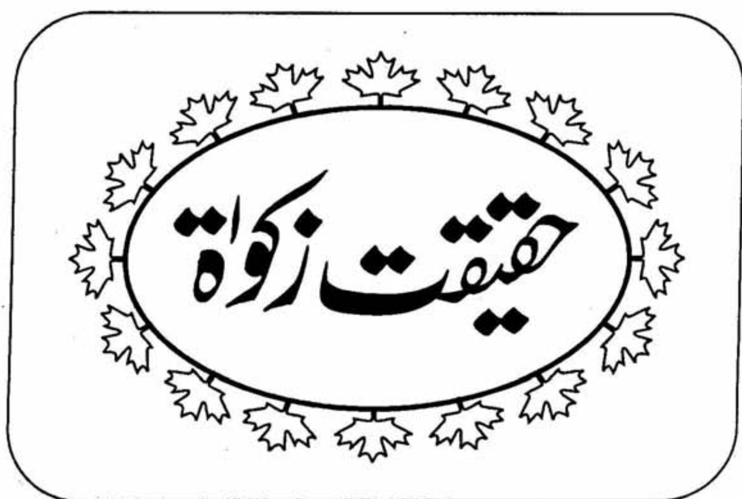
۱۲ ترمذی کتاب الصوم صفحہ ۱۲۵۔

۱۳ بخاری کتاب الصوم۔ صفحہ ۳۷

۱۴ مسلم جلد ا صفحہ ۴۰۸۔

۱۵ بخاری صفحہ ۲۹۔

۱۶ بخاری کتاب الصوم صفحہ ۴۰۔


حقیقت زکوٰۃ

اسلام نہیں چاہتا کہ ساری دولت چند لوگوں کے ہاتھوں میں جمع رہے۔ اسلام نے مسلمانوں کی یہ پہچان بتائی ہے کہ ان کی مٹھیاں کھلی رہتی ہیں یعنی وہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے والے ہوتے ہیں۔ جبکہ کافروں کی پہچان یہ بتائی ہے کہ ان کی مٹھیاں بند ہوتی ہیں۔ یعنی نیک کاموں پر وہ خرچ نہیں کر سکتے۔ اسلام نہیں چاہتا کہ دولت کسی کی اجارہ داری میں آ جائے یا کوئی شخص اپنے پاس ڈھیر لگا لے۔ اسلام ڈھیر کا سخت مخالف ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ دولت تقسیم ہوتی رہے۔ اس کا یہ اصول زکوٰۃ اور وراثت میں بالکل مساوی بنیاد پر قائم ہے۔

حکم زکوٰۃ ایک اعظم ترین فرائض مسلمین اور اہم ترین احکام شریعت حقہ اسلامیہ میں سے ہے اور اس کی فرضیت مثلِ فرضیت حج اور صلوٰۃ و صیام، نصوص قطعیہ شریعت اور تعاملِ غیر منقطع اہل اسلام سے ثابت ہے۔ منجملہ ہمارے موجودہ مصائب عظیمہ کے ایک مصیبت کبریٰ یہ ہے کہ اس فرض کی طرف سے غفلت و تساہل بالعموم طاری و ساری اور اس کے جمع و صرف کے لیے انتظام و اہتمام کے وسائل مفقود۔ ہم نے گھر کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں اور دنیا کے دور و دراز گوشوں میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔

فہرست (حقیقت زکوٰۃ)

۲۶ جولائی ۴۵ء
حبی فی اللہ

خط پہنچا۔ تفصیل کی فرصت نہیں۔ مختصراً لکھتا ہوں۔

(۱) زکوٰۃ صرف اس مال پر ہے جس پر حول کامل گزر جائے یعنی سالانہ آمدنی پر۔

(۲) یقیناً اس کی نوعیت انکم ٹیکس ہی کی ہے۔

(۳) اصل شرع اس بارے میں آیۂ زکوٰۃ ہے۔ اس لیے کوئی خاص رقم متعین نہیں کی۔ اس پر زور دیا کہ آمدنی کا ایک حصہ اسٹیٹ کو مستحقوں کی اعانت کے لیے دینا چاہیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مختلف موقعوں پر مختلف مقدار کے حصص معین فرمائے۔ صحابہؓ نے بعہدِ خلافتِ اولیٰ اس مسئلہ پر غور کیا اور موجودہ شرح معین کی۔ یہ شرح منصوص نہیں ہے۔ اجتہادی ہے اور اہل حل و عقد کا فرض ہے کہ ہر زمانہ کی اقتصادی حالت اور سوسائٹی کی احتیاجات کے مطابق مناسب رقم معین کریں۔

(۴) غیر مسلموں سے جزیہ اس لیے لیا جاتا تھا کہ فوجی خدمت سے مستثنیٰ کر دیے گئے تھے۔

(۵) زمین اور مکانات وغیرہ غیر منقولہ جائداد کی آمدنی پر بھی یقیناً زکوٰۃ ہے۔

گزشتہ تیس سال کے اندر انگلستان کی حکومت نے انکم ٹیکس کی مقدار اتنی بڑھادی ہے کہ اب وہاں دولت مند ہونا، کسی بڑی پرائیویٹ دولت کا جمع ہونا دشوار ہو گیا ہے۔

والسلام علیکم
ابوالکلام

Office-Bearers for 1940
President:
Abul Kalam Azad
Treasurer:
Vallabhbhai Patel
General Secretary:
J. B. Kripalani

अखिल भारतीय कांग्रेस कमेटी
स्वराज भवन, इलाहाबाद
آل انڈیا کانگریس کمیٹی
سوراج بھون - الہ آباد
ALL INDIA CONGRESS COMMITTEE
SWARAJ BHAWAN, ALLAHABAD

Telephone:
Telegrams: "Congress"
President's Address:
19-A, BALLYGUNJ CIRCULAR ROAD
CALCUTTA
Phone: PARK
Ref.................

[illegible]

Social Justice in Islam By Sh.Mahmud Ahmad I.I.C, Lahore 1975 P.98

دیباچہ

کانوں سے دل کی دنیا، کی دوری

اس میدان میں پہلے میری آواز ایک محدود حلقہ تک پہنچتی تھی۔ پچھلے چند سالوں سے انجمن کی مساعی اور سائنس کی ایک مفید ایجاد کی امداد سے پورے میدان میں پہنچنے لگی۔ لیکن اس مرتبہ جیسا کہ مجھے یقین دلایا گیا ہے، میری آواز ہندوستان کے گوشے گوشے میں پہنچ رہی ہے۔ یہی نہیں بلکہ مجھے اس بات کا بھی یقین دلایا گیا ہے کہ ہمالیہ کی چوٹیاں' سمندر کی موجیں اور ریگستانِ عرب کے بگولے بھی میری آواز کو روک نہیں رہے اور میری آواز مشرق ومغرب کے محلوں اور وادیوں سے ٹکرا رہی ہے۔ ہونے کو تو یہ سب کچھ ہے اور جو کچھ ہے سزاوار تحسین وتعریف ہے۔ بمبئی کلکتہ سے بارہ سومیل کے فاصلہ پر ہے' پشاور کلکتہ سے پندرہ سومیل دور ہے، وہاں بھی میری آواز پہنچ رہی ہے۔ لیکن میں تم سے پوچھتا ہوں کہ تمھارے کانوں سے تمھارے دلوں کی دنیا کتنی دور ہے جہاں میری آواز نہیں پہنچی؟ تمھارے کانوں کے پردہ سے ٹکرا کر رہ جاتی ہے اور دل کوئی اثر، کوئی سبق اور کوئی عزت قبول نہیں کرتا۔ تمہارے دلوں کی اس بے اثری اور عدم صلاحیت، اس کی ویرانی کا یہ عالم کیوں' اس دروازے پر غفلت کے بھاری قفل کس لیے۔ اقرار وانکار کا سبب کیا ہے؟ ایں ورق کہ سیاہ گشتہ مدعا اینجاست، میرے مخاطب تو تمہارے دل تھے' تمہارے کان نہیں وہ تو صرف ذریعہ تھا دلوں تک بات پہنچانے کا، مگر میں جانتا ہوں کہ اعراضِ مسلسل اور انکارِ پیہم نے اب اس قابل ہی نہ رکھا کہ تمہارے دلوں کو مخاطب کیا جائے۔ اس لیے میں دل کا نام نہیں لیتا اور تمہارے کانوں سے خطاب کرتا ہوں۔

غفلتوں کے قفل

۱۹۰٦ء میں والد مرحوم کی موجودگی میں سب سے پہلے اسی مقام سے اسی منبر پر

کھڑے ہوکر میری ایک ہی آواز جو حقیقت کی آواز ہے' بلند ہوئی اور آج مارچ ۱۹۳۶ء میں پورے تیس برس کا قرن جبکہ گزر چکا ہے' باستثناء درمیان کے چند سالوں کے جبکہ وقت کے اہم مسائل اور ملک کی نازک صورت حال نے جبراً مجھے کلکتہ سے دور و معذور رکھا تھا' میں اس حقیقت کا اعادہ کرتا رہا ہوں اور تمھیں توجہ دلاتا رہا ہوں' لیکن تم نے اب تک میری ایک بات نہ سنی۔ یہی وجہ ہے کہ آج میں تمھارے بے حس دل کو نہیں' تمھارے کانوں تک اپنی آواز' وہی حقیقت کی آواز پہنچاتا ہوں' کیونکہ تم نے اپنے دلوں پر غفلتوں کے اتنے پردے ڈال لیے ہیں، امتیاز و عرفان کے اس مرکز پر اتنے قفل چڑھا لیے ہیں کہ اس دل کو...... جسے تم آج عید کے پرتکلف کپڑوں میں چھپائے بیٹھے ہو' مخاطب نہیں کرسکتا۔

حقیقت کی آواز

جانتا ہوں کہ تم نے ہمیشہ میری بات ٹھکرائی ہے' صبح شباب کی بات نہ سنی اگرچہ حقیقت تھی' اچھا! جوانی کی دوپہر کی نصیحت پر کان نہ دھرا جو سراسر صداقت تھی' تو کیا اب شامِ زندگی کی بات بھی نہ مانو گے؟...... نہ مانو! نہ سنو۔ لیکن تم میری بات سے انکار نہیں کر سکتے' کیونکہ میری بات سے انکار' حقیقت سے انکار ہے اور تم حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے۔ تم نے میری بات سے انکار کر کے کوئی فائدہ نہ اٹھایا کیونکہ حقیقت سے انکار کر کے کوئی شخص فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ میں جو کچھ کہتا ہوں' سراسر حقیقت ہے۔ تم نے میری بات سے انکار کر کے اپنی اجتماعی عزّت کو صدمہ پہنچایا' حقیقت سے انکار کر کے کوئی شخص عزت حاصل نہیں کرسکتا۔ سن رکھو کہ حقیقت میرے ساتھ ہے' حقیقت میری آواز ہے' اور وہ کسی طرح ٹھکرائی نہیں جاسکتی۔ تم نے میری صبح شباب کی بات نہ سنی، تم نے میرے دور جوانی کی گفتگو نہ سنی، کیا اب شام زندگی کی نصیحت بھی نہ مانو گے؟

سہ سالہ نتیجہ غور و فکر

جس حقیقت کو ایک مدت سے میں تمھارے سامنے رکھتا آیا ہوں' آج پھر اسی

حقیقت کو تمھارے کانوں تک پہنچاتا ہوں' دل کا نام میں اس لیے نہیں لیتا اس کا نام لینے کی تمھیں ضد ہے۔ جو بمنزلِ انوار تھا اب وہ نفس پرستیوں اور نفسانی اغراض کا تمہارا دفینہ ہے لیکن کیا اتنے بڑے انسانی ہجوم میں پانچ دل بھی ایسے نہیں' جن میں کچھ کی صلاحیت باقی ہو اور وہ اس حقیقت کو قبول کر سکیں؟ میں پورے تیس برس کے غور وفکر کے بعد' کہ اس طویل زمانہ میں کوئی سورج اور اس کی کوئی صبح و شام ایسی نہیں گزری کہ میرے غور وفکر سے خالی گئی ہو' اور میں نے پوری توجہ اور پوری دل سوزی کے ساتھ غور و فکر نہ کیا ہو۔ مسلسل غور وخوض کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مسلمانوں کی اجتماعی فلاح وصلاح بجز اس کے کسی دوسرے معاملہ پر موقوف نہیں ہے' جو قرآن کے ہر صفحہ پر لکھا ہوا تم دیکھو گے۔

اِقَامَةِ الصَّلٰوةِ وَاِیتَاءِ الزَّکٰوةِ. (قیام نماز اور ادائیگی زکوٰۃ)

اور یہی دو مسائل ایسے ہیں' جن کو تم نے سب سے زیادہ غفلت کے حوالے کر دیا ہے۔ قرآن کریم نے اس مسئلے پر سب سے زیادہ زور دیا' مگر آج انہی دو مسائل کو تم نے سب سے زیادہ پس پشت ڈال دیا ہے' سب سے زیادہ غفلت (وہ غفلت جو انکار تو نہیں' لیکن قریبِ انکار ضرور ہے، انہیں غفلت کی نذر کر دیا ہے۔ حالانکہ کفر واسلام کے امتیاز کے سلسلہ میں بھی اسی ''نماز و زکوٰۃ'' کو معیار قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

اسلامی برادری

حالانکہ کفر واسلام کے امتیاز کے سلسلے میں بھی اسی نماز و زکوٰۃ کو معیار قرار دیا ہے۔ فرمایا:

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوْا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوةَ فَاِخْوَانُکُمْ فِی الدِّیْنِ. (11:9)

''بہر حال اگر یہ باز آ جائیں' نماز قائم کریں' زکوٰۃ ادا کریں تو (پھر ان کے خلاف تمھارا ہاتھ نہیں اٹھنا چاہیے۔ وہ) تمھارے دینی بھائی ہو گئے ہیں۔''

وہ اگر پچھلی بداعمالیوں سے تائب ہو جائیں، نماز پڑھیں اور زکوٰۃ کی پابندی کا اقرار کریں' تو وہ بھی تمھاری برادری میں شامل کیے جا سکتے ہیں۔

انحصار و مدار اسلام

معلوم ہوا کہ شرطِ اسلام، انحصار و مدارِ اسلام، نیک عملی کے ساتھ ساتھ مشروط ہے قیامِ صلوۃ اور ادائے زکوٰۃ پر۔ غور کرو گے تو خود سمجھ لو گے کہ اسلامی اعمال و احکام قطعاً اجتماعیت کے حامل ہیں۔ اسلام اپنے حلقہ بگوش افراد سے خود اسی کے مفاد کے لیے مطالبہ کرتا ہے کہ اس کا ہر عمل اجتماعی ہو۔ اسی لیے فرض قرار دیا گیا کہ نماز ہر مسلمان بہ استثنائے حالت مجبوری ہمیشہ جماعت کے ساتھ ادا کرے۔ اگر مشاغلِ معاش و ذرائع روزی مخل ہوں تو لازم ہے کہ کم سے کم ایک وقت کی نماز ضرور مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ ادا کرے۔

زکوٰۃ

اسی طرح زکوٰۃ کے بارے میں بھی حکم ہے کہ مسلمانوں کی زکوٰۃ بھی اجتماعی صورت سے حاصل و تقسیم کی جائے۔ کچھ پرواہ نہیں، اگر سارے شہر کی تنظیم نہیں ہو سکتی۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اور آج میں اس غلط فہمی کی بھی تردید کر دوں جو بعض حلقوں میں ظاہر کی جارہی ہے کہ اس کے لیے امارت کی شرط ہے...... امارت کی قطعاً کوئی شرط نہیں، اِلّا یہ کہ وہ ایک اولیٰ صورت ہے۔ لیکن اگر امارت، حالات کے تقاضا یا ماحول کے امر سے بعید الامکان یا ناممکن ہے تو اس چیز کو جائز یا ناجائز بہانہ بنا کر اللہ کے ایک واضح، صریح اور تاکیدی حکم میں لیت و لعل، حیل و حجت یقیناً سخت قابلِ مواخذہ، اور لائق سخت وعید ہے۔

جو لوگ فرداً فرداً زکوٰۃ اپنے طور پر ادا کرتے ہیں، میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ درست نہیں ہے اور آج میں ایک قدم اور آگے بڑھتا ہوں اور اس منبر پر سے پوری ذمہ داری کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ صرف یہی نہیں کہ ایسی زکوٰۃ جو انفرادی طور پر ادا کی گئی ہے، درست نہیں ہے، بلکہ صحیح اور اصح یہ ہے کہ وہ زکوٰۃ ہی نہیں ہے...... ایسی رقم کو کوئی دوسرا نام دیا جا سکتا ہے جو چاہو رکھ لو مگر اسے زکوٰۃ کا نام نہیں دیا جا سکتا۔

چھنی ہوئی برکات کی واپسی

بس جب تک تم بہ حیثیت مسلمان، اجتماعی طور پر قرآن کے حکم اور منشائے فطرت کے ماتحت اپنے اعمال خصوصاً نماز وزکوٰۃ کو تنظیم کے ساتھ ادا نہیں کرتے' وہ تمام دینی برکات اور وعدے، جن کی تم کو تلاش ہے، ہمیشہ تم سے دور رہیں گے اور جس دن تم نے اجتماعی شکل اور اعمال میں اجتماعی حسنِ نظام پیدا کر لیا، یقین کرو کہ چھنی ہوئی تمام دولت تم کو پھر سونپ دی جائے گی۔

تحصیل و تنظیم زکوٰۃ

میں تمہیں آج پھر تاکید کرتا ہوں کہ اپنے اعمال میں اجتماعیت کی صورت پیدا کرو۔ اٹھو اور ہر ہر قصبہ اور محلّہ میں کم سے کم پانچ آدمیوں کی ایک کمیٹی بنالو۔ چھ بھی نہیں' صرف پانچ' جو زکوٰۃ کی تحصیل و تنظیم کرے اور اسے پوری ذمہ داری اور باقاعدگی کے ساتھ صرف کرے۔ تم دیکھو گے کہ بہت جلد پورا محلّہ بلکہ پورا شہر تمہاری کمیٹی کا ممبر بن جائے گا۔ اور یہ ایک نمونہ ہوگا جس کی تقلید کر کے خیر و برکت کے متلاشی اپنی سعادتوں اور گم شدہ متاع و دولتِ حشمت ڈھونڈیں گے۔ کیا تم میں سے ایسے پانچ دل بھی نہیں جو میری بات بگوش دل سن سکیں؟

فکری وسائل و عملِ اجتماعی

یاد رکھو! محض فکری وسائل سے تم اپنے کھوئے ہوئے وقار اور دولت کو حاصل نہیں کر سکتے۔ بنیادی چیز جس کو تم نے اپنی غفلتوں اور گمراہیوں کی نذر کر دیا ہے یعنی عمل اور عمل اجتماعی' جب تک اس پر استوار اور مضبوطی کے ساتھ قائم نہیں ہوتے' تم کو اس وقت تک کھویا ہوا وقار یا چھنی ہوئی دولت واپس نہیں مل سکتی۔

فکری وسائل کو محض دماغ کا اندرونی رنگ و روغن سمجھو' یہ باہر کا رنگ و روغن نہیں ہے۔ باہر کی دیواریں جب ہی رنگین ہوں گی' جب عمل کا رنگ و روغن ابھر آئے' اور عمل میں جب ہی رنگ و روغن پیدا ہوگا' جب جڑ اور بنیاد مضبوط رکھو گے۔

بامِ رفعت پر صعود

تم کسی درخت کو ہرا بھرا، سبز و شاداب رکھنے کے لیے شاخوں اور پتوں میں پانی ڈالو گے تو درخت ہرگز سرسبز نہ ہوگا۔ البتہ اگر تم جڑ میں پانی دو گے اور اس کو ہرا بھرا رکھو گے تو تمام درخت سرسبز و شاداب اور بارآور رہے گا۔ لہٰذا اگر تم اپنے کھوئے ہوئے وقار اور چھنی ہوئی دولت کی واپسی کی کھوج میں ہو، اگر تم موجودہ پستی سے دوبارہ بامِ رفعت پر پہنچنا چاہتے ہو تو جڑ، بنیاد اور اصل کی شادابی کی فکر کرو، یعنی اپنی نمازوں پر استوار ہو جاؤ اور اجتماعی شکل میں زکوٰۃ کی تنظیم و تقسیم پر قائم و عامل ہو جاؤ کہ یہی دونوں عمل اصل اور بنیاد ہیں اور انہی پر مضبوطی کے ساتھ قائم و عامل ہونے پر کھوئی ہوئی دولت کی واپسی کا مدار و انحصار ہے۔

هذا، وان احسن الكلام، كلام اللّٰه، الملك العلام،
فبشر عبادی الذین یستمعون القول فیتبعون احسنه
واولئک هم المفلحون.

فریضۂ زکوٰۃ اور اس کی ضرورت

مصائبِ عظیمہ کی مصیبتِ کبریٰ

حکم زکوٰۃ ایک اعظم ترین فرائض مسلمین اور اہم ترین احکام شریعت حقّۂ اسلامیہ میں سے ہے اور اس کی فرضیّت مثلِ فرضیّت حج اور صلوٰۃ و صیام، نصوص قطعیۂ شریعت اور تعاملِ غیر منقطع اہل اسلام سے ثابت ہے۔ منجملہ ہمارے موجودہ مصائب عظیمہ کے ایک مصیبت کبریٰ یہ ہے کہ اس فرض کی طرف سے غفلت و تساہل بالعموم طاری و ساری اور اس کے جمع و صرف کے لیے انتظام و اہتمام کے وسائل مفقود۔ ہم نے گھر کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں اور دنیا کے دور و دراز گوشوں میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔

یورپ اور اس کے مصائب

آج یورپ میں مختلف مدارج و طبقات کے تصادم اور فقراء و عمال[2] کے افلاس و مصائب اور دولت کی عدم تقسیم و مرکزیت[3] کی وجہ سے موجودہ ہیئت اجتماعیہ اور معیشت مدنیہ کی بنیادیں ہل رہی ہیں۔ اشتراکیہ (سوشلزم) کی اسی لیے پیدائش ہوئی' اور فوضویہ (نہلزم) کے مہیب وجود کی تولید اسی کا نتیجہ ہے۔

کل کی بات ہے کہ انگلستان میں مسٹر لائڈ جارج نے امراء واشراف کے ٹیکس کا مسئلہ اٹھایا تھا اور برطانیہ کے مزدوروں کی اصلاح حالت اور تقویت مالی کے مقصد نے ایک سخت ہنگامہ مچا دیا تھا۔

یہ سب کچھ قوم کے مفلس حصے کی ضروریات کے پورا نہ ہونے ہی کا نتیجہ ہے۔ جرمنی اور بعض حصص امریکہ میں غرباء ومحتاجین کے لیے حکومت اور قوم کے مشترک فنڈ قائم کیے گئے ہیں۔

کواپریٹو سوسائٹیاں اور زرعی دیہاتی بنکیں جو آج قائم کی جا رہی ہیں' یہ بھی دراصل اسی ضرورت کا علاج ہے کہ قوم کے محتاج اور بے مایہ حصے کی اعانت کی جائے۔

اسلام اور مفاسدِ اجتماعیہ کا علاج

لیکن اسلام نے اپنے ظہور کے ساتھ ہی ان مفاسدِ اجتماعیہ ومدنیہ کا علاج کر دیا تھا۔ فریضۂ زکوٰۃ کی بہت بڑی مصلحت یہی تھی کہ اس کے ذریعہ قوم کے مفلس ومحتاج حصے کی ضروریات کا انتظام کیا جائے۔ نیز صدہا ملّی احتیاجات مالیہ کے لیے ایک دائمی خزینہ (فنڈ) مہیا ہو جائے۔

حرمت سود کی وجہ

اسلام نے ایک طرف تو سود حرام کیا' جو غریبوں اور محتاجوں کی زندگی کے لیے مہلک وسم قاتل تھا' اور جس کے ذریعہ دولت مندوں کو ان پر ایک جابرانہ وظالمانہ تسلط کا موقع مل جاتا تھا، دوسری طرف اس کے بدلے زکوٰۃ کو فرض کر دیا تا کہ جن احتیاجات کی وجہ سے غریب ومحتاج طبقہ سود دینے پر مجبور ہو جاتا ہے' وہ پیش ہی نہ آئیں۔

تشکیل و تنظیمِ فریضہ زکوٰۃ

فی الحقیقت موجودہ زمانے کے وقت کے کاموں میں سے ایک اہم اور ضروری کام فریضہ زکوٰۃ کی تعمیل اور اس کے جمع و خرچ کے انتظامات کی باقاعدہ تشکیل بھی ہے اور اس عاجز کے بعض پیش نظر کاموں میں اس کی تحریک بھی داخل ہے وَكُلُّ اَمْرٍ مَرْهُوْنٍ بِاَوْقَاتِهَا.

مصائب کی اصلی وجہ

دراصل یہ تمام مصیبتیں اس لیے ہیں کہ "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" کے سلسلۂ حقہ کا عملاً سدباب ہو گیا ہے۔ علماء اپنے قدرتی فرائض کو بھلا چکے ہیں اور دارالشفاء کے طبیب خود ہی بیمار اور محتاجِ اطباء ہیں۔ ایسی حالت میں کس کس بات پر روئیے اور کس کس بات کا ماتم کیجئے۔!

تن ہمہ داغدار شد پنبہ کجا کجا نہی

زکوٰۃ اور قرآن حکیم

مستحقین زکوٰۃ

ارشاد ہوتا ہے۔

اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِي سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۔ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْم" حَكِيْم".(۹:۶۰)

صدقہ کا مال (یعنی مال زکوٰۃ) تو اور کسی کے لیے بھی نہیں ہے۔ صرف (۱) فقیروں کے لیے ہے، اور (۲) مسکینوں کے لیے ہے، اور (۳) ان کے لیے جو اس کی وصولی کے کام پر مقرر کیے جائیں، اور (۴) وہ کہ ان کے دلوں میں (کلمہ حق کی) الفت پیدا کرنی ہے، اور (۵) وہ کہ ان کی گردنیں (غلامی کی زنجیروں میں) جکڑی ہیں (اور انھیں آزاد کرانا ہے)، نیز (۶)

قرض داروں کے لیے (جو قرض کے بوجھ سے دب گئے ہوں' اور ادا
کرنے کی طاقت نہ رکھیں اور (۷) اللہ کی راہ میں (یعنی جہاد کے لیے اور
ان تمام کاموں کے لیے جو مثل جہاد کے' اعلائے کلمہ حق کے لیے ہوں)'
اور (۸) مسافروں کے لیے جو اپنے گھر نہ پہنچ سکتے ہوں اور مفلسی کی
حالت میں پڑ گئے ہوں) یہ اللہ کی ٹھہرائی ہوئی بات ہے' اور اللہ (سب
کچھ) جاننے والا (اپنے تمام حکموں میں حکمت رکھنے والا ہے۔)

(یہ) آیت مصارف زکوۃ کے بارے میں اصل واساس ہے اور ضروری ہے کہ اس کی اہمیت واضح ترین الفاظ میں بیان کر دی جائے۔

احتیاج اور اس کی حدود

فقیر اور مسکین دونوں سے مقصود ایسے لوگ ہیں جو محتاج ہوں' لیکن فقیر عام ہے اور مسکنت کی حالت خاص ہے۔ فقیر اسے کہیں گے جس کے پاس ضروریات زندگی کے لیے کچھ بھی نہ ہو۔ لیکن مسکین وہ ہے جس کی احتیاج ابھی اس آخری درجہ تک تو نہیں پہنچی' مگر پہنچ جائے گی اگر خبر گیری نہ کی جائے۔ مثلاً سوسائٹی کے ایسے افراد جو مختلف اسباب سے مفلس ہو گئے ہیں یا وسائل معیشت کا اہتمام نہیں کر سکتے۔ ان کے جسم پر اجلے کپڑے ابھی باقی ہیں' گھر میں تھوڑا بہت سامان بھی نکل آئے گا' ممکن ہے دو چار روپے بھی جیب میں موجود ہوں۔ اگر انھیں آج کھانا نہ ملے تو بھوکے نہیں رہیں گے' کل نہ ملے تو برتن بیچ لیں گے' پرسوں نہ ملے تو کپڑے فروخت کر ڈالیں گے۔ لیکن پھر اس کے بعد؟ کوئی وسیلۂ معاش سامنے نہیں دیکھتے۔

فقیر اور مسکین میں اس لحاظ سے بھی فرق ہے کہ فقیر کو سوال کرنے میں عار نہیں ہوتا' لیکن مسکین کو اس کی خودداری اور عفتِ نفس' طلب والحاح کی اجازت نہیں دیتی۔ صحیحین کی ایک حدیث میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسکین کی یہ تعریف کی ہے۔

الذی لا یجد غنی یغنیہ ولا یفطن فیتصدق علیہٗ ولا
یقوم فیسئال الناس'

(۱) جسے ایسے وسائل میسر نہیں کہ تونگر کر دیں۔
(۲) جس کا فقر ظاہر نہیں کہ لوگ خیرات دیں۔
(۳) جو خود سوال کے لیے کھڑا نہیں ہوتا کہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے۔

اور پھر اسی حدیث میں سورہ بقرہ کی (اس) آیت کی طرف اشارہ فرمایا کہ:

یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِیْمٰهُمْ لَا یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافاً. (۲:۲۷۳)

(۱) ان کی خودداری کا یہ حال ہے کہ ناواقف خیال کرے یہ تونگر ہیں'
(۲) تم انھیں ان کے چہروں سے پہچان لے سکتے ہو'
(۳) مگر وہ لوگوں کے پیچھے پڑ کر کبھی سوال نہیں کرتے۔

وسعتِ حلقۂ مساکین:

بلاشبہ ایسے علمائے دین جو سورۂ بقرہ کی آیت متذکرہ صدر کے مصداق ہوں کہ

اَلَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ' لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ. (۲:۲۷۳)

یعنی دین کی تعلیم و خدمت کے لیے وقف ہو گئے ہوں اور فکر معیشت کے لیے وقت نہ نکال سکیں۔

مساکین میں داخل ہیں۔ بشرطیکہ انھوں نے تعلیم دین کو حصول زر کا پیشہ نہ بنالیا ہو۔ احتیاج سے زیادہ نہ لیتے ہوں اور کسی حال میں خود سائل و ساعی نہ ہوتے ہوں۔ نیز وہ تمام افراد جو ان کی طرح خدمتِ دین و اُمّت کے لیے وقف ہو جائیں اور معیشت کا کوئی سامان نہ رکھتے ہوں' اسی کے تحت میں آتے ہیں۔

یقینی مساکین

قوم کے ایسے افراد جن پر وسائل معیشت کی تنگی کی وجہ سے معیشت کے دروازے بند

ہو رہے ہیں، اور اگر چہ وہ خود پوری طرح ساعی ہیں، لیکن نہ تو نوکری ہی ملتی ہے، نہ کوئی اور راہِ معیشت نکلتی ہے، یقیناً مساکین میں داخل ہیں اس مد کے اولین مستحق ہیں، لیکن اس کا انتظام اس طرح ہونا چاہیے کہ ان کی خبر گیری بھی ہو جائے اور ساتھ ہی ان میں بے کاری کی عادت اور اپاہج پنا بھی پیدا نہ ہو۔ یہ بات نہ صرف انہی لوگوں کی اعانت میں، بلکہ تمام مستحقین کی اعانت میں ملحوظ رہنی چاہیے۔

حکمی مساکین

ایسے افراد جو خوشحال تھے، لیکن کاروبار کی خرابی کی وجہ سے یا کسی اور ناگہانی مصیبت کی وجہ سے مفلس ہو گئے ہیں، اگر چہ اپنی پچھلی حیثیت کی بناء پر معزز سمجھے جاتے ہوں، حکماً مساکین میں داخل ہیں اور ضروری ہے کہ اس مد میں سے ان کی خبر گیری کی جائے۔

تصریحات کتاب وسنت

(سوال پیدا ہوتا ہے کہ) ان مصارف کے بیان سے مقصود یہ ہے کہ زکوٰۃ کی ہر رقم ان سب میں وجوباً تقسیم کی جائے، یا یہ ہے کہ: خرچ ان ہی میں کی جا سکتی ہے؟ (لیکن) جس مصرف میں خرچ کرنا ضروری ہو اسی میں خرچ کی جائے؟ تو اس بارے میں بعض فقہا نے اختلاف کیا ہے۔ لیکن جمہور کا مذہب یہی ہے کہ تمام مصارف میں بہ یک وقت تقسیم کرنا ضروری نہیں۔ بلکہ جس وقت جیسی حالت اور جیسی ضرورت ہو اسی کے مطابق خرچ کرنا چاہیے اور یہی مذہب قرآن وسنت کی تصریحات اور روح کے عین مطابق ہے۔ آئمہ اربعہؒ میں صرف امام شافعیؒ اس کے خلاف گئے ہیں۔

مصارف کی قدرتی ترتیب

یہ آٹھ مصارف جس ترتیب سے بیان کیے گئے ہیں اگر غور کرو گے تو معلوم ہو جائے گا کہ معاملہ کی قدرتی ترتیب بھی یہی ہے۔ سب سے پہلے ان دو گروہوں کا ذکر کیا ہے جو استحقاق میں سب سے زیادہ مقدم ہیں، کیونکہ زکوٰۃ کا اولین مقصود ان ہی کی اعانت ہے، یعنی

(۱) فقراء اور (۲) مساکین

پھر اس گروہ کا ذکر کیا ہے جس کی موجودگی کے بغیر زکوٰۃ کا نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ اور اس اعتبار سے اس کا تقدّم ظاہر ہے۔ لیکن چونکہ اس کا استحقاق بالذات نہیں تھا' اس لیے اسے اوّلین جگہ نہیں دی جاسکتی تھی' پس دوسری جگہ پائی: یعنی

(۳) **العاملین علیہا**. یعنی جو لوگ مالِ زکوٰۃ وصول کر کے بیت المال میں جمع کرتے اور اس کے مصارف میں باقاعدہ صرف کرتے ہیں۔

(۴) پھر **المؤلفة قلوبهم** کا درجہ ہوا کہ ان کا دل ہاتھ میں لینا ایمان کی تقویت اور حق کی اشاعت کے لیے ضروری تھا۔

(۵) پھر غلاموں کو آزاد کرانے اور قرضداروں کو بارِ قرض سے سبکدوش کرانے کے مقاصد نمایاں ہوئے' جو نسبتاً موقت اور محدود تھے۔

(۷) پھر فی سبیل اللہ کا مقصد رکھا گیا کہ اگر مستحقین کی پچھلی جماعتیں کسی وقت مفقود ہو گئی ہوں یا مقتضیاتِ وقت نے ان کی اہمیت کم کر دی ہو یا مال زکوٰۃ کی مقدار بہت زیادہ ہو گئی ہو تو ایک جامع و حاوی مقصد کا دروازہ کھول دیا جائے' جس میں دین واُمّت کے مصالح کی ساری باتیں آجائیں۔

(۸) سب سے آخر میں ابن السبیل کی جگہ ہوئی' کیونکہ تقدم میں یہ سب سے کم اور مقدار کے لحاظ سے بہت ہی محدود صورت میں پیش آنے والا مصرف تھا۔

فی سبیل اللہ کا مفہوم

قرآن کی اصطلاح میں وہ تمام کام جو براہ راست دین وملّت کی حفاظت وتقویّت کے لیے ہوں' سبیل اللہ کے کام ہیں۔ اور چونکہ حفظ وصیانتِ امت کا سب سے زیادہ ضروری کام دفاع ہے، اس لیے زیادہ تر اطلاق اسی پر ہوا۔ پس اگر دفاع درپیش ہے اور امامِ وقت اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ مدِ زکوٰۃ سے مدد لی جائے' تو اس میں خرچ کیا جائے گا۔ ورنہ دین وامت کے عام مصالح میں مثلاً قرآن اور علوم دینیہ کی ترویج واشاعت

میں، مدارس کے اجراء وقیام میں، دعاۃ ومبلغین کے قیام وترسیل میں، ہدایت وارشادِ امت کے تمام مفید وسائل میں۔[5]

اسلامی زندگی کی اولین شناخت

دنیا میں کوئی دین نہیں جس نے محتاجوں کی اعانت اور ابنائے جنس کی خدمت کی تلقین نہ کی ہو اور اسے عبادت یا عبادت کا لازمی جزو نہ قرار دے دیا ہو، لیکن یہ خصوصیت صرف اسلام ہی کی ہے کہ وہ صرف اتنے ہی پر قانع نہیں ہوا، بلکہ ہر مستطیع مسلمان پر ایک خاص ٹیکس مقرر کر دیا ہے جو اسے اپنی تمام آمدنی کا حساب کر کے سال بہ سال ادا کرنا چاہیے اور پھر اسے اس درجہ اہمیت دی کہ اعمال میں نماز کے بعد اسی کا درجہ ہوا اور قرآن نے ہر جگہ دونوں عملوں کا ایک ساتھ ذکر کر کے یہ بات واضح کر دی کہ کسی جماعت کی اسلامی زندگی کی سب سے پہلی شناخت یہی دو عمل ہیں: نماز اور زکوٰۃ۔

عدمِ تعمیل کی سزا

اگر کوئی جماعت بہ حیثیت جماعت کے انھیں یک قلم ترک کر دے گی تو اس کا شمار مسلمانوں میں نہ ہوگا۔ اور یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام نے مانعینِ زکوٰۃ سے قتال کیا اور حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ:

واللّٰہ لاقاتلن من فرق بین الصلوٰۃ والزکوٰۃ (متفق علیہ)

"خدا کی قسم میں ہر اس شخص سے جہاد کروں گا جس نے نماز اور زکوٰۃ میں فرق کیا۔"

غرض وغایت زکوٰۃ

پھر اس باب میں اس کی ایک دوسری خصوصیت بھی ہے، یعنی وہ علت جو نہ صرف زکوٰۃ کے لیے بلکہ تمام صدقات وخیرات کے لیے قرار دی گئی اور جس کی وجہ سے اس معاملہ نے بالکل ایک دوسری ہی نوعیت اختیار کر لی۔

كَيْ لَايَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ. (۵۹:۷)

''تا کہ ایسا نہ ہو' مال و دولت صرف دولت مندوں کے گروہ ہی میں محصور ہو کر رہ جائے۔''

یعنی زکوٰۃ کا مقصد یہ ہے کہ دولت سب میں پھیلے' سب میں بٹے' کسی ایک گروہ ہی کی ٹھیکیداری نہ ہو جائے۔ اور اسی سورۃ کی آیت ۳۴ میں گزر چکا ہے:

وَالَّـذِيْـنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ' فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ. (۹:۳۴)

''جو لوگ چاندی سونا خزانہ بنا کر رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے' ان کے لیے اگر کوئی بشارت ہو سکتی ہے تو یہی کہ عذابِ دردناک کی بشارت دے دو!''

اور حدیث بعثتِ معاذ الٰی الیمن میں زکوٰۃ کا مقصد یہ فرمایا کہ۔

توخذ من اغنیائھم' فترد فی فقراء ھم. (رواہ الجماعۃ)

''ان کے دولتمندوں سے وصول کی جائے اور پھر ان کے محتاج افراد میں لوٹائی جائے۔''

قرآن اور احتکار و اکتنازِ دولت

روح قرآن اور تقسیم ترکہ

ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم کی روح' دولت کے احتکار و اختصاص کے خلاف ہے' یعنی وہ نہیں چاہتا کہ دولت کسی ایک گروہ کی ٹھیکیداری اور اجارہ داری میں آ جائے یا سوسائٹی میں کوئی ایسا طبقہ پیدا ہو جائے جو دولت کو خزانہ بنا بنا کر جمع کرے۔ بلکہ وہ (قرآن) چاہتا ہے کہ دولت ہمیشہ سیر و گردش میں رہے اور زیادہ سے زیادہ تمام افرادِ قوم میں پھیلے اور منقسم ہو۔

یہی وجہ ہے کہ اس نے ورثاء کے لیے تقسیم و اسہام کا قانون نافذ کر دیا ہے اور اقوامِ عالم کے عام قوانین کی طرح یہ نہیں کیا کہ خاندان کے ایک ہی فرد کے قبضہ میں رہے۔ جونہی

ایک شخص کی آنکھیں بند ہوئیں' اس کی دولت جو اس وقت تک تنہا ایک جگہ میں تھی' اب وارثوں میں بٹ کر کئی جگہوں میں پھیل جائے گی اور پھر ان میں سے ہر وارث کے وارث ہوں گے اور اسے بانٹتے اور پھیلاتے رہیں گے۔

تحریم سود کی حکمت

اور پھر یہی وجہ ہے کہ اس نے سود کا لین دین حرام کر دیا' اور قاعدہ یہ ٹھہرایا کہ:

یَمۡحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰو وَيُرۡبِيۡ الصَّدَقَاتُ. (۲:۲۷۶)

''اللہ سود کا جذبہ گھٹانا چاہتا ہے۔ خیرات کا جذبہ بڑھانا چاہتا ہے۔''

یعنی یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کے مقابل ہوئیں جس قوم میں سود کا جذبہ ابھرے گا' اس کے غالب افراد شقاوت و محرومی میں مبتلا رہیں گے۔ جس قوم میں خیرات کا جذبہ ابھرے گا' اس کا کوئی فرد محتاج و مفلس نہیں رہے گا۔ اور اسی لیے اُس (قرآن) نے سود کے معاملہ کو اتنی اہمیت دی کہ فرمایا:

جو لوگ اس پر مصر رہیں گے' وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے خلاف اعلان جنگ کریں گے۔

فَاذَنُوۡا بِحَرۡبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ. (۲:۲۷۹)

(ممانعت کے بعد بھی سود کے پیچھے پڑے رہے) تو پھر اللہ اور اس کے رسولؐ سے جنگ کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

کیونکہ اس معاملہ پر جماعت کی بنیادی فلاح موقوف تھی' اور ضروری تھا کہ اسے ایمان و انقیاد کا معیار قرار دیا جاتا۔

انفاق فی سبیل اللہ کی حکمت

اور یہی وجہ ہے کہ سورۂ بقرہ میں انفاق کا حکم دینے کے بعد متصلاً فرمایا۔

يُؤۡتِي الۡحِكۡمَةَ مَنۡ يَّشَآءُ وَمَنۡ يُّؤۡتَ الۡحِكۡمَةَ فَقَدۡ اُوۡتِيَ

خَيۡرًا كَثِيۡرًا ؕ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ.(۲:۲۶۹)

''وہ جسے چاہتا ہے' حکمت دے دیتا ہے اور جس کسی کو حکمت مل گئی، تو یقین کرو، اس نے بڑی ہی بھلائی پالی اور نصیحت حاصل نہیں کرتے' مگر وہی لوگ جو عقل وبصیرت رکھنے والے ہیں۔''

یعنی یہ بات کہ اپنی کمائی کا ایک حصہ دوسرے افراد جماعت کو دے دینا، کھودینا اور ضائع کرنا نہیں ہے، بلکہ پالینا ہے اور یہ ایک بہت ہی دقیق بات ہے۔ اسے وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو صاحبِ حکمت ہیں۔ اور جس کسی نے حکمت کی دولت پائی تو اس نے بڑی سے بڑی بھلائی پالی۔ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّا اُولُوا الۡاَلۡبَابِ[۱]

اسلامی سوسائٹی کی نوعیت

قرآن وسنت کی تعلیمات اور صحابہ کرامؓ کی عملی زندگی کے مطالعہ کے بعد مجھے اس حقیقت کا پورا اِذعان ہوگیا ہے کہ اسلام کے بنائے ہوئے اجتماعی نقشہ میں دولت اور وسائلِ دولت کے احتکار اور اکتناز کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ احتکار' یہ کہ دولت کا کسی ایک طبقہ ہی میں محصور ہوکر رہ جانا۔ اکتناز' یہ کہ دولت کے بڑے بڑے خزانوں کا افراد کے پاس جمع ہو جانا۔ اِس (قرآن) نے سوسائٹی کی نوعیت کا جو نقشہ بنایا ہے اگر ٹھیک ٹھیک قائم ہو جائے اور صرف چند خانے ہی نہیں' بلکہ تمام خانے اپنی اپنی جگہ بن جائیں تو ایک ایسا اجتماعی نظام پیدا ہو جائے گا جس میں نہ تو بڑے بڑے کروڑ پتی ہوں گے نہ مفلس ومحتاج طبقے بلکہ ایک طرح کی درمیانی حالت غالب افراد پر طاری وساری نظر آئے گی۔

بلاشبہ زیادہ سے زیادہ کمانے والے افراد موجود ہوں گے' کیونکہ سعی وکسب کے بغیر کوئی مومن زندہ ہی نہیں رہ سکتا لیکن جو فرد جتنا زیادہ کمائے گا' اتنا ہی زیادہ انفاق پر مجبور بھی ہوگا۔ اس لیے افراد کی کمائی جتنی بڑھتی جائے گی' اتنی ہی زیادہ جماعت بہ حیثیت جماعت کے خوش حال ہوتی جائے گی۔ قابل اور مستعد افراد زیادہ سے زیادہ کمائیں گے لیکن صرف اپنے ہی لیے نہیں کمائیں گے بلکہ تمام افراد قوم کے لیے کمائیں گے اور یہ صورت نہ پیدا ہو

سکے گی کہ ایک طبقہ کی کمائی دوسرے طبقوں کے لیے محتاجی و مفلسی کا پیام ہو جائے' جیسا کہ اب عام طور پر ہو رہا ہے۔

اجتماعی مشکلات کا حل

یہ بات کہ قرآن کی تعلیم کے مطابق دنیا میں کس طرح کی مدنیت اور اجتماعیت پیدا ہو سکتی ہے؟ جس درجہ اہم ہے اتنی ہی زیادہ دقیق بھی ہے۔ اگر مسلمان آج اور کچھ نہ کریں' صرف زکوٰۃ کا معاملہ ہی احکامِ قرآنی کے مطابق درست کر لیں تو بغیر کسی تامل کے دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی تمام اجتماعی مشکلات و مصائب کا حل خود بخود پیدا ہو جائے گا۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ مسلمانوں نے یا تو احکامِ قرآنی کی تعمیل یک قلم ترک کر دی ہے یا پھر عمل بھی کر رہے ہیں تو اس طرح کہ فی الحقیقت عمل نہیں کر رہے۔

زکوٰۃ کا نظام شرعی

زکوٰۃ اور اس کی ادائیگی

قرآن نے زکوٰۃ کا معاملہ ایک خاص نظام سے وابستہ کر دیا ہے اور اسی نظام کے قیام پر اس کے تمام مقاصد و مصالح کا حصول موقوف ہے۔ زکوٰۃ ایک ٹیکس ہے۔ بالکل اسی طرح کا ٹیکس ہے جس طرح آج کل انکم ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔ پس اس کی ادائیگی کا طریقہ یہ نہ تھا کہ ہر شخص خود ہی اپنا ٹیکس نکالے اور خود ہی خرچ بھی کر ڈالے۔ بلکہ اسکا انتظام یہ تھا کہ حکومت اپنے کلکٹروں کے ذریعہ ہر شخص سے وصول کر کے بیت المال میں جمع کرتی تھی۔ جب ایک شخص نے حکومت کے مقررہ عامل کو اپنی زکوٰۃ دے دی اس کی زکوٰۃ ادا ہو گئی۔ چنانچہ اسی لیے کلکٹروں اور عاملوں کی تنخواہ کا بار بھی اسی فنڈ پر ڈال دیا گیا ہے اور صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا ہے۔

وَالْعَامِلِیْنَ عَلَیْهَا.

جو کارندے وصولی کے لیے مقرر ہوں ان کے ضروری مصارف (بھی اس

فنڈ سے ادا کیے جائیں)

اگر ادائیگی کے لیے یہ بات ضروری نہ ہوتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ مصارف کی مد میں مستقلاً عُمّالِ حکومت کا ذکر کیا جاتا۔

عمال حکومت کی اطاعت کا حکم

اور پھر یہی وجہ ہے کہ صاف وصریح لفظوں میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اس بارے میں عُمّالِ حکومت کی پوری پوری اطاعت کریں اور بلا عذر زکوٰۃ ان کے حوالہ کر دیں۔ حتیٰ کہ اگر عمال ظالم بھی ہوں یا بیت المال کا روپیہ ٹھیک طور پر خرچ نہ ہو رہا ہو، جب بھی اصلاح حال کی سعی کے ساتھ ادائیگی کا سلسلہ جاری رکھنا چاہیے۔ یہ نہیں کرنا چاہیے کہ بطور خود خرچ کر ڈالی جائے۔

بشر بن خصاصہؓ کی روایت میں ہے کہ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شکایت کی:

ان قومًا من اصحاب الصدقة يعتدون علينا.

عمال کا ایک گروہ صدقہ لینے میں ہم پر زیادتیاں کرتا ہے۔ کیا اس کا مقابلہ کریں؟ آپ نے ارشاد فرمایا "نہیں" (ابوداؤد)

سعد بن وقاصؓ کی روایت میں صاف موجود ہے۔

ادفعوا اليهم ماصلوا

جب تک وہ نماز پڑھتے ہیں زکوٰۃ انھیں دیتے رہو۔

بنوامیہ کے زمانہ میں جب نظامِ خلافت بدل گیا اور حکام ظلم وتشدد پر اتر آئے تو بعض لوگوں کو خیال ہوا کہ ایسے لوگ ہماری زکوٰۃ کے کیوں کر امین سمجھے جائیں! لیکن تمام صحابہؓ نے یہی فیصلہ کیا کہ زکوٰۃ انہی کو دینی چاہیے۔ یہ کسی نے نہیں کہا کہ خود اپنے ہاتھ سے خرچ کر ڈالو۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا، زکوٰۃ کسے دیں؟ آپ نے فرمایا "وقت کے حاکموں کو"۔ اس نے پھر عرض کی:

اذا یتخذون بھا ثیابًا وطیبًا

وہ تو زکوٰۃ کا روپیہ اپنے کپڑوں اور عطروں پر خرچ کر ڈالتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ''وَاِن'' اگرچہ وہ ایسا کرتے ہوں مگر دو انہی کو، (ابن ابی شیبہ) کیونکہ زکوٰۃ کا معاملہ بغیر نظام کے قائم نہیں رہ سکتا۔

شرعی نظام سے انحراف کی بنیاد

صدرِ اوّل سے لے کر آخر عہد عباسیہ تک یہ نظام بلا استثناء قائم رہا۔ لیکن ساتویں صدی ہجری میں تاتاریوں کا سیلاب تمام اسلامی ممالک میں اُمڈ آیا اور نظام خلافت معدوم ہو گیا تو سوال پیدا ہوا کہ اب کیا کرنا چاہیے؟ فقہاء حنفیہ کے جس قدر شروح و متون اور کتب وفتاوی آج کل متداول ہیں، زیادہ تر اسی دور میں یا اس کے بعد لکھے گئے ہیں۔ اس وقت پہلے پہل اس بات کی تخم ریزی ہوئی کہ زکوٰۃ کی رقم بطور خود خرچ کر ڈالی جائے۔ کیونکہ غیر مسلموں کو نہیں دی جا سکتی۔ مگر ساتھ ہی فقہاء نے اس پر بھی زور دیا کہ جن ملکوں میں اسلامی حکومت قائم نہیں رہی ہے اور اعادۂ حالت فوراً ممکن نہیں تو وہاں کے مسلمانوں کے لیے ضروری قرار دیا گیا کہ کسی اہل مسلمان کو اپنا امیر مقرر کر لیں اور اپنی زکوٰۃ اس کے حوالے کر دیں، تاکہ اسلامی زندگی کا نظام قائم رہے، معدوم نہ ہو جائے۔

مسلمانوں کی غفلت

لیکن افسوس ہے کہ بعد کو بتدریج اس نظام کی اہمیت سے مسلمان غافل ہوتے گئے اور رفتہ رفتہ یہ حالت ہو گئی کہ لوگوں نے سمجھ لیا کہ زکوٰۃ نکالنے کا معاملہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ خود حساب کر کے ایک رقم نکال لیں اور پھر جس طرح چاہیں، خود ہی خرچ کر ڈالیں۔ حالانکہ جس زکوٰۃ کی ادائیگی کا قرآن نے حکم دیا ہے اس کا قطعاً یہ طریقہ نہیں ہے اور مسلمانوں کی جو جماعت اپنی زکوٰۃ کسی امینِ زکوٰۃ یا بیت المال کے حوالے کرنے کی جگہ خود ہی خرچ کر ڈالتی ہے، وہ دیدہ و دانستہ حکمِ شریعت سے انحراف کرتی ہے اور یقیناً عنداللہ اس کے لیے جوابدہ ہو گی۔

انتخابِ امیر وقیام بیت المال

اگر کہا جائے کہ ہندوستان میں اسلامی حکومت موجود نہیں' اس لیے مسلمان مجبور ہو گئے اور انفرادی طور پر خرچ کرنے لگے تو شرعاً وعقلاً یہ عذر مسموع نہیں ہوسکتا۔ اگر اسلامی حکومت کے فقدان سے جمعہ ترک نہیں کر دیا گیا' جس کا قیام امام وسلطان کی موجودگی پر موقوف تھا تو زکوٰۃ کا نظام کیوں ترک کر دیا جائے؟ کس نے مسلمانوں کے ہاتھ اس بات سے باندھ دیے ہیں کہ اپنے اسلامی معاملات کے لیے ایک امیر منتخب نہ کریں یا ایک مرکزی بیت المال پر متفق نہ ہو جائیں یا اقلاً ویسی ہی انجمنیں بنالیں' جیسی انجمنیں بے شمار غیر ضروری باتوں کے لیے بلکہ بعض حالتوں میں بدع ومحدثات کے لیے انھوں نے جابجا بنالی ہیں۔

مسلمانوں کے لیے اصلی سوال

اسلام نے اجتماعی زندگی کا ایک پورا نقشہ بنایا تھا۔ جہاں اس کے چند خانے بگڑ گئے' سمجھ لو پورا نقشہ بگڑ گیا۔ چنانچہ اس ایک نظام کے فقدان نے مسلمانوں کی پوری اجتماعی زندگی مختل کر دی ہے۔ لوگ اصلاح کے لیے طرح طرح کے ہنگامے بپا کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں انجمنوں اور قومی چندوں کے ذریعہ وقت کی مشکلوں اور مصیبتوں کا علاج ڈھونڈ نکالیں گے حالانکہ مسلمانوں کے لیے اصلی سوال یہ نہیں ہے کہ کوئی نیا طریقہ ڈھونڈ نکالیں۔ سوال یہ ہے کہ اپنے گم گشتہ طریقہ کا کھوج نکالیں۔

درازئ شب و بیدارئ من ایں ہمہ نیست
زبخت من خبر آرید تا کجا خفت ست؟

ہلاکت آفریں خطرہ

اگر محض دولت مند افراد کے عطیوں اور قومی انجمنوں کے نظام سے قوم کا اقتصادی مسئلہ حل ہوسکتا تو آج یورپ اور امریکہ سے بڑھ کر کون ہے جو ان دونوں باتوں کا انتظام کرسکتا ہے؟ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کوئی قومی فنڈ اور کوئی قومی نظام بھی نچلے طبقوں کی

بیکاری اور متوسط طبقہ کا افلاس روک نہ سکا اور اب اجتماعی مسئلہ کا ہلاکت آفریں خطرہ ان کے سروں پر منڈلا رہا ہے۔

اقتصادی بدحالی کا واحد علاج

اصل یہ ہے کہ افراد کی وقتی فیاضیاں کتنی ہی زیادہ ہوں، قوم کی اجتماعی زندگی کے قیام کے لیے کبھی کفیل نہیں ہوسکتیں۔ اس صورت حال کا علاج صرف وہی ہے جو اسلام نے تیرہ سو برس پہلے تجویز کیا تھا، یعنی قانون سازی کے ذریعہ قوم کی پوری کمائی کا ایک خاص حصہ کمزور افراد کی خبر گیری کے لیے مخصوص کر دینا چاہیے تا کہ:

(۱) تُؤخَذُ مِنْ اَغْنِیَاءِ ھِمْ فَتَرُدَّ فِی فُقَرَاءِ ھِمْ

قوم کے آسودہ حال لوگوں سے وصول کر کے غریب و مسکین لوگوں میں بانٹ دیا جائے۔

(۲) کَیْ لاَ یَکُوْنَ دُوْلَةً م بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ (۵۹:۷)

تا کہ دولت مند لوگوں کی اجارہ داری نہ بن جائے۔

زکوٰۃ اور اس کی نوعیت

زکوٰۃ اور انکم ٹیکس میں فرق

بہر حال یہ بات یاد رہے کہ زکوٰۃ کی نوعیت عام خیرات کی سی نہیں ہے، بلکہ یہ اپنے پورے معنوں میں ایک انکم ٹیکس ہے جو اسلامی حکومت نے ہر کمانے والے فرد پر لگا دیا ہے۔ بشرطیکہ اس کی کمائی اس کی ذاتی ضروریاتِ زندگی سے زیادہ ہو۔ موجودہ زمانے کے انکم ٹیکسوں میں اور اس (زکوٰۃ) میں صرف دو باتوں کا فرق ہے:

ایک یہ کہ اپنی نوعیت میں یہ زیادہ وسیع ہے، یعنی صرف کاروبار کی گھٹتی بڑھتی آمدنی ہی پر عائد نہیں ہوتا، بلکہ اندوختہ پر بھی واجب ہو جاتا ہے۔ اگرچہ اس سال کوئی نئی آمدنی نہ ہوئی ہو۔ نیز اس طرح تمام ملکیتیں بھی اس میں داخل ہیں جو بڑھنے کی استعداد رکھتی ہوں۔ مثلاً مویشی۔

دوسری یہ کہ مقصد کے لحاظ سے یہ ایک خاص مصرف رکھتا ہے، جس کی مختلف صورتیں معین کر دی گئی ہیں۔ اسٹیٹ کو حق نہیں کہ ان مصارف کے علاوہ کسی دوسرے مصرف میں خرچ کر سکے۔

تشابہ بالیہود کا سا معاملہ

قرآن نے یہودیوں کی اس گمراہی کا ذکر کیا ہے کہ انہوں نے احکامِ شرع کی تعمیل سے بچنے کے لیے شرعی حیلے نکال لیے تھے۔ افسوس کہ مسلمانوں میں بھی اس گمراہی نے سر اٹھایا۔ حتیٰ کہ حیلے کا معاملہ بعض کتبِ فقہ کا ایک مستقل باب بن گیا۔ ازانجملہ ایک حیلہ زکوٰۃ کے باب میں بھی مشہور ہے۔ طریقہ اس کا یہ بتلایا جاتا ہے کہ جو شخص زکوٰۃ سے بچنا چاہے وہ کسی آدمی سے بخش دینے اور بخشوا لینے کا فرضی معاملہ کر لے اور قبل اس کے کہ برس پورا ہو، اپنا تمام مال اس کے نام ہبہ کر دے۔ پھر وہ برس ختم ہونے سے پہلے وہی مال اس کے نام ہبہ کر دے گا۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ دونوں پر سے باوجود مالدار ہونے کے زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی۔ مثلاً شوہر نے اپنی بیوی سے رجب کے مہینے میں کہہ دیا "میں نے اپنا مال تجھے ہبہ کر دیا۔" اس نے کہا، قبول۔ اب شوہر پر زکوٰۃ نہیں رہی کیونکہ قبل اس کے کہ سال تمام ہو، وہ صاحب نصاب نہ رہا۔ البتہ بیوی پر پڑ گئی، بشرطیکہ بارہ مہینے گزر جائیں۔ لیکن وہ بارہ مہینے کیوں پورے گزرنے دے گی! وہ جمادی الاولیٰ میں شوہر سے کہہ دے گی "میں نے تمام مال اب تمھیں ہبہ کر دیا۔ اسطرح اس نیک بخت پر سے بھی زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی۔

قصہ کوتاہ گشت ورنہ دردِسر بسیار بود!

فسق و فجور کا انتہائی مرتبہ

لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ احکامِ شرع کی تعمیل میں اس طرح کی حیلہ بازیاں نکالنا فسق و ضلالت کا انتہائی مرتبہ ہے اور جو شخص اس طرح کی مکاریاں کر کے احکامِ الٰہی سے بچنا چاہتا ہے، اس کی معصیت ان لوگوں سے بدرجہا زیادہ ہے جو سیدھی سادھی طرح ترکِ اعمال کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یہ بات کہ ایک شخص سے جرم ہو گیا، محض جرم ہے، مگر یہ بات کہ ایک

شخص جرم کو بے جرمی و پاک عملی بنا کر کرتا ہے' صرف جرم ہی نہیں ہے' بلکہ اس سے بھی بہت زیادہ ہے اور صرف اس کی عملی زندگی ہی کو نہیں بلکہ ایمان وفکر کو بھی تاراج کر دینے والا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جونہی اس طرح کے حیلوں کا چرچا پھیلا تو تمام سلفِ امت نے اس پر انکارِ عظیم کیا اور ائمہ فقہاء میں سے کوئی بھی نہیں جس نے انہیں جائز رکھا ہو۔

زکوٰۃ اور خیرات میں فرق

محتاج رشتہ داروں کی اعانت کا مسئلہ

ایک اور غلط فہمی اس باب میں یہ پھیل گئی ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اپنے مفلس رشتہ داروں کی خبر گیری کا یہی طریقہ ہے کہ زکوٰۃ کی رقوم سے ان کی مدد کی جائے۔

بلاشبہ ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ غیروں سے پہلے اپنے محتاج رشتہ داروں کی خبر لے اور قرآن نے صدقات وخیرات کے معاملہ میں جو اصلاحات کی ہیں' من جملہ ان کے ایک بڑی اصلاح یہ ہے کہ رشتہ داروں کی اعانت کو بھی خیرات قرار دے دیا ہے۔ بلکہ خیرات کا سب سے پہلا اور بہتر مصرف' یہی رشتہ داروں کی امداد واعانت شمار ہوا:

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ' قُلْ مَا اَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ. (۲:۲۱۵)

''اے پیغمبرؐ! تم سے لوگ دریافت کرتے ہیں کہ خیرات کے لیے خرچ کریں تو کیا خرچ کریں؟ تو ان سے کہہ دو جو کچھ بھی تم اپنے مال میں سے نکالو' اور جب نکالو' تو اس کے مستحق تمہارے ماں باپ ہیں اور عزیز واقارب ہیں۔''

صلہ رحمی کا حق

لیکن زکوٰۃ جو خیرات کی ایک خاص قسم ہے' اس لیے واجب نہیں کی گئی ہے کہ لوگ خیرات کی دوسری قسموں سے ہاتھ روک لیں اور اپنے محتاج رشتہ داروں کی مدد کا بوجھ بھی اسی پر ڈال دیں۔ زکوٰۃ وہی دے گا جو صاحبِ استطاعت ہو اور اگر ایک شخص خوشحال ہے اور اس

کے رشتہ دار تنگی و محتاجی میں مبتلا ہو گئے ہیں، تو بہ حیثیت مسلمان ہونے کے اس کا فرض ہے کہ ان کی خبر گیری کرے۔ اگر ان کی اعانت و خبر گیری نہیں کرے گا تو یقیناً عنداللہ جواب دہ ہوگا۔ کیونکہ صلہ رحمی کا حق خدا کا ٹھہرایا ہوا حق ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَ لُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ. (۴:۱)

پس دیکھو! اللہ سے ڈرو جس کے نام پر باہمد گر (مہر و الفت کا) سوال کرتے ہو۔ نیز قرابت داری کے معاملہ میں بے پرواہ نہ ہو جاؤ۔

بلاشبہ اس کی یہ خبر گیری اس کے لیے خیرات کا بہترین عمل ہوگی، لیکن خبر گیری ہر حال میں اس کا اسلامی فرض ہے۔ یہ طریقہ کسی حال میں بھی شرعی نہیں ہو سکتا کہ باوجود خوش حال ہونے کے اپنے رشتہ داروں کو فقر و فاقہ میں چھوڑ دیا جائے اور پھر اگر کچھ دیا بھی جائے تو اسے زکوٰۃ کی مد میں شمار کر لیا جائے۔

مسلمانوں کی پوری زندگی غیر اسلامی ہو گئی

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے کوئی خاص اسلامی عمل ہی ترک نہیں کر دیا ہے، بلکہ ان کی پوری زندگی غیر اسلامی ہو گئی ہے۔ ان کی فکری حالت غیر اسلامی ہے، ان کی عملی رفتار غیر اسلامی ہے، ان کا دینی زاویۂ نگاہ غیر اسلامی ہو گیا ہے۔ وہ اگر اسلامی احکام پر عمل بھی کرنا چاہتے ہیں تو غیر اسلامی طریقہ سے اور یہ دینی تنزل کی انتہا ہے۔

فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا یَكَادُوْنَ یَفْقَهُوْنَ حَدِیْثًا. (۴:۷۸)

''ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ سمجھ بوجھ کے قریب بھی نہیں پھٹکتے؟''

انفاق فی سبیل اللہ اور زکوٰۃ

اسلامی زندگی کا لُبِّ لُباب

ایک عام اور سب سے مہلک غلط فہمی یہ پھیل گئی ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں، زکوٰۃ دے دینے کے بعد انفاق و خیرات کے اور تمام اسلامی فرائض ختم ہو جاتے ہیں۔ جہاں ایک شخص نے

رمضان میں اٹھنیوں اور روپیوں کی پڑیاں باندھ کر تقسیم کے لیے رکھ دیں، سال بھر کے لیے اسے ہر طرح کے انسانی و اسلامی تقاضوں سے چھٹی مل گئی!

حالانکہ ایسا سمجھنا، یک قلم اسلام کو بھلا دینا ہے۔ اسلام نے مسلمانوں کو جس طرح کی زندگی بسر کرنے کی تلقین کی ہے وہ محض اپنی اور اپنے بیوی بچوں کے پیٹ ہی کی زندگی نہیں ہے، بلکہ منزلی، خاندانی، معاشرتی، جماعتی اور انسانی فرائض کی ادائیگی کی ایک پوری آزمائش ہے اور جب تک ایک انسان اس آزمائش میں پورا نہیں اترتا، اسلامی زندگی کی لذت اس پر حرام ہے۔

اس پر اس کے نفس کا حق ہے، اس کے والدین کا حق ہے، رشتہ داروں کا حق ہے، بیوی بچوں کا حق ہے، ہمسایہ کا حق ہے اور پھر تمام نوع انسانی کا حق ہے۔ اس کا فرض ہے کہ اپنی استطاعت اور مقدور کے مطابق یہ تمام فرائض ادا کرے اور انھیں فرائض کی ادائیگی پر اس کی زندگی کی ساری دنیوی اور اخروی سعادتیں موقوف ہیں:

وَاعْبُدُوْا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ بِذِی الْقُرْبٰى وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنَ وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ. (۳۶:۴)

''اور (دیکھو!) اللہ کی بندگی کرو اور کسی چیز کو اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ اور چاہیے کہ ماں باپ کے ساتھ، قرابت داروں کے ساتھ، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ، پڑوسیوں کے ساتھ خواہ قرابت والے پڑوسی ہوں، خواہ اجنبی ہوں، نیز پاس کے بیٹھنے اٹھنے والوں کے ساتھ اور ان لوگوں کے ساتھ جو مسافر ہوں یا (لونڈی غلام ہونے کی وجہ سے) تمھارے قبضہ میں ہوں، ان کے ساتھ احسان و سلوک کے ساتھ پیش آؤ۔''

یہ تمام فرائض اس وقت تک ادا نہیں کیے جا سکتے، جب تک کہ انفاق و خیرات کے لیے

انسان کا ہاتھ کشادہ نہ ہو جائے۔

منافق کی پہچان

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اعمال میں سے کسی عمل پر اتنا زور نہیں دیا جس قدر نماز اور انفاق پر اور منافقوں کی سب سے بڑی پہچان اسی سورہ میں یہ بتلائی کہ ان کی مٹھیاں بند رہتی ہیں، انفاق کے لیے کھلتی نہیں۔

وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ (۹:۶۷)

''(راہ حق میں خرچ کرنے سے) اپنی مٹھیاں بند رکھتے ہیں''

اور اگر کچھ دیتے بھی ہیں تو مجبور ہو کر:

وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ. (۹:۵۴)

''وہ (راہ حق میں) مال خرچ نہیں کرتے، مگر اس حال میں کہ خرچ کرنے کی ناگواری ان کے دلوں میں بسی ہوئی ہے۔''

مومن کی پہچان

اور مومنوں کی نسبت فرمایا ہے:

يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً (۲:۲۷۴)

''وہ رات کی تاریکی میں اور دن کی روشنی میں، پوشیدہ طور پر اور کھلے طور پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔''

مومن وہ ہیں، جن کا ہاتھ ہمیشہ کھلا رہتا ہے، رات دن پوشیدہ وظاہر ہر حال میں سرگرم انفاق رہتے ہیں۔

شیطانی خیال

نیز فرمایا: یہ شیطانی خیال ہے کہ خرچ کرنے سے ہم محتاج ہو جائیں گے اور اس راہ میں بخل ''فحش'' ہے، یعنی سخت قسم کی برائی۔ جبکہ اللہ انفاق کا حکم دے کر تمھیں مغفرت اور

خوش حالی کی راہوں پر لگاتا ہے۔

اَلشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُم بِالْفَحْشَآءِ وَاللّٰهُ يَعِدُكُم مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلاً. (۲:۲۶۸)

''شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور برائیوں کی ترغیب دیتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ تمہیں ایسی راہ کی طرف دعوت دیتا ہے، جس میں اس کی مغفرت اور فضل و کرم کا وعدہ ہے (پس شیطانی وسوسوں پر کاربند نہ ہو خدا کی بتلائی ہوئی راہ اختیار کرو)''

تعلیم قرآن سے اعراض

پس یہ سمجھنا کہ جہاں سال میں ایک مرتبہ زکوٰۃ کا ٹیکس دے دیا' انفاق فی سبیل اللہ کے تمام مطالبات پورے ہو گئے' صریح قرآن کی تعلیم سے اعراض کرنا ہے۔ زکوٰۃ تو ایک خاص قسم کا ٹیکس ہے' وہ ایک خاص مقصد کے لیے لگایا گیا ہے جو سال میں ایک مرتبہ دینا پڑتا ہے' لیکن ہماری زندگی کا ہر چوبیں گھنٹہ ہم سے انفاق کا مطالبہ کرتا ہے اور اگر ہم اسلامی زندگی کا توشہ لے کر دنیا سے جانا چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ حسبِ استطاعت اس کے تمام مطالبات پورے کریں۔

قرآن اور سوشلزم

مفاسد سرمایہ داری و تقسیم دولت

دنیا میں دولت اور وسائل دولت کا احتکار اس حد تک پہنچ گیا تھا اور ضروری تھا کہ اس کا رَدِّ فعل پیدا ہو۔ چنانچہ اٹھارہویں صدی میں موجودہ سوشلزم کی بنیادیں پڑیں اور اب اس نے کمیونیزم کی انتہائی صورت اختیار کر لی ہے۔ پندرہ برس سے روس میں اس کا اوّلین تجربہ بھی ہو رہا ہے۔ قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر قرآن کی تعلیم سرمایہ داری کے مفاسد مٹانا چاہتی ہے اور دولت کی تقسیم کی حامی ہے تو کیا ایسا نہیں سمجھا جاسکتا ہے کہ اس کا

رخ بھی اسی طرف ہے جس طرف سوشلزم جا رہا ہے؟ بلاشبہ ایسا سمجھا جا سکتا ہے لیکن ایک خاص درجہ تک، مگر اس کی حقیقت سمجھ لینی چاہیے۔

تسلیم حق انفرادی ملکیت

اس کی دو صورتیں ہیں، اور ضروری ہے کہ دونوں کا فرق ملحوظ رکھا جائے: ایک صورت یہ ہے کہ دولت اور وسائلِ دولت کا احتکار روک دیا جائے اور ہر کمانے والے فرد کو قانون سازی کے ذریعہ مجبور کیا جائے کہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ کمزور افراد کے لیے نکالے، نیز اسٹیٹ کو اس بات کا ذمّہ دار ٹھہرایا جائے کہ کوئی فرد ضروریات زندگی سے محروم نہ رہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ اصل بھی تسلیم کی جائے کہ معیشت کے لحاظ سے تمام افراد و طبقات کی حالت یکساں نہیں ہو سکتی۔ اور یہ عدم یکسانیت اکثر حالتوں میں قدرتی ہے۔ کیونکہ سب کی جسمانی و دماغی استعداد یکساں نہیں اور جب استعداد یکساں نہیں تو ناگزیر ہے کہ جد و جہدِ معیشت کے ثمرات بھی یکساں نہ ہوں۔ بالفاظ دیگر انفرادی ملکیت کا حق تسلیم کر لیا جائے کہ جو جس قدر حاصل کر سکتا ہے، وہ اُسی کا ہے۔

انفرادی قبضہ باقی نہ رہے

دوسری صورت یہ ہے کہ صرف دولت کا احتکار ہی نہ روکا جائے بلکہ دولت کی انفرادی ملکیت بھی ختم کر دی جائے اور ایسا نظام قائم کیا جائے جس میں اجباری قوانین کے ذریعہ اقتصادی اور معیشتی مساوات کی حالت پیدا کر دی جائے۔ مثلاً وسائلِ دولت تمام تر قومی ملکیّت ہو جائیں۔ انفرادی قبضہ باقی نہ رہے اور جسمانی و دماغی استعداد کے اختلاف سے معیشت کا مختلف ہونا بنائے حق تسلیم نہ کیا جائے۔

قرآن کا طریق کار

قرآن نے جو صورت اختیار کی ہے وہ پہلی ہے اور سوشلزم جس بات کے لیے ساعی ہے، وہ دوسری ہے۔ دونوں کا مقصد یہ ہے کہ انسانی اکثریت کی شقاوت دور کی جائے۔

دونوں نے علاج بھی ایک ہی تجویز کیا ہے‘ یعنی دولت کا اکتناز روکا جائے‘ لیکن دونوں کا طریق کار ایک نہیں۔ ایک اختلاف معیشت سے تعرض نہیں کرتا اور اسے قائم رکھ کر راہ نکالتا ہے جبکہ دوسرا اسے مٹا دینا چاہتا ہے۔

اسلام اور سوشلزم کا نظریہ

اسلام اور سوشلزم کا یہ اختلاف اگر چہ محض درجہ (ڈگری Digree) کا اختلاف معلوم ہوتا ہے‘ لیکن اس کی تہہ میں مبداء کا اختلاف بھی موجود ہے۔ سوشلزم کا نظریہ یہ ہے کہ مدارج معیشت کا اختلاف کوئی قدرتی اختلاف نہیں ہے لیکن قرآن میں اس طرح کے اشارات جا بجا پائے جاتے ہیں کہ یہ اختلاف قدرتی ہے اور ضروری تھا کہ ظہور میں آئے۔ وہ کہتا ہے‘ اگر یہاں سب کی حالت یکساں ہو جاتی‘ تو تراحم وتنافس کی حالت پیدا نہ ہوتی اور اگر یہ حالت پیدا نہ ہوتی تو انسان کی قدرتی قوتوں کے ابھرنے اور ترقی پانے کے لیے کوئی شے محرّک بھی نہ ہوتی اور اجتماعی زندگی کی وہ تمام سرگرمیاں ظہور میں نہ آتیں‘ جن سے یہ تمام کارخانہ چل رہا ہے:

وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِىْ مَآ اٰتٰكُمْ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. (۶:۱۶۵)

”اور وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں ایک دوسرے کا جانشین بنایا‘ اور بعض کو بعض پر مرتبے دیئے‘ تا کہ جو کچھ تمہیں دیا ہے‘ اسی میں تمہیں آزمائے۔ بلاشبہ تمہارا پروردگار (بدعملیوں کی) فوراً سزا دینے والا ہے۔ اور بلاشبہ وہ بڑا ہی بخش دینے والا‘ رحمت والا ہے۔

انسانی زندگی کے نشیب وفراز

اس آیت میں تین باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے: اولاً خدا نے انسانی زندگی کا کارخانہ

کچھ اس طرح چلایا ہے کہ یہاں ہر گوشہ میں ایک طرح کی جانشینی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ یعنی ایک فرد اور ایک گروہ جاتا ہے' دوسرا فرد اور گروہ اس کی جگہ لیتا اور اس کے ثمرات ونتائجِ سعی کا وارث ہوتا ہے۔ ثانیاً درجے کے لحاظ سے سب یکساں نہ ہوئے۔ بعض اوپر ہوئے بعض ان سے نیچے۔ ثالثاً مدارج معیشت کی یہ بلندی وپستی اس لیے ہوئی تا کہ انسان کے عمل وتصرف کے لیے آزمائش کی حالت پیدا ہو جائے اور ہر فرد اور ہر گروہ کو موقع دیا جائے کہ اپنی سعی و کاوش سے جو درجہ حاصل کر سکتا ہے' حاصل کر لے۔ آخر میں فرمایا ''خدا کا قانونِ جزا سست رفتار نہیں یعنی سعی وطلب کی اسی امتحان گاہ سے جزائے عمل کا معاملہ وابستہ ہے۔ جیسے جن کے اعمال ہوں گے' ویسے ہی نتائج اس کے حصہ میں آ جائیں گے۔ اسی طرح جابجا قرآن میں پاؤ گے۔

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِيْ الرِّزْقِ. (۱۶: ۷۱)

''خدا نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں برتری دی ہے۔''

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِيْ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ. (۴۳: ۳۲)

دنیوی زندگی کی معیشت ہم نے لوگوں میں تقسیم کر دی اور اس کا کارخانہ ایسا بنا دیا کہ سب ایک ہی درجہ میں نہیں ہیں۔ کوئی کسی درجہ میں ہے اور کوئی کسی درجہ میں۔''

قرآنی تعلیم کا نچوڑ

بہر حال قرآن نے اجتماعی مسئلہ کا جو حل تجویز کیا ہے، وہ یہ ہے کہ مدارجِ معیشت کی مساوات قائم کرنی نہیں چاہتا، لیکن حقِ معیشت کی مساوات قائم کرتا ہے۔ یعنی وہ کہتا ہے' یہ بات ضروری نہیں کہ سب کو ایک ہی طرح پر سامان معیشت ملے' لیکن یہ ضروری ہے کہ ملے سب کو اور سعی وترقی کی راہ یکساں طور پر سب کے سامنے کھل جائے۔ اس نے ہر طرح کے نسلی' خاندانی' جغرافیائی اور طبقاتی امتیاز مٹا دیئے۔ اس نے زندگی کے ہر میدان میں انسانی

مساوات کا اعلان کر دیا۔ اس نے وہ تمام رکاوٹیں دور کر دیں جو سوسائٹی کے اونچے طبقوں نے کمزور افراد کی خوشحالی و ترقی کی راہ میں پیدا کر دی تھیں۔ اس نے قانون سازی کے ذریعہ دولت کے اکتناز کی جگہ دولت کی تقسیم پر زور دیا۔ اس نے اس بات سے قطعاً انکار کر دیا کہ دولت مندی بجائے خود کوئی حق ہے۔ اس نے بے اعتدالانہ سرمایہ داری کی تمام راہیں روک دیں' اس نے سود کی ہر شکل حرام کر دی' اس نے جوئے کو کسی حال میں جائز نہ رکھا۔ پھر ان تمام باتوں سے بڑھ کر یہ کہ انسانی زندگی کے اعمالِ حق میں انفاق فی سبیل اللہ کو سب سے زیادہ نمایاں جگہ دی اور ہر کمانے والے فرد کو سالانہ ٹیکس کے ذریعہ مجبور کر دیا کہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ دوسروں کے لیے بھی نکالے۔ پس یہ ایک نقشہ ہے جو اسلام نے اجتماعی نظام کا بتایا ہے۔

سوشلزم کا تقاضا

لیکن سوشلزم صرف اتنے ہی پر قانع نہیں رہنا چاہتا۔ وہ آگے بھی بڑھنا چاہتا ہے' وہ انفرادی ملکیّت کی جگہ قومی ملکیّت کا نظام قائم کر دیتا ہے اور مدارج معیشت کا اونچ نیچ معدوم کر دیتا ہے۔ وہ یہ اصل تسلیم نہیں کرتا کہ احوالِ معیشت کا اختلاف قدرتی ہے اور اجتماعی زندگی کی سرگرمی و ترقی کے لیے محور و محرک وہی ہے۔ وہ کہتا ہے' اس وقت تک حالت ایسی ہی رہی ہے' لیکن اگر سوسائٹی کا نظام مساواتِ معیشت پر قائم کیا گیا تو دوسری طرح کی ذہنی اور معنوی محرکات پیدا ہو جائیں گی اور کارخانۂ معیشت کی سرگرمی اسی طرح جاری رہے گی جس طرح اِس وقت تک جاری رہی ہے۔

مشاہدات مافات کا تجربہ

دنیا کا اس وقت تک کا تجربہ اس کے خلاف ہے اور روس کا نیا تجربہ بھی اس وقت تک اپنے نظریوں کو عملیّت کا جامہ نہیں پہنا سکا ہے۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ سوشلزم کو اس مطالبہ کا حق ہے کہ مزید تجربہ کا موقع دیا جائے۔

ولتعلمن نباہٗ بعد حین

خاتمہ

فی زمانہ ادائیگی زکوٰۃ

ہر اسلامی حکم میں انفاق کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ انفاق کے معنی یہ ہیں کہ اسلام تمہاری جیبوں سے کچھ چاہتا ہے۔ حج، زکوٰۃ اور دوسرے احکام میں بھی یہی بات پاؤ گے۔ تفصیل کا موقع نہیں ہے۔

عید کے موقع پر تم لوگوں میں سے بہت سے لوگوں نے فطرہ دے دیا ہوگا اور بہت سے لوگ فطرہ دیں گے، لیکن میں کہوں گا کہ تم میں فطرہ، صدقہ اور زکوٰۃ تقسیم کرنے کا طریقہ اچھا نہیں ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس موقع پر ہندوستان کے ہر گوشے سے بھیک مانگنے والے اور گداگر اپنی اپنی جھولیاں لیے کلکتہ پہنچ جاتے ہیں اور سال بھر کی روٹیاں جمع کر کے واپس گھروں کو چل دیتے ہیں۔

اسلام اور انگریزی حکومت کا ٹیکس

تم جانتے ہو کہ زکوٰۃ کیا ہے؟ ایک انکم ٹیکس ہے جو اسلام نے ہر اس آدمی پر عائد کیا ہے جس نے سال کے بارہ مہینوں میں کھا پی کر ایک خاصی رقم جمع کر لی ہو۔ اسلام کی زکوٰۃ یعنی ٹیکس یہ ہے کہ جس آدمی نے سال بھر میں چالیس روپے جمع کر لیے ہوں، وہ ایک روپیہ ٹیکس داخل کرے۔

انگریزی حکومت بھی انکم ٹیکس لیتی ہے لیکن اس ٹیکس اور اسلامی ٹیکس میں فرق یہ ہے کہ حکومت ٹیکس لے کر اپنے کاموں میں خرچ کرتی ہے اور اسلام ٹیکس کی رقمیں غربا، مساکین اور محتاجوں میں تقسیم کرا دیتا ہے۔ اسلام نے ٹیکس کی رقموں کو خرچ کرنے کے لیے آٹھ حلقے بنائے ہیں۔

......قرآن حکیم میں زکوٰۃ کا صاف اور صریح حکم موجود ہے اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ ہر صاحبِ نصاب پر فرض کی ہے۔ قرآن حکیم میں نماز اور زکوٰۃ کا ایک ساتھ بار بار ذکر آیا

ہے۔لیکن ہندوستان کے مسلمان اس اہم فرض کی ادائیگی کی طرف متوجہ نہیں۔تم میں سے بعض لوگ زکوٰۃ نہیں دیتے ہیں لیکن زکوٰۃ دینے والے بھی نہ دینے والوں کے برابر ہیں' کیونکہ اسلامی احکام کے مطابق زکوٰۃ نہیں دیتے۔

تعیین زکوٰۃ میں آسانیاں

تم کو معلوم ہے کہ انکم ٹیکس وصول کرنے کے لیے حکومت کی طرف سے کلکٹر مقرر ہوتے ہیں جو دفاتر اور کھاتوں کی جانچ پڑتال کر کے ٹیکس کی رقمیں متعین کرتے ہیں۔لیکن اسلامی ٹیکس (زکوٰۃ) نکالنے میں اس قسم کی کوئی صورت پیش نہیں آتی۔اسلام نے اپنے ٹیکس کی ادائیگی میں تمہیں کتنی آسانیاں دے رکھی ہیں۔تم خود اپنے کاروبار اور اپنی زندگی کا جائزہ لو' اپنی آمدنی کا تعین کرو' اور اپنے ہی ہاتھوں سے زکوٰۃ نکالو۔کیا اس سے بھی زیادہ آسانیاں ممکن ہیں؟

زکوٰۃ دینا نہ دینا برابر

......یقین مانو تم میں سے جو لوگ زکوٰۃ نکالتے ہیں' وہ اسلامی احکام کے مطابق نہیں نکالتے اور وہ ان لوگوں کے برابر ہیں جو زکوٰۃ نہیں نکالتے۔تمہاری زکوٰۃ کی رقمیں برباد جاتی ہیں۔اسلام نے زکوٰۃ کی رقموں کو اجتماعی طور سے خرچ کرنے کا حکم دیا ہے اور تم انفرادی ہاتھوں سے خرچ کر رہے ہو۔

اسلام کا حکم، صحابہؓ کا عمل اور تاریخ کے اوراق بتاتے ہیں کہ زکوٰۃ کی رقمیں اجتماعی طور سے خرچ ہونی چاہییں۔انفرادی طور سے خرچ کرنے کی بدعت خلفائے راشدین کے بعد سے پڑی۔

صحابہؓ کے طرزِ عمل کا ایک واقعہ

تم کو معلوم ہے کہ خلفائے بنو امیہ کے ابتدائی دور میں صحابہ کرامؓ میں یہ سوال پیش ہوا کہ موجودہ خلیفہ بہت ہی فاسق و فاجر ہے' زکوٰۃ کی رقمیں کیونکر بیت المال میں بھیجی جائیں؟ تمام

صحابہؓ نے اس امر پر اتفاق کرلیا کہ خلیفہ کے فسق و فجور سے زکوٰۃ کی ادائیگی میں کوئی خلل نہیں آتا۔ زکوٰۃ کی رقمیں اسی خلیفہ کو بھیجی جائیں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ عباسی دورِ حکومت میں جب تاتاری کافروں اور مشرکوں نے بغداد پر قبضہ کرلیا اور خلافت کا خاتمہ کر ڈالا' اس وقت کے مسلمان اعیان و اکابر نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر موجودہ حالات کے ماتحت حکومت نہیں بدلی جا سکتی تو حکومت سے درخواست کی جائے کہ ہماری زکوٰۃ کی رقمیں وصول اور تقسیم کرنے کے لیے قاضی اور عمال مقرر کردے۔

مخالفین کا عذر

بعض لوگ یہ عذر لا سکتے ہیں کہ چونکہ ہندوستان میں اسلامی حکومت نہیں ہے' اس لیے زکوٰۃ کی اجتماعی تقسیم کا انتظام نہیں ہوسکتا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ عذر بالکل لنگ اور بے بنیاد ہے۔ تمہارا وہ کون سا کام ہے جو رکا رہتا ہے؟ اس حالت میں بھی تم اگر اجتماعی تقسیم کا انتظام کرسکتے ہو تو یہ عذر کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ تم فضول' لغو اور غیر اسلامی کاموں کے لیے آئے دن انجمنیں بناتے رہتے ہو' کیا ایک اسلامی کام کے لیے ایسی انجمنیں نہیں بنا سکتے جو تمہاری زکوٰتوں کو اسلامی طریقہ پر خرچ کرسکیں۔

اجتماعی زندگی کا نقشہ بدل گیا

دراصل بات یہ ہے کہ یہاں اسلام کا نقشہ ہی بدل گیا ہے۔ اسلام اجتماعی زندگی کا ایک مکمل نقشہ پیش کرتا ہے۔ جس طرح تم مکان بناتے ہو' اس میں مختلف خانے ہوتے ہیں۔ کوئی خانہ سونے کا ہوتا ہے' کوئی باورچی خانہ ہوتا ہے، کوئی سامان رکھنے کا خانہ ہوتا ہے۔ ایک انسان اپنے تمام کاموں کے لیے اگر ایک ہی خانہ متعین کرے اور دوسری ضرورتوں کے لیے اس کا کوئی خانہ نہ ہو' تو بتاؤ' وہ گھر کا صحیح لطف اٹھا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں' اسی طرح جب تک تم اسلام کے تمام خانوں کو سامنے نہیں رکھو گے' اس کے فیوض و برکات سے لطف نہیں اٹھا سکتے۔

جامع و اکمل اصول اسلام

دراصل مسلمانوں نے اسلامی احکام کو چھوڑ دیا ہے' البتہ ان میں نمائشی اور بے روح کی سرگرمیاں باقی رہ گئی ہیں۔ایک زکوٰۃ ہی کے حکم کو دیکھو! اگر مسلمان اس پر عامل ہوتے تو آج ان کی یہ حالت نہ ہوتی۔زکوٰۃ اسلام کا اتنا جامع اور اکمل اصول ہے کہ دنیا کا کوئی قانون اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔اسلام نے زکوٰۃ کا حکم اس لیے دیا ہے کہ اس سے غربا' مساکین اور محتاجوں کی امداد ہوتی رہے۔

مسلم و کافر کی پہچان

اسلام نہیں چاہتا کہ ساری دولت چند لوگوں کے ہاتھوں میں جمع رہے۔ اسلام نے مسلمانوں کی یہ پہچان بتائی ہے کہ ان کی مٹھیاں کھلی رہتی ہیں یعنی وہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے والے ہوتے ہیں۔جبکہ کافروں کی پہچان یہ بتائی ہے کہ ان کی مٹھیاں بند ہوتی ہیں۔ یعنی نیک کاموں پر وہ خرچ نہیں کر سکتے۔اسلام نہیں چاہتا کہ دولت کسی کی اجارہ داری میں آ جائے یا کوئی شخص اپنے پاس ڈھیر لگا لے۔اسلام ڈھیر کا سخت مخالف ہے۔اسلام چاہتا ہے کہ دولت تقسیم ہوتی رہے۔اس کا یہ اصول زکوٰۃ اور وراثت میں بالکل مساوی بنیاد پر قائم ہے۔

اجتماعی طور پر خرچ کرنے کے فوائد

تم جانتے ہو کہ اجتماعی طور پر خرچ کرنے میں اسلامی احکام کی بجا آوری کے علاوہ کیا فوائد ہیں؟ کاش! میں اس کے فوائد سمجھانے کے لیے اپنا دل چیر کر تمہارے سامنے رکھ دوں اور تم اس کی رگوں کو پڑھ سکو۔ میں بالکل یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ اگر مسلمان اسلام کے اصولوں کی پابندی نہ کریں' اور صرف زکوٰۃ ہی کے اصول پر پابند رہیں' جب بھی ان کی حالت بہت جلد بدل سکتی ہے۔ اگر تم نے زکوٰۃ کی رقموں کو اجتماعی طور سے خرچ کرنے کا فیصلہ کر لیا' تو یقین جانو کہ چوبیس گھنٹہ کے اندر تمہاری حالت کیا سے کیا ہو سکتی ہے۔

خلاف ورزیٔ اسلام

میں یہ نہیں کہتا کہ تم جن فقیروں' جن ملاؤں' جن پیروں اور جن لوگوں کو دیتے ہو' نہ

دو۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ اجتماعی ہاتھوں سے دو۔ ان ہی لوگوں کو دو، جنھیں تم دیتے ہو، لیکن خدارا انفرادی ہاتھوں سے نہ دو، اجتماعی ہاتھوں سے دو۔ اگر تم ان ہی لوگوں کو اجتماعی ہاتھوں سے دے سکتے ہو تو تمھیں کیوں ضد ہو گئی ہے کہ انفرادی ہاتھوں سے دے کر اسلامی احکام کے خلاف کام کرتے ہو؟

مولانا کا مشورہ

میں کم سے کم کلکتہ کے مسلمانوں کو مشورہ دوں گا کہ وہ کوئی ایسی جماعت بنائیں جو ان کی زکوٰتوں کا صحیح مصرف کر سکے۔ اور اس میں ہر طبقہ اور ہر جماعت کے نمائندے شریک ہوں یا ہر طبقہ میں اس کی جماعت بنائی جائے جو اس طبقہ کی زکوٰۃ کی رقمیں اسلام کی بنائی ہوئی حدود کے اندر خرچ کر سکے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تمھاری رقمیں ان لوگوں پر خرچ کی جائیں، جنہیں تم دینا چاہتے ہو، تو یہ کر سکتے ہو کہ اپنی جمعیت کو ان اشخاص کے ناموں کی اطلاع کر دو۔

سبق آموزی کی توقع

بہر حال کلکتہ کے مسلمانوں کو میرا مشورہ ہے کہ زکوٰۃ کی رقمیں اجتماعی طور سے خرچ کرنے کے لیے کوئی ایک نمائندہ جماعت یا متعدد نمائندہ جماعتیں بنائیں اور کلکتہ میں اس کی پہلی مثال قائم کریں۔ انشاء اللہ العزیز یہاں کی دیکھا دیکھی اور شہروں میں بھی اسی قسم کی جماعتیں بن جائیں گی۔

نماز و زکوٰۃ یعنی قلبی اور مالی عبادت کی سرگرمی ایک ایسی حالت ہے جس سے جماعت کی معنوی استعداد نشو و نما پاتی ہے اور قوی ہوتی ہے۔ جس جماعت میں یہ سرگرمی موجود ہو وہ نہ تو دین سے برگشتہ ہو سکتی ہے نہ اس کی اجتماعی قوت میں کمزوری آ سکتی ہے۔

وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغُ

حواشی

ا سب سے پہلی مرتبہ ۹ مئی ۱۹۱۳ء کو یہ تحریر شائع ہوئی۔

۲ آج کل عربی میں یورپ کی لیبر پارٹی کے لیے ''حزب العمال'' کا لفظ رائج ہے اور مزدوروں کے لیے ''عمال'' ہی کا لفظ زیادہ تر لکھا جاتا ہے۔

۳ دولت کی مرکزیّت یعنی دولت کا کسی ایک ہی جماعت اور سوسائٹی کے طبقے میں جمع ہو جانا اور دیگر حصص و طبقات کا بالکل محروم رہنا' یہ حالت تمدن اور سوسائٹی کے لیے سخت ضرر رساں ہے...... رومتہ الکبریٰ کے انقراض و تباہی کے اسبابِ اولیٰ میں سے ایک سبب یہ بھی تھا۔ اسلام کا قانونِ توریث اور تقسیم ورثہ اسی مصلحتِ حکیمانہ پر مبنی ہے۔

۴ فقہا مفسرین کا گروہ اسی طرف گیا ہے اور بعضوں نے تو اسے اس درجہ عام کر دیا کہ مسجد، کنواں، پل اور تمام اس طرح کی تعمیرات جزئیہ بھی اس میں داخل کر دیں۔

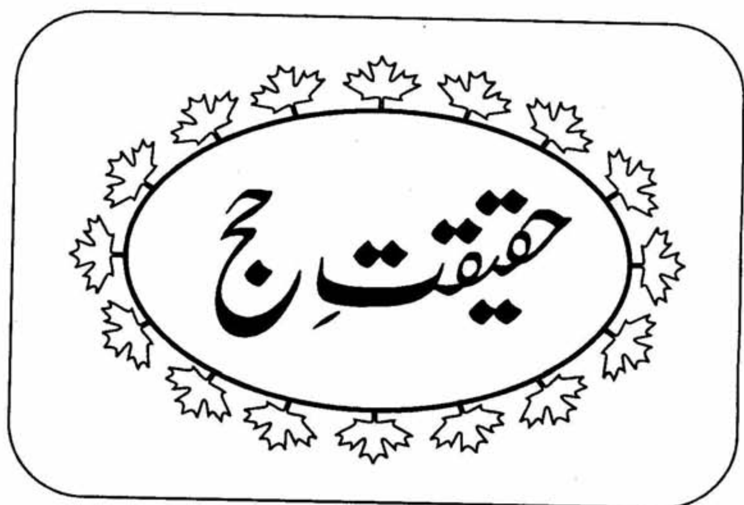
وقیل ان اللفظ عام فلا یجوز قصره علی نوع خاص و یدخل فیه جمیع وجوه الخیر من تکفین الموتٰی و بناء الجسور والحصون و عمارة المساجد وغیر ذالک (نیل الاوطار) کہا گیا ہے کہ لفظ عام ہے اور اسے کسی خاص نوع میں محدود کرنا جائز نہیں۔ اس میں مُردوں کی تکفین سے لے کر مسجدوں' فصیلوں اور قلعوں کے بنانے تک نیکی کی تمام چیزیں داخل ہیں۔

فقہائے حنفیہ میں صاحب فتاویٰ ظہریہ لکھتے ہیں' **المراد طلبة العلم**. اور صاحب بدائع کے نزدیک وہ تمام کام جو نیکی و خیرات کے لیے ہوں' اس میں داخل ہیں۔

۵ قرآن نے زکوٰۃ و صدقات کے باب میں جو کچھ کہا ہے' اس کے معارف و دقائق بے شمار ہیں اور بدقسمتی سے مفسرین دوسرے گوشوں میں نکل گئے۔ یہاں تفصیل ممکن نہیں' اتنی باتیں بھی بلا قصد قلم سے نکل گئیں اور پھر طبیعت نے گوارا نہیں کیا کہ قلم زد کر دی جائیں۔ تفصیل کے لیے ''البیان'' کا انتظار کرنا چاہیے۔ سورۂ توبہ کی آیت **والذین**

یکنزون الذھب والفضۃ کی تفسیر تمام متداول تفاسیر میں پڑھو "ولا ینفقونھا" کی توجیہ میں کس قدر مشکلیں پیدا کر دی گئی ہیں اور پھر کیسے دور دراز حل نکالے ہیں؟ حالانکہ اگر اکتناز کے زور پر غور کیا ہوتا اور اس بارے میں قرآن وسنت کی روح پیش نظر ہوتی تو معاملہ بالکل واضح تھا۔ بہر حال یہ محل اطناب نہیں۔

٦ قرآن نے زکوٰۃ وصدقات کے باب میں جو کچھ کہا ہے' اس کے مصارف ووقائع بے شمار ہیں اور بدقسمتی سے مفسرین دوسرے گوشوں میں نکل گئے۔ یہاں تفصیل ممکن نہیں' اتنی باتیں بھی بلاقصد قلم سے نکل گئیں اور پھر طبیعت نے گوارا نہیں کیا کہ قلم زد کر دی جائیں تفصیل کے لیے "البیان" کا انتظار کرنا چاہیے۔ سورۂ توبہ کی آیت والذین یکنزون الذھب والفضۃ کی تفسیر تمام متداوّل تفاسیر میں پڑھو "ولا ینفقونھا" کی توجیہ میں کس قدر مشکلیں پیدا کر دی گئی ہیں' اور پھر کیسے دور دراز حل نکالے ہیں؟ حالانکہ اگر اکتناز کے زور پر غور کیا ہوتا اور اس بارے میں قرآن وسنت کی روح پیش نظر ہوتی' تو معاملہ بالکل واضح تھا بہر حال یہ محل اطناب نہیں۔


حقیقتِ حج

سمندروں کوعبور کر کے، پہاڑوں کو طے کر کے، کئی کئی مہینوں کی مسافت چل کر، دنیا کی مختلف نسلوں، مختلف رنگتوں، مختلف بولیوں کے بولنے والے اور مختلف گوشوں کے باشندے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ سلانی یا ٹیوٹا نیک نسل کی باہمی عداوتوں سے دنیا کے لیے لعنت بنیں، اس لیے نہیں کہ ایک انسانی نسل دوسری نسل کو بھیڑیوں کی طرح پھاڑ دے اور اژدہوں کی طرح ڈسے، اس لیے نہیں کہ خدا کی زمین کو اپنے ابلیسی غرور اور شیطانی سیادت کی نمائش گاہ بنائیں، اس لیے نہیں کہ تیس تیس من کے گولے پھینکیں اور سمندر کے اندر ایسے جہنمی آلات رکھیں جو منٹوں اور لمحوں میں ہزاروں انسانوں کو نابود کر دیں بلکہ تمام انسانی غرضوں اور مادی خواہشوں سے خالی ہو کر اور ہر طرح کے نفسانی ولولوں اور بہیمی شرارتوں کی زندگی سے ماوراء الوریٰ جا کر، صرف اس خدائے قدوس کو پیار کرنے کے لیے، اس کی راہ میں دکھ اٹھانے اور مصیبت سہنے کے لیے اور اس کی محبت و رافت کو پکارنے اور بلانے کے لیے جس نے اپنے ایک قدوس دوست کی دعاؤں کو سنا اور قبول کیا، جبکہ نیکی کا گھرانا آباد کرنے کے لیے اور امن وسلامتی اور حق وعدالت کی بستی بسانے کے لیے اس نے اپنے خدا کو پکارا تھا کہ:

رَبَّنَآ اِنِّیٓ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِکَ الۡمُحَرَّمِ، رَبَّنَا لِیُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ فَاجۡعَلۡ اَفۡئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَہۡوِیۡۤ اِلَیۡہِمۡ وَارۡزُقۡہُمۡ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّہُمۡ یَشۡکُرُوۡنَ. (۳۷:۱۴)

''اے پروردگار، میں نے تیرے محترم گھر کے پاس ایک ایسے بیابان میں جو بالکل بے برگ وگیاہ ہے، اپنی نسل لا کر بسائی ہے تاکہ یہ لوگ تیری عبادت کو قائم کریں۔ پس تو ایسا کر کہ انسانوں کے دلوں کو ان کی طرف پھیر دے اور ان کے رزق کا بہتر سامان کر دے تاکہ وہ تیرا شکر کریں۔''

فہرست (حقیقت حج)

دیباچہ

قوموں اور ملکوں کا تفرقہ اور دلوں کی دوری

موجودہ زمانے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ بتلائی جاتی ہے کہ علوم وتمدن کی ترقی اور سیر وحرکت کے حیرت انگیز وسائل نے قوموں اور ملکوں کا تفرقہ دور کر دیا ہے۔ بحر وبر کے ڈانڈے مل گئے ہیں اور ساری دنیا ایسی ہو گئی ہے جیسے ایک مسلسل آبادی کے مختلف محلے اور حصے ہوتے ہیں۔

لیکن اس پر بھی ہم دیکھ رہے ہیں کہ قوموں اور ملکوں کے مکان کا تفرقہ جس قدر کم ہوتا جاتا ہے، دل اور دماغ کا تفرقہ اتنا ہی بڑھتا جاتا ہے۔ جس قدر تیزی سے بیسویں صدی کی موٹریں اور طیارے دوڑ رہے ہیں، اتنی ہی تیزی سے قوموں کے دل بھی ایک دوسرے سے برگشتہ ہو رہے ہیں۔

بکھرے دلوں کو جوڑنا

لیکن اب سے تیرہ سو برس[1] پہلے جب دنیا موجودہ زمانے کے تمام وسائل قرب و اجتماع سے محروم تھی، بحرِ احمر کے کنارے، ریگستان عرب کے وسط میں، حجاز کی چٹیل اور بے زراعت وادی کے اندر، ایک صدائے اجتماع بلند ہوئی اور نسل انسانی کے منتشر افراد کا ایک نیا گھرانہ آباد کیا گیا۔ انسانی اجتماع و یگانگت کی یہ پکار صرف اتنا ہی نہیں چاہتی تھی کہ ملکوں کی سرحدیں اور جغرافیہ کی حدیں ایک دوسرے سے قریب ہو جائیں بلکہ اس کا مقصد نسلِ انسانی کے بکھرے ہوئے دلوں اور برگشتہ روحوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دینا تھا۔

اعتقادِ رُوح کا ایمان

یہ پکار سنی گئی۔ کرہ ارضی کے سارے گوشوں اور خشکی اور تری کی ساری راہوں سے اس پکار کی بازگشت بلند ہوئی۔ انجن اور برق کی برق رفتار سواریوں کے ذریعہ نہیں، تار اور

لاسلکی کے گاڑے ہوئے ستونوں پر سے نہیں بلکہ دل کے اعتقاد اور روح کے ایمان کے ذریعہ اس کی پکار سب نے سنی اور اس کی پکار کا جواب سب کی زبانوں سے نکلا!

یہ اسلام کی پکار تھی! یہ اسلام کا فریضہ حج تھا!

انسانی اخوت کی اصلی صورت

اس نے ملکوں کو اکٹھا کر دیا، قوموں کو جوڑ دیا، نسل اور زبان و مکان کے سارے تفرقے دور کر دیئے، گورے کو کالے کے ساتھ اور بادشاہ کو فقیر بے نوا کے ساتھ ایک ہی مقام میں، ایک ہی وضع ولباس میں، ایک ہی صورت واعتقاد کے ساتھ، اس طرح جمع کر دیا کہ انسانی گمراہی کے بنائے ہوئے سارے امتیازات مٹ گئے، انسانی اخوت و وحدت اپنی اصلی صورت میں بے نقاب ہوگئی۔

جدہ سے خط

(ایک صاحب ۱۳۴۵ھ کا اجتماع حج دیکھ کر جدہ سے رقمطراز ہیں:)

''آج کل بحرِ احمر کا یہ ساحلی مقام تمام کرہ ارضی کے انسانوں کا مرکز بن گیا ہے۔ خشکی اور تری، دونوں راہوں سے قوموں اور ملکوں کے قافلے پہنچ رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جدہ کی زمین شق ہوگئی ہے اور انسانوں کے انبوہ اگل رہی ہے۔

......ایک دن میں نے مغرب کی نماز ساحل کی ریگ پر ادا کی، جہاں بعض روسائے جدہ نے کلب کی طرح ایک روزانہ اجتماع ''نادی الصلوٰۃ'' کے نام سے قائم کر رکھا ہے۔ نماز کے بعد جب میں لوٹا اور بازار کے قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں، برطانوی نمائندہ کے اسٹاف کے چند انگریز کھڑے بازار کے نظارہ میں غرق ہیں۔ ان میں ایک شخص رابرٹس نامی تھے، جن سے میں ایک دو مرتبہ مل چکا تھا۔ میں نے ان سے پوچھا۔ ''آپ کس چیز کے نظارہ میں اس قدر دلچسپی لے رہے ہیں؟'' انھوں نے کہا:

انسانی اخوت کی زندہ قوت

''دیکھو یہ ہندوستانیوں کا گروہ ہے، یہ پانچ پست قد جاوی کھڑے ہیں، ان کے ساتھ

ایک چین کی منگولین صورت دکھائی دے رہی ہے، دوسری طرف ایک ترکستانی کی سیاہ ٹوپی اور افغانی کی بڑی سی پگڑی ہے، ان کے پیچھے ایک گروہ یمنی عربوں کا سرخ جبے پہنے جا رہا ہے اور ان کے ساتھ اقصاء افریقہ کا ایک جزائری بربر ہنس ہنس کر باتیں کر رہا ہے۔ تیسری طرف دو حبشی کھڑے ہیں اور ایک مصری طربوش ان کے پیچھے نظر آ رہی ہے۔ اگر ان تمام قوموں کی آبادیاں جغرافیے کے نقشے میں ڈھونڈھی جائیں تو کیسے کیسے عظیم سمندر اور بے کنار صحرا ان میں حائل نظر آئیں گے۔ لیکن یہاں ان سب کو جمع کر دیا گیا ہے۔ سال کے اس موسم میں خود بخود دنیا کے تمام گوشے اس جگہ یکجا ہو جاتے ہیں۔ کیا آج دنیا کے کسی حصے میں بھی ایسا منظر نظر آ سکتا ہے؟ کیا اس منظر سے بھی بڑھ کر کوئی منظر ہے جو انسانی اجتماع کی ایک عجیب و غریب قوت کا پتہ دے؟ میں سوچ رہا ہوں کہ کس کے ہاتھوں میں اس رشتہ کا سرا ہے جس سے بحر و بر کے یہ تمام گوشے کھینچ لیے جا سکتے ہیں؟ اسلام کے ہاتھ میں!

چھٹی صدی کے صحرائے عرب کا اسلام آج بھی انسانی اخوت کی سب سے بڑی زندہ قوت ہے!

یوم الحج کا ورودِ مقدس

خدائے قدوس کی یاد و پکار

عشقِ الٰہی کا سب سے بڑا گھرانا

آج[1] ذوالحجہ کی پہلی تاریخ ہے اور ایک ہفتہ کے بعد تاریخ عالم کا وہ عظیم الشان روز طلوع ہونے والا ہے جس کے آفتاب کے نیچے کرہ ارضی کے ہر گوشے سے لاکھوں انسان اپنے خداوند کو پکارنے کے لیے جمع ہوں گے اور ریگستان عرب کی ایک بے برگ و گیاہ وادی کے اندر خدا پرستی و عشقِ الٰہی کا سب سے بڑا گھرانا آباد ہوگا:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ. (۲۲: ۴۱)

''وہ لوگ کہ اگر اللہ انہیں زمین میں قائم کردے تو ان کا کام صرف یہ ہوگا کہ صلوٰۃ الٰہی کو قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں، نیکی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکیں۔''

خدا پرستی کا پہلا مقدس گھر

یہ پہلا گھر تھا جو خدا کی پرستش کے لیے بنایا گیا اور آج بھی دنیا کے تمام بحرو بر میں صرف وہی ایک مقدس گوشہ ہے جو اولیاء الشیطان واصحاب النار کی لعنت سے پاک ہے اور صرف خدا کے دوستوں اور اس کی محبت میں دکھ اٹھانے والوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔

دور دراز ملکوں سے اجتماع کی وجہ

سمندروں کو عبور کر کے، پہاڑوں کو طے کر کے، کئی کئی مہینوں کی مسافت چل کر، دنیا کی مختلف نسلوں، مختلف رنگتوں، مختلف بولیوں کے بولنے والے اور مختلف گوشوں کے باشندے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ سلانی یا ٹیوٹا نیک نسل کی باہمی عداوتوں سے دنیا کے لیے لعنت بنیں، اس لیے نہیں کہ ایک انسانی نسل دوسری نسل کو بھیڑیوں کی طرح پھاڑ دے اور اژدہوں کی طرح ڈسے، اس لیے نہیں کہ خدا کی زمین کو اپنے ابلیسی غرور اور شیطانی سیادت کی نمائش گاہ بنائیں، اس لیے نہیں کہ تیس تیس من کے گولے پھینکیں اور سمندر کے اندر ایسے جہنمی آلات رکھیں جو منٹوں اور لمحوں میں ہزاروں انسانوں کو نابود کر دیں بلکہ تمام انسانی غرضوں اور مادی خواہشوں سے خالی ہو کر اور ہر طرح کے نفسانی ولولوں اور بہیمی شرارتوں کی زندگی سے ماوراء الوریٰ جا کر، صرف اس خدائے قدوس کو پیار کرنے کے لیے، اس کی راہ میں دکھ اٹھانے اور مصیبت سہنے کے لیے اور اس کی محبت ورافت کو پکارنے اور بلانے کے لیے جس نے اپنے ایک قدوس دوست کی دعاؤں کو سنا اور قبول کیا، جبکہ نیکی کا گھرانا آباد کرنے کے لیے اور امن وسلامتی اور حق وعدالت کی بستی بسانے کے لیے اس نے اپنے خدا کو پکارا تھا کہ:

رَبَّنَآ اِنِّیۡ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ

بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ، رَبَّنَا لِیُقِیْمُوْا الصَّلٰوۃَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَھْوِیْٓ اِلَیْھِمْ وَارْزُقْھُمْ مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّھُمْ یَشْکُرُوْنَ. (۱۴ : ۳۷)

''اے پروردگار، میں نے تیرے محترم گھر کے پاس ایک ایسے بیابان میں جو بالکل بے برگ وگیاہ ہے، اپنی نسل لاکر بسائی ہے تاکہ یہ لوگ تیری عبادت کو قائم کریں۔ پس تو ایسا کر کہ انسانوں کے دلوں کو ان کی طرف پھیر دے اوران کے رزق کا بہتر سامان کردے تاکہ وہ تیرا شکر کریں۔''

مقدس گھرانے کا معنوی تصور

کس بستی کے باشندے؟

آہ، تم ذرا ان کی ان عجیب وغریب حالتوں کا تصور کرو! یہ کون لوگ ہیں اور کس پاک بستی کے بسنے والے ہیں؟ کیا یہ اسی زمین کے فرزند ہیں جو خون اور آگ کی لعنتوں سے بھر گئی اور صرف بربادیوں اور ہلاکتوں ہی کے لیے زندہ رہی؟ کیا یہ اسی آبادی سے نکل آئے ہیں جو سبعیّت وخونخواری میں درندوں کے بھٹ اور سانپوں کے غاروں سے بھی بدتر ہے اور جہاں ایک انسان دوسرے انسان کو اس طرح چیرتا پھاڑتا ہے کہ آج تک نہ تو سانپوں نے کبھی اس طرح ڈسا اور نہ جنگلی سوروں نے کبھی اس طرح دانت مارے؟ کیا یہ اسی نسل اور گھرانے کے لوگ ہیں جنھوں نے خدا کے رشتوں کو یکسر کاٹ ڈالا اور اس طرح اس کی طرف سے منہ موڑ لیا کہ اس کی بستیوں اور آبادیوں میں خدا کے نام کے لیے ایک آواز اور ایک سانس بھی باقی نہ رہی؟ آہ! اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یہ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟ یہ قدوسیوں کی سی معصومیت، فرشتوں کی سی نورانیت، اور سچے انسانوں کی سی محبت ان میں کہاں سے آ گئی ہے؟

سب کے ماحول کی ہمہ گیر یکسانیت

تمام دنیا نسلی تعصّبات کے شعلوں میں جل رہی ہے، مگر دیکھو یہ دنیا کی تمام نسلیں

کس طرح بھائیوں اور عزیزوں کی طرح ایک مقام پر جمع ہیں اور سب ایک ہی حالت، ایک ہی وضع، ایک ہی لباس، ایک ہی قطع، ایک ہی مقصد اور ایک ہی صدا کیساتھ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں؟ سب خدا کو پکار رہے ہیں، سب خدا ہی کے لیے حیران وسرگشتہ ہیں، سب کی عاجزیاں اور درماندگیاں خدا ہی کے لیے ابھر آئی ہیں، سب کے اندر ایک ہی لگن اور ایک ہی ولولہ ہے، سب کے سامنے محبتوں اور چاہتوں کے لیے اور پرستشوں اور بندگیوں کے لیے ایک ہی محبوب ومطلوب ہے اور جبکہ تمام دنیا کا محورِ عمل، نفس وابلیس ہے تو یہ سب صرف خدا کے عشق ومحبت میں خانہ ویراں ہو کر اور جنگلوں اور دریاؤں کو قطع کر کے دیوانوں اور بے خودوں کی طرح یہاں اکٹھے ہوئے ہیں! انہوں نے نہ صرف دنیا کے مختلف گوشوں کو چھوڑا، بلکہ دنیا کی خواہشوں اور ولولوں سے بھی کنارہ کش ہو گئے!

دل سوختہ لوگوں کی بستی

اب یہ ایک بالکل نئی دنیا ہے جس میں صرف عشقِ الٰہی کے زخمیوں اور سوختہ دلوں کی بستی آباد ہوئی ہے۔ یہاں نہ نفس کا گزر ہے جو غرور بہیمی کا مبدا ہے اور نہ انسانی شرارتوں کو بار مل سکتا ہے جو خوں ریزی اور ظلم وسفاکی میں کرۂ ارضی کی سب سے بڑی درندگی ہیں۔

راز ونیازِ عبد ومعبود

یہاں صرف آنسو ہیں جو عشق کی آنکھوں سے بہتے ہیں، صرف آہیں ہیں جو محبت کے شعلوں سے دھوئیں کی طرح اٹھتی ہیں، صرف دل سے نکلی ہوئی صدائیں ہیں جو پاک دعاؤں اور مقدس نداؤں کی صورت میں زبانوں سے بلند ہو رہی ہیں اور ہزاروں سال پیشتر کے عہدِ الٰہی اور راز ونیاز عبد ومعبود ہی کو تازہ کر رہی ہیں۔

لبیک لبیک، اللھم لبیک، لا شریک لک
لبیک!

سرِ روحانیاں داری ولے خودرا ندیدستی
بخوابِ خود در آ تا قبلۂ روحانیاں بینی!

روحانی مجمع کی تاریخ حیات

قدوس دوستوں کی دعا

یہ وہ مجمع ہے جس کی بنیاد دعاؤں نے ڈالی۔ جس نے دعاؤں سے نشو ونما پائی، جو صرف دعاؤں ہی کے لیے قائم کیا گیا، جس کی ترکیب بھی اول سے لے کر آخر تک دعاؤں ہی کے مناسک سے ہوئی اور جو دعاؤں ہی کی لازوال طاقت سے قائم ہے۔

سب سے پہلی دعا وہ تھی جو اس گھر کی بنیاد رکھتے ہوئے خدا کے دو قدوس دوستوں کی زبان پر جاری ہوئی۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَکَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّکَ، وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ، رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلاً مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِکَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ وَيُزَکِّيْهِمْ، اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَکِيْمُ. (۲:۱۲۹۔۱۲۸)

''اے پروردگار! ہمیں اپنا اطاعت شعار بنا اور ہماری نسل سے ایک امت پیدا کر جو تیری مومن و مسلم ہو اور ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتلا دے اور ہماری توبہ قبول کر لے۔ تو تو بہت ہی بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔ اور پھر اے پروردگار! ہماری نسل میں اپنا ایک رسول مبعوث کر جو اس کے آگے تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کے اخلاق کا تزکیہ کر دے۔''

قبولیت دعا

سر بیابان، حجاز کے قدوس لم یزل نے یہ دعا قبول کر لی اور اپنی اُس امت مسلمہ کو

پیدا کیا جو فی الحقیقت وجودِ ابراہیمؑ کے اندر پنہاں تھی:

اِنَّ اِبۡرٰهِيۡمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا.(۱۶ : ۱۲۰)

''بیشک حضرت ابراہیم خلیلؑ اپنے وجود واحد کے اندر ایک پوری قوم اور خدا پرست امت تھے!''

یہ گھرانا درحقیقت دنیا کی امامت اور ارض الٰہی کی وراثت کے لیے آباد کیا گیا تھا، اور اس کا عہد و میثاق روز اول ہی بندھ گیا تھا۔

اطاعت شعاروں کی سرفرازی، ظالموں کی محرومی

پس اس مقدس دعا کی قبولیت نے امت مسلمہ کو بھی قائم کیا اور دنیا کو تزکیہ اور تعلیم کتاب وحکمت کے لیے سلسلہ ابراہیمی کے آخری رسول کو بھی مبعوث کیا نیز جو امامت و پیشوائی اور خلافتِ فی الارض حضرت ابراہیم خلیل (علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) کو دی گئی تھی، اس کی وارث ان کی ذریت ونسل ٹھہرائی گئی، البتہ بموجب اپنے عہد کے ظالموں کو اس سے محروم کر دیا گیا۔ اس نسل کے جو لوگ اپنے نفس وروح کے لیے ظالم ہوئے اور خدا کے مقدس نوشتوں کی اطاعت سے سرکشی کی ان سے وہ امامتِ موعودہ بھی چھین لی گئی اور خلافت موہوبہ سے بھی محروم کر دیے گئے کہ ''لَايَنَالُ عَهۡدِىۡ الظّٰلِمِيۡنَ!

فَخَلَفَ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ.(۱۹ : ۵۹)

''پھر ان کے بعد وہ لوگ ان کے جانشین ہوئے جنہوں نے صلوٰۃ الٰہی کو ترک کر دیا اور اپنی نفسانی خواہشوں کے بندے ہو گئے۔''

اقبال مندی اور تصویر نامرادی

یہ دعاؤں کا وعدہ تھا جس کا ظہور ہمارے اقبال وکامرانی کی تاریخ ہے اور اسی طرح یہ دعاؤں ہی کی ایک وعید بھی تھی جس کی سزائیں اور محرومیاں ہماری برگشتگی اور درماندگیوں کا ماتم ہے! وہ ہم ہی ہیں جو اِنِّىۡ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا کے وارث ٹھہرائے گئے تھے، اور

وہ بھی ہم ہی ہیں جو آج لَایَنَالُ عَهْدِیْ الظّٰلِمِیْنَ کی تصویر نامرادی ہیں!

ذٰلِکَ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْکُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ!

(۳:۱۸۲/۸:۵۱)

''یہ سب کچھ ان اعمال کا نتیجہ ہے جو خود انہوں نے اختیار کیے ورنہ خدائے کریم تو اپنے بندوں کے لیے کبھی بھی ظالم نہیں ہوسکتا۔،،

اجتماع لاہُوتی کا ظہور

پس دعاؤں کا یہ اجتماع لاہُوتی، امت مسلمہ کا یہ مجمع مبارک، اور روحانیت مقدسئہ ابراہیمیہ کا یہ مظہر عظیم وجلیل، قریب ہے کہ اسی بیابان حجاز میں ظہور کرے جہاں خدائے ابراہیم ومحمد (علیہما السلام) نے امامت وخلافت الٰہی کے لیے اولین دعا کو سنا اور پھر ہمیشہ دعاؤں کے سننے اور اپنی پکاروں اور نداؤں کے بلند ہونے کے لیے اسے برگزیدہ کر دیا۔

تصورِ کُوچ، تیسری ذی الحج

روحانیت عظمیٰ

جس وقت......ذی الحجہ کی تیسری تاریخ ہوگی (تویہ) بادیہ نوردان عشق آباد حجاز کے قافلے کوچ کے لیے تیار ہوں گے۔ اس وقت کا تصور کرو کہ وہ کیسا وقت عظیم ہوگا۔ جبکہ لاکھوں انسانوں کے اندر سے اسوۂ ابراہیمی کی روحانیت عظمیٰ اپنے خداوند کو بے قرارانہ پکارے گی اور اس کے مقدس عہد و میثاق کا رشتہ تازہ ہوگا؟ لاکھوں سر ہوں گے جو بے قرارانہ خداوند کے حضور جھکائے جائیں گے۔ لاکھوں پیشانیاں ہوں گی جو اس کی چوکھٹ پر گرائی جائیں گی۔ لاکھوں دل ہوں گے جو اس کے نظارۂ جمال کے عشق میں ڈوب جائیں گے اور لاکھوں زبانیں ہوں گی جن سے اس کے حضور میں دعائیں نکلیں گی۔

جمالِ عالم آراء کا جلوہ

پھر اس وقت ایسا ہوگا کہ دریائے محبت الٰہی جوش میں آئے گا، ملائکہ مقربین اس

کے خلوتِ وصال کو اس کے دوستوں کے لیے خالی کر دیں گے اور وہ اپنے جمال عالم آراء کے جلوے سے اس تمام محشرِ عشق وطلب کو ڈھانپ لے گا!

وقت عظیم کی غنیمت شماری

سو چاہیے کہ اس وقت عظیم وجلیل اور ایام الاھیۃ مخصوصہ کے حصول کو غنیمت سمجھو اور تم خواہ کہیں ہو اور کسی حال میں ہو، لیکن اپنی تمام قوتوں اور تمام جذبوں سے کوشش کرو کہ تمہاری دعائیں بھی ان دعاؤں کے ساتھ شامل ہو جائیں اور تمہاری بے تابیاں اور بے قراریاں بھی ٹھیک اسی وقت خدا کے حضور رحمت طلب ہوں کہ یہ وقت پھر میسر نہ آئے گا۔

وقت کی اہم ترین ضرورت

اختتامِ روز ہجر اور عہدِ وصال کا آغاز

دنیا انقلاب وتجدّد کے ایک مہیب عہد سے گزر رہی ہے اور نئے موسم کی علامتوں نے ہر طرف طوفانوں اور بجلیوں کی ایک قیامت کبریٰ بپا کر دی ہے۔ ممکن ہے کہ روزِ ہجر ختم ہونے اور عہدِ وصال کی ایک نئی رات شروع ہونے والی ہو۔ پس ضرور ہے کہ دن بھر جن لوگوں نے غفلت کی ہے، وہ اب عین شام کے وقت غفلت نہ کریں، کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ شام آ گئی ہے اور اب چراغوں کا انتظام کرنا چاہیے۔

نصب العین مومن

ہاں، ہر مومن کو چاہیے کہ وہ یکسر دعاؤں میں ڈوب جائے اور ان مقدس ایام کے اندر صدقِ دل سے توبہ کرے اور اپنے خداوند سے اپنا معاملہ درست کر لے۔

یہ بڑا ہی سخت وقت ہے جس کی نوشتۂ الٰہی میں خبر دی گئی تھی۔ وہ وقت موعودہ اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ آ گیا ہے اور زمین اپنے گناہوں کی پاداش میں الٹ دی گئی ہے۔ پس توبہ کرو اور اس کے سامنے اپنی سرکشیوں کا سر مجرموں کی طرح ڈال دو اور تڑپ تڑپ کر وہ سب کچھ مانگو جس کو تمہارا دل چاہتا ہے، مگر تمہارے اعمال اس کے سزاوار نہیں ہیں۔

نفس پرستیوں کا گوسالہ

تم اس کے حضور حج کے دن اور عید کی صبح کو جبکہ خلیل اللہ نے اپنے بیٹے کی گردن پر چھری رکھی تھی، مسکینوں اور لاچاروں کی طرح گر جاؤ، اپنی سرکشیوں اور نفس پرستیوں کے گوسالہ کو ذبح کر دو!

فَاقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ. (۲:۵۴)

"تم نے بچھڑے کو معبود ٹھہرالیا تھا لہٰذا اب اس کی پاداش میں اپنے نفسوں کو قتل کرو!"

اور گڑگڑا کر دعا مانگو کہ خداوندا! زمین کی سب سے بڑی مصیبت، انسانی معصیت کے سب سے بڑے عذاب اور انقلاب اقوام وملل کے سب سے مہیب موسم کے وقت ابراہیم و اسمٰعیلؑ کی ذریت کو نہ بھلائیو اور ان کے گناہوں کو معاف کر دیجیو!

عید کے دن کی یاد

دعائے انابت

علی الخصوص عید کے دن جب اس کے حضور کھڑے ہو تو اپنے گناہوں کو یاد کرو۔ تم میں ایک روح بھی ایسی نہ ہو جو تڑپتی نہ ہو اور ایک آنکھ بھی ایسی نہ ہو جس سے آنسوؤں کے چشمے نہ بہہ رہے ہوں۔ یاد رکھو کہ دل کی آہوں اور آنکھوں کے آنسوؤں سے بڑھ کر اس کی درگاہ میں کوئی شفیع نہیں ہوسکتا۔ پس جس طرح بھی ہوسکے، اپنے خدا کو راضی کرو اور اسے منالو، کیونکہ تم نے اپنی بداعمالیوں سے اسے غصہ دلایا، اس کے پاک حکموں کی پرواہ نہ کی! اور تم یوں پکارو کہ "اے ابراہیم اور اسمٰعیلؑ کے خداوند! اور اے رسولِ اُمیؐ کے پروردگار! ہم نے تیرے عہد کی پرواہ نہ کی اور اپنی بداعمالیوں سے تیری مقدس زمین کو ملوث اور گھناؤنا کر دیا، لیکن اب ہم اپنی سزاؤں کو پہنچ چکے ہیں، ہم نے بڑے سے بڑا دکھ اٹھالیا۔ ہم مثل یتیم لڑکوں کے ہو گئے ہیں جن کے والدین کو ان سے جدا کر دیا گیا ہو، کیونکہ ہمارا خدا ہم سے راضی نہ رہا اور ہم غمگینی اور رسوائی کے لیے چھوڑ دیے گئے۔ پر،

اے حیّ وقیوّم! اب ہم پر رحم کر، ہمارے قصوروں کو معاف کر اور ہم سے منہ نہ موڑ، گو ہمار ی خطائیں بے شمار ہیں لیکن ہم سب تیرے ہی نام لیوا کہلاتے ہیں اور تیری راہ میں دکھ اٹھانے کے لیے تیار ہیں!

اگر نہ بہرِ من، از بہرِ خود عزیزم دار
کہ بندۂ خوبی از خوبی خداوند ست!

تو نہ ہم کو بھول جا

اے ستّار و توابُ الرحیم! کیا ہمارا غم دائمی ہے؟ کیا ہماری خزاں کے لیے کبھی بہار نہیں؟ اور ہمارے زخم کے لیے کوئی مرہم نہ ہوگا؟ اے نسلِ ابراہیمی کی امید گاہ! تو ہمیشہ کے لیے ہمیں نہ بھول اور ہمیں اپنی طرف لوٹا لے۔ ہم تجھ سے ہمیشہ بھاگے ہیں مگر اب ہم تیری طرف لوٹ آئیں ہیں، کیونکہ ہمیں کہیں پناہ نہ ملی!

امن و ہدایت کی صدائے بازگشت

تو ہمیں نیکی اور صداقت کے لیے چن لے اور اپنی ہدایت و عدالت کی تبلیغ کا بوجھ پھر ہماری گردنوں پر ڈال! دنیا آج انتہائے ترقی کے بعد بھی امن و عدالت کے لیے ایسی ہی تشنہ ہے، جیسی ظہورِ صداقت کبریٰ کے اولین عہدِ جہالت میں تھی!

رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ. (۷: ۲۳)

”اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کیا، اگر تو نے ہمارا قصور نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ہمارے لیے بربادی کے سوا کچھ نہیں!،،

اَللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِى الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ، وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ، بِيَدِكَ الْخَيْرُ، اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ. (۳:۲٦)

''خدایا! شاہی و جہانداری کے مالک! تو جسے چاہے، ملک بخش دے، جس سے چاہے، ملک واپس لے لے، جسے چاہے عزت دے دے، جسے چاہے ذلیل کر دے! تیرے ہی ہاتھ میں ہر طرح کی بھلائی کا سر رشتہ ہے اور تیری قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں!،،

رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَإِلَيْكَ أَنَبْنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيْرُ، رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَاغْفِرْلَنَا رَبَّنَا، إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ. (۶۰: ۴، ۵)

''اے ہمارے پروردگار! ہم نے تجھی پر بھروسہ کیا ہے، تیری ہی طرف رجوع کرتے اور پھر تیری ہی طرف ہمیں لوٹ کر جانا ہے۔ پروردگار! ہمیں کافروں کا تختۂ مشق نہ بنانا۔ پروردگار! ہمیں بخش دے بیشک تو ہی غالب حکمت والا ہے۔،،

رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ. (۲: ۲۵۰)

''اے پروردگار! ہم پر صبر انڈیل دے اور اپنی راہ میں ثابت قدمی عطا کر اور پھر ایسا کر کہ منکرین حق کے گروہ پر ہم فتحمند ہو جائیں۔،،

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظَّالِمِيْنَ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ. (۱۰: ۸۵، ۸۶)

''پروردگار! ہمیں اس ظالم گروہ کے لیے آزمائشوں کا موجب نہ بنائیو، بلکہ اپنی رحمت سے ایسا کیجیو کہ اس کافر گروہ کے پنجہ سے نجات پا جائیں!،،

رَبَّنَا إِنَّكَ آتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَأَهُ زِيْنَةً وَّ أَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا، رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ، رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰى أَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا

الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ. (۸۸:۱۰)

''خدایا! تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو اس دنیا میں زیب و زینت کی چیزیں اور مال و دولت کی شوکتیں بخشی ہیں، تو خدایا، کیا یہ اس لیے ہے کہ تیری راہ سے یہ لوگوں کو بھٹکائیں! خدایا! ان کی دولت زائل کر دے اور ان کے دلوں پر مہر لگا دے کہ اس وقت تک یقین نہ آئے جب تک عذاب دردناک اپنے سامنے نہ دیکھ لیں۔''

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَی الْاَرْضِ مِنَ الْکَافِرِیْنَ دَیَّارًا. (۷۱:۲۶)

''خدایا! منکرین حق کا ایک گھر بھی زمین پر بسنے نہ پائے۔''

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَیْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَةً اِنَّکَ اَنْتَ الْوَهَّابُ. (۳:۸)

''اے پروردگار! ہمیں سیدھے راستے لگا دینے کے بعد ہمارے دلوں کو ڈانواں ڈول نہ کر اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما! یقیناً تو ہی ہے کہ بخشش میں تجھ سے بڑا کوئی نہیں!''

رحمت باری کی فراوانی کا دن

تلاشِ مومنِ قانت اور دعوت الی اللہ

(یوم الحج کا طلوع مقدس) سال بھر میں عالمِ اسلامی کے لیے یہ ایک ہی موقع تنبیہِ افکار، ایقاظِ ھمم، تحریکِ قلوب، استقبالِ وجوہ، احیاء ارواح اور ذہابِ الی اللہ کا آتا ہے جو فی الحقیقت دین الٰہی کے تمام آمال و اعمال کا مرکز و محور اور حلقہ بگوشانِ ملت حنفی کے لیے مبداء تجدّد و انقلاب ہے۔ جبکہ خدا اور اس کے بندوں کے درمیان کوئی حجاب باقی نہیں رہتا، جب کہ اس کے حریمِ وصال کے دروازے کھل جاتے ہیں، جبکہ اس کی رحمت و نصرت کے ملائکہ مسوّمین ایک ایک مومن قانت اور مسلم مخلص کے دل کو ڈھونڈھتے ہیں اور اسے خدا کی طرف لوٹ آنے کی دعوت دیتے ہیں کہ:

یَاعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ، اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا، اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ رَّحِیْمُ'. (۳۹:۵۳)

''اے میرے غافل بندو کہ تم نے عہد عبودیت و نیاز کو توڑ کر خود اپنے اوپر ظلم کیا ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو! خواہ تمھاری بداعمالیاں کیسی ہی سخت ہو رہی ہوں، بااین ہمہ اگر اب بھی توبہ وانابت کا سر جھکا دو، تو میں تمھارے تمام جرموں کو بخش دوں گا، کیونکہ میں بہت ہی بخشنے والا اور رحم فرما ہوں!''

باز آ باز آ، ہر آنچہ ہستی باز آ
گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ!
ایں درگہ مادر گہ نومیدی نیست
صد بار اگر توبہ شکستی باز آ!

محرومی از برکاتِ وقتِ مجیب

اے عزیزانِ غفلت شعار، اے بقیۂ ماتم گزارانِ قافلۂ ملت! تمھاری غفلتوں پر حسرت، تمھاری سرشاریوں پر صد افسوس اور تمھاری عزائم فراموشیوں پر صد ہزار آہ و ماتم، اگر تم اس وقت عظیم و مجیب کی برکتوں سے محروم رہو...... (اور اگر تم اپنے دلہائے مجروح اور ارواحِ مضطر کو خونباری و دجلہ ریزی کے لیے تیار نہ کرو!

جنگ اور صدیوں کی جنگ

تم کو اس جنگ...... کی بھی کچھ خبر ہے جو دنیا کی سب سے بڑی ضعیف ہستی اور سب سے بڑی لازوال طاقت کے درمیان صدیوں سے جاری ہے...... جو تم میں اور تمہارے خدائے قاہر و قیوّم میں برپا ہے، جس میں آج تک کسی بڑی سے بڑی قوت نے بھی فتح نہ پائی اور جس کی آخری شکست بڑی ہی الیم و معذّب ہے۔

......تم اس فاطر السموات والارض کی لایزال ولم یزل طاقت پر ایمان نہیں لاتے......تم کو یاد نہیں آتا کہ تم اس شہنشاہِ ارض وسما سے سرکش ہو گئے ہو جو اپنی ایک نگہِ مشیّت سے تمام نظام ارضین وسماوات کو الٹ دے سکتا ہے۔

بختِ خفتہ وطالع گم گشتہ

آہ، تمہاری غفلتوں پر اگر آسمان روئے اور زمین ماتم کرے، اگر مرغانِ ہوائی فغاں سنج ہوں اور سمندروں سے مچھلیاں غم کرنے کے لیے اچھل پڑیں، جب بھی اس کا ماتم ختم نہ ہوگا۔ کیونکہ تمھارا ماتم تمام دنیا کا ماتم ہے اور چراغ کے بجھنے کا رونا چراغ پر رونا نہیں ہے بلکہ گھر کی تاریکی پر رونا ہے۔

......تم دوسروں کی بیداری کے افسانے سن کر ترانہ سنجِ مدح وثنا ہوتے ہو، مگر اپنے بختِ خفتہ وطالع گم گشتہ کو نہیں ڈھونڈھتے کہ وہ کہاں گم ہو گیا ہے؟ **فاہ، آہ، ثم آہ، علی مافرطتم فی جنب اللّٰہ!**

درازئ شب و بیداری من ایں ہمہ نیست
زبختِ من خبر آرید تا کجا خفت است؟

خدائے قدوس سے صلح

نصرتِ خداوندی کی دامن گیری

جو جنگ تم میں اور تمہارے پروردگار کے درمیان جاری ہے، اس کی صلح کی کوئی تدبیر نکالو۔ اگر تم نے اس سے صلح کر لی تو پھر اس کی تمام دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے جو تم سے برسرِ پیکار ہوگا: **من له المولٰی فله الکل:**

اِنْ یَّنْصُرْکُمُ اللّٰہُ فَلاَ غَالِبَ لَکُمْ، وَاِنْ یَّخْذُلْکُمْ فَمَنْ ذَالَّذِیْ یَنْصُرُکُمْ مِّنْ م بَعْدِہٖ؟ وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ. (۱۶۰:۳)

اگر اللہ تمہیں غلبہ و نصرت عطا فرمائے تو پھر تم پر کوئی دنیوی طاقت
غالب نہیں آ سکتی۔ لیکن اگر وہی تمہیں ٹھکرا دے تو پھر دنیا میں کون ہے
جو خدا کے بعد تمہاری مدد کر سکتا ہے؟ پس اللہ ہی کی ذات ہے جس پر
اہلِ ایمان بھروسہ کرتے ہیں!

آتشکدۂ محبت کا اشتعال

......تم ایک نظر میدان عرفات و منیٰ کے اس سر و پا برہنہ گروہ پر ڈالو، جو سلانی یا ٹیوٹا نیک نسل کی مسابقت کے لیے نہیں بلکہ کلمۂ حق کی عظمت اور خدائے واحد کی پرستش و محبت کے لیے جمع ہو رہا ہے......

......اللہ کے خوف اور اس کی جستجو نے خود ان کے اندر ایک آتشکدۂ محبت مشتعل کر دیا ہے اور اس کا دھواں والہانہ صداؤں اور بیقرارانہ فریادوں کی صورت میں ان کی زبانوں سے اٹھ رہا ہے:

جمالِ کعبہ مگر عذر رہرواں خواہد
کہ جانِ خستہ دلاں سوخت در بیابانش

تذکار اسوۂ ابراہیمیؑ

عشق و ایثار کی گونج

اور دیکھو، یہ مجمعِ مقدس والٰہی کس واقعۂ کبریٰ کی یادگار ہے اور کس عہد و میثاقِ خداوندی کے تذکارِ عظیمہ کو ہمیشہ کے لیے زندہ رکھتا اور عالمِ ایمان و اسلام کو اس کی طرف دعوت دیتا ہے؟ اگر چشمِ حقیقت باز اور سامعۂ بصیرت وا ہو تو اس ابراہیم کدۂ حجاز کا ایک ایک ذرّہ آج اس واقعۂ کبریٰ اور آیتِ عظمیٰ کا افسانہ حقیقت بیان کر رہا ہے اور ملاءِ اعلیٰ اور عالم قدس کا ایک ایک گوشہ عشقِ ابراہیمی و ایثارِ اسمٰعیلی کے غلغلۂ روحانیت سے گونج رہا ہے:

شدیم خاک و لیکن بَبوئے تربتِ ما
تواں شناخت کزیں خاک مردمی خیزد

وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا. (۱۹:۵۰)

''ان میں سے ہر ایک کو ہم نے نبوت دی تھی، اور اپنی رحمت کی بخشش سے سرفراز کیا تھا۔ نیز ان سب کے لیے سچائی کی صدائیں بلند کر دیں (جو کبھی خاموش ہونے والی نہیں!)''

فدیہ ذبحِ عظیم

یہ دراصل حقیقتِ اسلامی کی اس عظیم الشان قربانی کی یادگار ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے جذبات ومحبت ماسویٰ اللہ کی اور حضرت اسمٰعیلؑ نے اپنی جان ونفس کی ٹھیک اسی ریگستان میں دی تھی اور جو تمام نسل ابراہیمی واسمٰعیلی کی روحانی قربانی کے فدیہ کے بعد قبول کر لی گئی کہ فی الحقیقت یہی فدیہ ذبحِ عظیم تھا:

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ، وَنَادَيْنَاهُ اَنْ يّٓا اِبْرَاهِيْمُ! قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا، اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ، اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓـؤُا الْمُبِيْنُ، وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ. (۳۷:۱۰۳۔۱۰۷)

''اور جبکہ حضرت ابراہیم واسمٰعیل، دونوں پر اطاعت وفدویّت اسلامی طاری ہوگئی اور حضرت ابراہیمؑ نے جوشِ قربانی میں اپنے محبوب فرزند کو ماتھے کے بل گرا دیا تا کہ راہ حق میں ذبح کر ڈالیں تو اس وقت ہم نے پکارا کہ اے ابراہیم بس کرو! بلاشبہ تم نے اپنے رویاءِ صادقہ کو پورا کر دکھلایا ہم اسی طرح اربابِ حق و احسان کو ان کی جاں فروشیوں اور قربانیوں کا صلہ دیا کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے یہ قربانی اس طرح قبول کر لی کہ اس کے فدیے میں ایک بہت ہی عظیم الشان اور دائمی قربانی قرار دے دی!''

ایمان باللہ کا دارومدار

یہ قربانی جس کا خون ہر سال میدان منیٰ میں جوش زن ہوتا ہے اور یہ ذبحِ عظیم جس کی ہر مسلمان شوق و ذوق سے تیاری کرتا ہے، فی الحقیقت اسلام کی حقیقتِ اعلیٰ کی ایک تمثیل ہے، جس کے پردے میں بتلایا گیا ہے کہ ایمان باللہ کا دار و مدار قربانی اور خون شہادت پر ہے اور جب تک یہ مقام ذہاب الی اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ حاصل نہ ہو، اس وقت تک کوئی ہستی مومن و مسلم نہیں ہوسکتی!

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ، تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ. (۹:۲۴)

"(اے پیغمبرؐ!) مسلمانوں سے کہہ دے: اگر ایسا ہے کہ تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہاری برادری، تمہارا مال جو تم نے کمایا ہے، تمہاری تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے ڈرتے ہو اور تمہارے رہنے کے مکانات جو تمھیں اس قدر پسند ہیں، یہ ساری چیزیں تمھیں اللہ سے، اس کے رسول سے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیاری ہیں (تو کلمہ حق تمہارا محتاج نہیں)، انتظار کرو، یہاں تک کہ جو کچھ خدا کو کرنا ہے، وہ تمہارے سامنے لے آئے، اور (اللہ تعالیٰ کا مقررہ قانون ہے کہ وہ) فاسقوں پر (کامیابی وسعادت کی راہ نہیں) کھولتا۔"

میثاقِ ابراہیمی کی یادگار

امامت وخلافت امتِ مسلمہ کا عہد

اور پھر یہ یوم الحج کا طلوع درحقیقت اس وعدۂ الٰہی اور عہد و میثاق ربانی کی یادگار

ہے جو حضرت ابراہیمؑ سے امت مسلمہ کی امامت و خلافت فی الارض کے لیے خدا نے باندھا تھا:

وَاِذَ ابْتَلٰٓی اِبْرَاهِيْمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا، قَالَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِیْ؟ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِيْنَ. (۲:۱۲۴)

''اور جبکہ ابراہیم کو اس کے پروردگار نے حقیقتِ اسلامی کی قربانی اور معرفتِ دینِ فطری کی چند آزمائشوں میں ڈالا اور اس نے انھیں پورا کیا۔ یعنی اپنے جگر گوشے کے گلے پر چھری رکھ دی، چاند اور سورج اور تمام مظاہرِ خلقت و مادیّت سے منہ موڑ کر صرف دین فطری والٰہی کی طرف متوجہ ہو گیا تو اس وقت ہم نے اسے بشارت دی کہ آج سے تمھیں انسانوں کی امامت و خلافت عطا کی جاتی ہے۔ اس پر حضرت ابراہیمؑ نے سوال کیا کہ ''اور میری نسل کو بھی؟''، فرمایا ''ہاں! مگر ان کو نہیں جو ہمارے عہد و میثاق کی پرواہ نہ کریں اور اسے ظالمانہ توڑ دیں!''

جلال و قدوسیّت کا نشیمن

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے وعدہ پورا کیا اور حضرت ابراہیم واسمٰعیل کی نسلِ روحانی وجسمانی کو دنیا کی امامت عطا فرمائی۔ پہلے اس کا ظہور بنی اسرائیل کی خلافت و امامت کی صورت میں ہوا اور پھر جب یروشلم کا ہیکل اور شام کے مرغزار اس کی محبت واطاعت کے سزاوار نہ رہے تو اس نے بنی اسمٰعیل کی قربان گاہ عرب اور وادیٔ بطحا و یثرب کے ریگستانوں کو اپنے جلال وقدوسیّت کا نشیمن بنایا!

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ مِنْ م بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ. (۱۰:۱۴)

''اور پھر ان کے بعد ہم نے تمھیں زمین کی خلافت عطا کی، تاکہ ہم

دیکھیں کہ (پھر) تمہارے اعمال کیسے ہوتے ہیں؟،،

ایفائے عہد ووعید غمگینی

سوائے پیروانِ دینِ ابراہیمی! اے وابستگانِ نسلِ اسمٰعیلی! اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا کا وعدہ بھی پورا ہو چکا، اور لَایَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ کی وعید کی غمگینی ورسوائی بھی تم دیکھ چکے:

> وَصَرَّفْنَا فِیْهِ مِنَ الْوَعِیْدِ لَعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ اَوْ یُحْدِثُ لَهُمْ ذِکْرًا. (۱۱۳:۲۰)
>
> ''اور ہم نے قرآن حکیم میں اپنی وعید اور اس کے نتائج بیان کر دیے تا کہ لوگ ڈریں یا اس کی وجہ سے ان کے دلوں میں عبرت وبصیرت پیدا ہو!،،

وعدہ اور وعید کی یادِ تازہ

یہ یوم الحج کا آفتاب ہر سال اس لیے فاران کی چوٹیوں اور جبلِ رحمت کی وادیوں پر طلوع ہوتا ہے تا کہ اُسی وعدہ ووعید کی یاد تازہ کرے اور اُس امتِ مسلمہ کو میثاقِ الٰہی یاد دلائے جس کا ظہور اسی بیابانِ حجاز کی دعاؤں سے ہوا تھا۔

امامت ارضی کی میراث

گم کردہ رحمتوں کی تلاش

پس وہ دن آ گیا اور خدا کی رحمتوں اور برکتوں کی سب سے بڑی گھڑی تمہارے سامنے ہے۔

یہی وہ وقت ہے کہ امت مسلمہ آخری مرتبہ اپنے عہد ومیثاق کو یاد کرے، جبکہ خدا کے قہر نے زمین کے فساد کو ڈھانپ لیا ہے تو وہ اس کی گم کردہ رحمتوں اور برکتوں کی تلاش میں نکلے۔

حقیقتِ اسلامی کی قربانی

تم دنیا کے تغیرات اور نقشۂ امن وجنگ کی تبدیلیوں میں محو ہو گئے ہو۔ مگر تم خود اپنے

اندر تبدیلی پیدا نہیں کرتے، جس سے تمام عالم کی تبدیلی وابستہ ہے؟ اس تبدیلی کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ حقیقت اسلامی کی اس قربانی کو اپنے روح وقلب پر طاری کرو جس کی یادگار میں ہر سال تمہارا ہاتھ ظاہری قربانی کی چھری پکڑتا ہے اور تم خدا کے حضور خون بہاتے ہو۔

محبوبات ومطلوبات سپرد خدا

پھر اس کے ساتھ ہی اللہ کے حضور گر جاؤ، اپنے تمام اعمال زندگی کے اندر اس کے مقدس حکموں کے عشق واطاعت کی روح پیدا کرو، توبہ وانابت کے آنسو بہا کر اور عجز و بے قراری کی تڑپ پیدا کر کے اس کے سامنے مجرموں کی طرح خاک عجز ونیاز پر لوٹو، اور اپنی جانوں کو، اپنے مال ومتاع کو، اپنے اہل وعیال کو، اپنی تمام محبوبات ومطلوبات کو، اس کے لیے، اس کے کلمہ مقدس کے لیے، اسکی ملت مرحومہ کے لیے اور اس کی صداقت اور عدالت کے لیے اس کے سپرد کردو۔

قبولیت بخشنے والا خدا

وہ خدا جس نے ابراہیمؑ کی دعا سنی، جس نے اسمٰعیلؑ کی قربانی کو قبول کیا، جس نے وادئ غیر ذی زرع کو ظہورِ رسالتِ کبریٰ سے مرکز مشارق ومغارب ومجمع اولین وآخرین بنایا، اگر تمہاری بداعمالیوں اور سرکشیوں کی وجہ سے تمہیں ٹھکرا سکتا تھا، تو آج وہ تمہیں پیار بھی کر سکتا ہے، تمہاری دعاؤں کو سن بھی سکتا ہے۔

کھوئی ہوئی میراث کی واپسی

پس توبہ کرو، اپنے عزائم وآمالِ مقدسہ کو زندہ کرو، دعائیں مانگو اور خداوندِ حجاز کو پکارو تاکہ تمہاری کھوئی ہوئی میراث پھر تمہیں واپس مل جائے، تمہارے غمگینی کے دن ختم ہوں اور لَایَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْن کے زمرے سے نکل کر اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا کے حزب اللہ میں داخل ہو جاؤ:

ذٰلِکَ یُوْعَظُ بِهٖ مَنْ کَانَ مِنْکُمْ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ! ذَالِکُمْ اَزْکٰی لَکُمْ وَاَطْهَرُ. (۲۳۲:۲)

''تم میں سے ہراس انسان کو جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے، اس حکم کے ذریعہ نصیحت کی جاتی ہے! اسی بات میں تمہارے لیے زیادہ برکت اور زیادہ پاکیزگی ہے!،،

مقاصدِ حج کا لُبِّ لُباب

عباداتِ اسلامیہ کی امتیازی خصوصیت

نماز

دنیا کے تمام مذاہب میں اسلام کی ایک مابہ الامتیاز خصوصیت یہ ہے کہ اس نے تمام عبادات واعمال کا ایک مقصد متعین کیا اور اس مقصد کو نہایت صراحت کے ساتھ ظاہر کر دیا۔ نماز کے متعلق تصریح کی:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ. (۲۹:۴۵)

''نماز ہرقسم کی بداخلاقیوں سے انسان کو روکتی ہے۔،،

روزہ

روزے کے متعلق فرمایا:

لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ. (۲:۱۸۳)

''روزے کے ذریعہ تم پرہیزگار بن جاؤ گے۔،،

زکوٰۃ

زکوٰۃ کی نسبت بیان کیا:

خُذْ مِنْ اَمْوَالِھِمْ صَدَقَۃً تُطَھِّرُھُمْ وَتُزَکِّیْھِمْ بِھَا. (۹:۱۰۳)

''ان کے مال ودولت میں سے ایک حصہ بطور صدقہ کے لے لو، کیونکہ تم اس کے ذریعہ ان کو بخل اور حرص وطمع کی بداخلاقیوں سے پاک وصاف کر سکو گے۔،،

صدقہ

احادیث نے اس سے زیادہ تصریح کردی ہے۔

الصَّدَقَةُ اَوْسَاخُ الْمُسْلِمِيْنَ تُوْخَذُ مِنْ اَغْنِيَائِهِمْ وَ تُرَدُّ اِلٰى فُقَرَائِهِمْ.

''صدقہ مسلمانوں کے دل کا میل ہے، ان کے دولتمندوں سے لے کر ان کے محتاجوں کو دے دیا جاتا ہے۔''

حج

اسی طرح خداوند تعالیٰ نے حج کے فوائد ومنافع کو بھی نہایت وضاحت کے ساتھ بیان فرمادیا:

لِيَّشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمَاتٍ. (۲۸:۲۲)

''حج کا اصلی مقصد یہ ہے کہ لوگ اپنے اپنے فوائد کو حاصل کریں اور اس کے ساتھ ہی چند مخصوص دنوں میں خدا کو یاد بھی کرلیا کریں۔''

حج اور تجارت بین الملّی

مقصدِ خصوصی

اس (مذکورہ) آیت میں قرآن حکیم نے جن فوائد کو حج کا مقصد قرار دیا ہے ان سے اجتماعی واقتصادی فوائد مراد ہیں اور یہ حج کا ایک ایسا اہم مقصد ہے کہ ابتدا میں جب صحابہ کرام نے دینی مقاصد کے منافی سمجھ کر اسے بالکل چھوڑ دینا چاہا تو اللہ نے ایک خاص آیت نازل فرمائی:

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ، اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلاً مِّنْ رَّبِّكُمْ. (۱۹۸:۲)

''اگر زمانۂ حج میں تجارتی فوائد حاصل کروتو اس میں مذہب کا کوئی

نقصان نہیں۔،،

اقتصادیات وتمدن عرب

قرآن حکیم کا عام طرزِ خطاب یہ ہے کہ وہ جزئیات سے کسی قسم کا تعرض نہیں کرتا۔ اس کی توجہ ہمیشہ اہم باتوں کی طرف مبذول رہتی ہے۔اس بناء پر خداوندِ تعالیٰ نے جس قسم کی تجارت کو حج کا مقصد قرار دیا اور اس کی ترغیب و حوصلہ افزائی کی، وہ عرب کی اقتصادی وتمدنی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ تھا۔

عرب اگر چہ ایک بادیہ نشیں اور غیر متمدن قوم تھی تاہم معاش کی ضرورتوں نے اس کوتمدن کی ایک عظیم الشان شاخ یعنی تجارت کی طرف ابتدا ہی سے متوجہ کر دیا تھا۔قریش کا قافلہ عموماً شام وغیرہ کے اطراف میں مال لے کر جایا کرتا تھا اور ان لوگوں نے وہاں کے رہنے والوں سے مستقل طور پر تجارتی تعلقات پیدا کر لیے تھے۔خود مکہ کے متصل عکاظ اور ذوالمجاز وغیرہ متعدّد بازار قائم تھے اور وہ حج کے زمانے میں اچھی خاصی تجارتی منڈی بن جاتے تھے۔

تجارت بین الاقوام کا قیام

پس اہل عرب کونفسِ تجارت کی طرف متوجہ کرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی، لیکن اسلام جو عظیم الشان و عالمگیر مدنیت پیدا کرنا چاہتا تھا، اس کی گرم بازاری کے لیے عکاظ، ذوالحیت اور ذوالمجاز کی وسعت کافی نہ تھی، وہ دنیا کی تمام متمدن قوموں کی طرح تجارت بین الاقوام کا مستقل سلسلہ قائم کرنا چاہتا تھا، کیونکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ عنقریب آفتابِ اسلام حجاز کی پہاڑیوں سے بلند ہوکر تمام بحروبر پر چمکنے والا ہے۔

تمدن کی منفعتِ عظیمہ

پس اس آیت کریمہ میں جن اقتصادی وتجارتی فوائد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ ایک وسیع بین الملی تجارت کا قیام ہے ورنہ اہلِ عرب جس قسم کی تجارت کرتے تھے وہ تو ہر حال میں قائم رکھی جاسکتی تھی اور قائم تھی۔ البتہ تجارتِ بین الاقوام کا سلسلہ بالکل قیامِ

امن وبسطِ عدل واجتماعِ عام پر موقوف تھا، اس لیے جب کامل امن وامان ہوگیا اور حج نے راستے کے تمام نشیب وفراز ہموار کر دیے تو اس وقت خدا نے مسلمانوں کو تمدن کی اس منفعت عظیمہ کی ترغیب عام دی۔

مقاصدِ اعلیٰ وحقیقیہ

مطالبِ قرآن کا عام وخاص طرزِ خطاب

لیکن اس تصریح وتوضیح کے علاوہ قرآنِ حکیم کا ایک طرزِ خطاب اور بھی ہے جو صرف خواص کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ قرآن حکیم کا عام اندازِ بیان یہ ہے کہ وہ جن مطالب کو عام طور پر ذہن نشین کرنا چاہتا ہے، یا کم از کم وہ ہر شخص کی سمجھ میں آ سکتے ہیں، ان کو تو نہایت کھلے الفاظ میں ادا کر دیتا ہے، لیکن جن مطالبِ دقیقہ کے مخاطب صرف خواص ہوتے ہیں اور وہ عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ سکتے، ان کو صرف اشارات وکنایات میں ادا کرتا ہے۔

اہم ترین مقصد

مقاصدِ حج میں تجارت ایک ایسی چیز تھی جس کا تعلق ہر شخص کے ساتھ تھا اور اس کے فوائد ومنافع عام طور پر سمجھ میں آ سکتے تھے اس لیے خدا نے اس کو نہایت وضاحت کے ساتھ بیان فرما دیا۔ لیکن حج کا ایک اہم مقصد اور بھی تھا۔ جس کو اگرچہ صراحتًا بیان نہیں کیا گیا لیکن قدم قدم پر اس کی طرف اس کثرت سے اشارے کیے کہ اگر اُن تمام آیتوں کو جمع کر دیا جائے تو کئی صفحے صرف انہی سے لبریز ہو جائیں۔

باوجودِ ابہام حقیقت بے نقاب

حقائق ومعارفِ الٰہیہ کے اظہار میں قرآن حکیم نے عمومًا اسی قسم کا طرزِ خطاب اختیار کیا ہے جس سے باوجود ابہام کے حقیقت کا چہرہ بالکل بے نقاب ہو جاتا ہے: وَمَا یَعْقِلُهَا اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ!

ارشاد و ہدایت کا بین الملّی مرکز

سفرِ حج درحقیقت انسانی ترقیوں کے تمام مراحل کا مجموعہ ہے۔اس کے ذریعہ انسان تجارت بھی کر سکتا ہے،علمی تحقیقات بھی کر سکتا ہے،جغرافیہ اور سیاحت علمیہ کے فوائد بھی حاصل کر سکتا ہے،مختلف قوموں کے تمدن وتہذیب سے آشنا بھی ہوسکتا ہے،ان میں باہم ارتباط و علائق بھی پیدا ہو سکتے ہیں،اشاعت مذہب وتبلیغِ حق و معروف کا فرض بھی انجام دے سکتا ہے،سب سے آخر اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تمام عالم کی اصلاح وہدایت،وانسدادِ مظالم وفتن،وقلع وقمع کفار ومفسدین،واعلان جہادِ فی سبیل الحق والعدالت کے لیے بھی وہ ایک بین الملّی مرکز ومجمعِ عمومِ اہلِ ارض کا حکم رکھتا ہے۔

امتِ مسلمہ کی قومیت

عام ترقیوں کا سنگِ بنیاد

لیکن ان تمام چیزوں سے مقدم اوران تمام ترقیوں کا سنگ بنیاد ایک خاص امتِ مسلمہ اور حزب اللہ کا پیدا کرنا اور اس کا استحکام ونشو ونما تھا۔

حضرت ابراہیم واسمٰعیل علیہما السلام نے حج کامقصدِ اولین اسی کو قرار دیا تھا:

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَکَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّکَ، وَاَرِنَا مَنَا سِکَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا، اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ. (۲:۱۲۸)

''اے پروردگار! (اپنے فضل وکرم سے) ہمیں ایسی توفیق دے کہ ہم سچے مسلم (یعنی تیرے حکموں کے فرمانبردار) ہو جائیں اور ہماری نسل میں سے بھی ایک ایسی امت پیدا کردے جو تیرے حکموں کی فرمانبردار ہو۔خدایا! ہمیں ہماری عبادت کے (سچے) طور طریقے بتلا دے اور ہمارے قصوروں سے درگزر کر،بلاشبہ تیری ہی ذات ہے جو رحمت سے درگزر کرنے والی ہے اور جس کی رحیمانہ درگزر کی کوئی انتہا نہیں!،،

آب وہوا کا اثر

لیکن جس قالب میں قومیت کا ڈھانچہ تیار ہوتا ہے اس میں دو قوتیں نہایت شدت اور وسعت کے ساتھ عمل کرتی ہیں: آب وہوا اور مذہب۔ آب وہوا اور جغرافیانہ حدودِ طبیعیہ اگرچہ قومیت کے تمام اجزاء کو نہایت وسعت کے ساتھ احاطہ کر لیتے ہیں، لیکن ان کے حلقہ اثر میں کوئی دوسری قوم نہیں داخل ہو سکتی!

مذہب کا حلقۂ اثر

یورپ اور ہندوستان کی قدیم قومیت نے صرف ایک محدود حصۂ دنیا میں نشو ونما پائی ہے اور آب وہوا کے اثر نے ان کو دنیا کی تمام قوموں سے بالکل الگ تھلگ کر دیا ہے۔ لیکن مذہب کا حلقۂ اثر نہایت وسیع ہوتا ہے۔ وہ ایک محدود قطعۂ زمین میں اپنا عمل نہیں کرتا بلکہ دنیا کے ہر حصے کو اپنی آغوش میں جگہ دیتا ہے۔ کرۂ آب وہوا کا طوفان خیز تصادم اپنے ساحل پر کسی غیر قوم کو آنے نہیں دیتا مگر مذہب کا ابرِ کرم اپنے سائے میں تمام دنیا کو لے لیتا ہے۔

عظیم الشان قومیّت کا مایۂ خمیر

> حضرت ابراہیم علیہ السلام جس عظیم الشان قوم کا خاکہ تیار کر رہے تھے۔ اس کا مایۂ خمیر صرف مذہب تھا اور اس کی روحانی ترکیب، عنصرِ آب وہوا کی آمیزش سے بالکل بے نیاز تھی۔ جماعت قائم ہو کر اگرچہ ایک محسوس مادی شکل میں نظر آتی ہے، لیکن درحقیقت اس کا نظامِ ترکیبی بالکل روحانی طریقہ پر مرتب ہوتا ہے، جس کو صرف جذبات و خیالات، بلکہ عام معنوں میں صرف قوائے دماغیہ کا اتحاد واشتراک ترتیب دیتا ہے۔

رابطہ اتحادِ مذہبی کا استحکام

اس بناء پر اس قوم کے پیدا ہونے سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک مذہبی رابطہ اتحاد کے سررشتہ کو مستحکم کیا:

اِذْ قَالَ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهِيْمُ بَنِيْهِ وَ يَعْقُوْبُ: يَا بَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ. (۲:۱۳۱-۱۳۲)

''جبکہ ابراہیم سے اس کے خدا نے کہا کہ صرف ہماری ہی فرمانبرداری کرو، تو انہوں نے جواب دیا کہ میں مسلم ہوا پروردگارِ عالم کے لیے، اور پھر اسی طریقہ اسلامی کی انہوں نے اور یعقوبؑ نے اپنی نسل کو وصیت کی اور کہا کہ خدا نے تمہارے لیے ایک نہایت برگزیدہ دین منتخب کر دیا ہے۔ تم اس پر عمر بھر قائم رہنا اور مرنا تو مسلمان ہی مرنا۔''

قومیت جدیدہ کی نشأۃِ اُولیٰ

ظہور و تکمیل کا مقدس آشیانہ

لیکن جماعت عموماً اپنے مجموعۂ عقاید کو مجسم طور پر دنیا کے فضائے بسیط میں دیکھنا چاہتی ہے اور اس کے ذریعہ اپنی قومیت کے قدیم عہد مودّت کو تازہ کرتی ہے۔ اس لیے انہوں نے اس جدید المنشئت قومیت کے ظہور و تکمیل کے لیے ایک نہایت مقدس اور وسیع آشیانہ تیار کیا:

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهِيْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ، رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا، اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ. (۲:۱۲۷)

''جب ابراہیم اور اسمٰعیل خانہ کعبہ کی بنیاد ڈال رہے تھے تو یہ دعا ان کی زبانوں پر تھی، خدایا! ہماری اس خدمت کو قبول کر لے! تو دعاؤں کا سننے والا اور نیتوں کا جاننے والا ہے!''

روحانی جماعت کا قالب

یہ صرف اینٹ پتھر کا گھر نہ تھا بلکہ ایک روحانی جماعت کے قالب کا آب وگل تھا۔ اس لیے جب وہ تیار ہو گیا تو انہوں نے اس جماعت کے پیدا ہونے کی دعا کی: رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ.'' (۲-۱۲۸)

وصیتِ ابراہیمؑ

اب یہ قوم پیدا ہو گئی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی آخری وصیت کے ذریعہ اس روحانی سررشتۂ حیات کو اس کے حوالے کر دیا:

وَوَصّٰی بِهَا اِبْرٰهِيْمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ، يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ. (۲:۱۳۲)

''اور ابراہیمؑ اور یعقوبؑ دونوں نے اس روحانی طریقہ نشو ونما کی اپنے اپنے بیٹوں کو وصیت کی کہ خدا نے تمہارے لیے ایک برگزیدہ دین منتخب فرما دیا ہے، تم اس پر (مرتے دم تک) قائم رہنا!

وصیتِ حضرت یعقوبؑ

اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِيْ، قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرَاهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ. (۲:۱۳۳)

''(اور پھر کیا تم اس وقت موجود تھے) جب یعقوبؑ کے سر پر موت آ کھڑی ہوئی اور اس آخری وقت میں انہوں نے اپنے بیٹوں سے پوچھا: میرے بعد کس چیز کی پوجا کرو گے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم تیرے اور تیرے مقدس باپ ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ و اسحاقؑ کے خدائے واحد کی عبادت کریں گے، اور ہم اسی کے فرمانبردار بندے ہیں!،،

آثار قائمہ و ثابتہ اُمت مسلمہ

مقدس یادگاروں کا ذخیرہ

اب اگرچہ یہ جماعت دنیا میں موجود نہ تھی اور اس کے آثارِ صالحہ کو زمانے نے بے اثر کر دیا تھا۔

تِلْكَ اُمَّةٌ، قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ. (۲:۱۴۱)

''وہ قوم گزر گئی، اس نے جو کام کیے، اس کے نتائج اس کے لیے تھے،
اور تم جو کچھ کرو گے اس کے نتائج تمھارے لیے ہوں گے۔''

لیکن اس کی تربیت ونشو ونما کا عہدِ قدیم اب تک دستبردِ زمانہ سے بچا ہوا تھا اور اپنے آغوش میں مقدس یادگاروں کا ایک وسیع ذخیرہ رکھتا تھا۔ اس کے اندر اب تک آبِ زمزم لہریں لے رہا تھا، صفا و مروہ کی چوٹیوں کی گردنیں اب تک بلند تھیں، مذبحِ اسمٰعیلؑ اب تک مذہب کے گرم خون سے رنگین تھا، حجرِ اسود اب تک بوسہ گاہِ خلق تھا، مشاعر ابراہیمؑ اب تک قائم تھے اور عرفات کے حدود میں اب تک کوئی تبدیلی نہیں کی گئی تھی۔

دعائے تجدید ونفخ روحی

غرض یہ کہ اس کے اندر خدا کے سوا سب کچھ تھا اور صرف اسی کے جمالِ جہاں آرا کی کمی تھی۔ اس لیے اس کی تجدید ونفخ روح کے لیے ایک مدت کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا سب سے آخری نتیجہ ظاہر ہوا۔ انھوں نے کعبۃ اللہ کی بنیاد رکھتے ہوئے دعا کی تھی:

رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلاً مِّنۡهُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَيُزَكِّيۡهِمۡ، اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ. (۲:۱۲۹)

''خدایا! ان کے درمیان انہی لوگوں میں سے ایک پیغمبر بھیج کہ وہ ان کو تیری آیتیں پڑھ کر سنائے کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کے نفوس کا تزکیہ کر دے، تو بڑا صاحبِ اختیار اور صاحبِ حکمت ہے!''

ظہور رحمۃ للعالمینؐ

چنانچہ اس کا ظہور وجودِ مقدس حضرت رحمۃ العالمین وختم المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی صورت میں ہوا جو ٹھیک اس دعا کا پیکر وممثل تھا:

هُوَ الَّذِیۡ بَعَثَ فِی الۡاُمِّيّٖنَ رَسُوۡلاً مِّنۡهُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ

اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیۡھِمۡ وَیُعَلِّمُھُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَۃَ. (۲:۶۲)

''وہ خدا جس نے ایک غیر متمدن قوم میں سے اپنا ایک رسول پیدا کیا۔ جو اللہ کی آیات ان کو سناتا ہے، ان کے نفس کا تزکیہ کرتا ہے، اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔''

تربیت یافتہ جماعت

پس انہوں نے جو قوم پیدا کر دی تھی، اسی کے اندر سے ایک پیغمبر اٹھا۔ اس نے اس گھر میں سب سے پہلے خدا کو ڈھونڈنا شروع کیا، لیکن وہ اینٹ پتھر کے ڈھیر میں بالکل چھپ گیا تھا۔ فتح مکہ نے اس انبار کو ہٹا دیا تو خدا کے نور سے قندیلِ حرم پھر روشن ہو گئی۔ وہ قوم جس کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا فرمائی تھی، اس پیغمبر کے فیض صحبت سے بالکل مزکیٰ و تربیت یافتہ ہو گئی تھی۔

تجدید و احیائے مذہب

اب ایک مرکز پر جمع کر کے اس کے مذہبی جذبات کو صرف جلا دینا باقی تھا۔ چنانچہ اُسے خانہ کعبہ کے اندر لا کر کھڑا کر دیا گیا اور اس کی مقدس قدیم مذہبی یادگاروں کی تجدید و احیاء سے اس کے مذہبی جذبات کو بالکل پختہ و مستحکم کر دیا۔

سعی صفا و مروہ

کبھی ان سے کہا گیا:

اِنَّ الصَّفَا وَالۡمَرۡوَۃَ مِنۡ شَعَآئِرِ اللّٰہِ، فَمَنۡ حَجَّ الۡبَیۡتَ اَوِ اعۡتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡہِ اَنۡ یَّطَّوَّفَ بِھِمَا. (۲:۱۵۸)

''صفا و مروہ خدا کی قائم کی ہوئی یادگاریں ہیں، پس جو لوگ حج یا عمرہ کرتے ہیں، ان پر ان دونوں کے درمیان طواف کرنے میں کوئی حرج نہیں۔''

مشعر الحرام کی یاد

کبھی ان کو مشعرِ حرام کی یاد دلائی گئی:

فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ. (۲:۱۹۸)

''جب عرفات سے لوٹو مشعرِ حرام (مزدلفہ) کے نزدیک خدا کی یاد کرو!،،

خانہ کعبہ کی قدیم ترین یادگار

خانہ کعبہ خود دنیا کی سب سے قدیم یادگار تھی، لیکن اس کی ایک ایک یادگار کو نمایاں تر کیا گیا:

فِيْهِ اٰيَاتٌ، بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ اِبْرَاهِيْمَ. (۳:۹۷)

''اس میں بہت سی کھلی ہوئی نشانیاں ہیں۔ منجملہ ان کے ایک نشانی حضرت ابراہیمؑ کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے۔،،

نقشِ پا، سجدہ گاہِ خلق

لیکن جو لوگ خدا کی راہ میں ثابت قدم رہے، ان کے نقشِ پا سجدہ گاہِ خلق ہونے کے مستحق تھے۔ اس لیے حکم دیا گیا:

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيْمَ مُصَلّٰى. (۲:۱۲۵)

''اور ابراہیمؑ کے کھڑے ہونے کی جگہ کو اپنا مصلی بنالو!،،

مادی اور روحانی یادگاریں

مادی یادگاروں کی زیارت صرف سیر وتفریح کے لیے کی جاتی ہے، لیکن روحانی یادگاروں سے صرف دل کی آنکھیں ہی بصیرت حاصل کرسکتی ہیں۔ اس لیے ان کے ادب واحترام کو اتقاو تبصر کی دلیل قرار دیا گیا:

وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ. (۲۲:۳۲)

''اور جو لوگ خدا کی قائم کی ہوئی یادگاروں کی تعظیم کرتے ہیں تو یہ تعظیم ان کے دلوں کی پرہیزگاری پر دلالت کرتی ہے۔،،

وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمَاتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ، لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ. (۲۲:۳۰)

''اور جو شخص خدا کی قرار کی ہوئی قابلِ ادب چیزوں کا احترام کرتا ہے تو

خدا کے نزدیک اس کا نتیجہ اس کے حق میں بہتر ہے۔،،

روحانی اثر ونفوذ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان مقدس یادگاروں کے روحانی اثر ونفوذ کو دلوں میں جذب کرادینا چاہتے تھے، اس لیے خاص طور پر لوگوں کو ان کی طرف متوجہ فرماتے رہتے تھے:

عِنْدَهٗ مَشَاعِرِ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ.

خوب غور سے دیکھو اور بصیرت حاصل کرو، کیونکہ یہ تمھارے باپ ابراہیمؑ کی یادگار ہیں!

اعلانِ تکمیل دین

فراموش کردہ روشِ ملت ابراہیمیؑ

جب اسلام نے اس جدید النشئت قوم کے وجود کی تکمیل کردی اور خانۂ کعبہ کی ان مقدس یادگاروں کی روحانیت نے اس کی قومیت کے شیرازہ کو مستحکم کردیا تو پھر ملت ابراہیمی کی فراموش کردہ روش دکھادی گئی:

فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا، وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ. (۹۵:۳)

''پس ابراہیمؑ کے طریقہ کی پیروی کرو جو صرف ایک خدا کے ہو رہے تھے۔،،

کمالِ دین کا استحکام

اب تمام عرب نے ایک خط مستقیم کو اپنا مرکز بنالیا اور قدیم خطوط منحنہ حرف غلط کی طرح مٹادیے گئے۔ جب یہ سب کچھ ہو چکا تو اس کے بعد خدائے ابراہیم واسمٰعیلؑ کا سب سے بڑا احسان پورا ہوگیا:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا. (۵:۳)

''آج میں نے تمہارے اس دین کو کامل کردیا جس نے تم کو ایک قومیت

کے رشتے میں منسلک کر دیا ہے اور اپنے تمام احسانات تم پر پورے کر دیے اور تمہارے لیے صرف ایک دین اسلام ہی کو منتخب کیا۔،،

تاریخِ فرضیّتِ حج کا ایک لمحۂ فکریہ

دعوت ابراہیمی کی صدائے بازگشت

دعوتِ عام

اہلِ عرب نے اگر چہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مجموعہ تعلیم ہدایت کو بالکل بھلا دیا تھا، لیکن انھوں نے خانہ کعبہ کے کنگرے پر چڑھ کر تمام دنیا کو جو دعوتِ عام دی تھی، اس کی صدائے بازگشت اب تک عرب کے در و دیوار سے آ رہی تھی:

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرَاهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّ طَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ، وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّ عَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ، مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ. (۲۲:۲۶۔۲۷)

اور جب ہم نے حضرت ابراہیمؑ کے لیے ایک معبد قرار دیا اور حکم دیا کہ ہماری قدوسیّت و جبروت میں اور کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرانا اور اس گھر کو طواف کرنے والوں اور رکوع و سجود اور قیام کرنے والوں کے لیے ہمیشہ پاک و مقدس رکھنا! نیز ہم نے حکم دیا کہ دنیا میں حج کی پکار بلند کرو! لوگ تمہاری طرف دوڑتے ہوئے چلے آئیں گے۔ ان میں پیادہ پا بھی ہوں گے اور وہ بھی جنھوں نے مختلف قسم کی سواریوں پر دور دراز مقامات سے قطع مسافت کی ہوگی!

بدعات ومحدثاتِ جاہلیت

سنتِ ابراہیمی کی صورت اور حقیقت

لیکن سچ کے ساتھ جب جھوٹ مل جاتا ہے تو وہ اور بھی خطرناک ہو جاتا ہے۔ اہلِ عرب نے اگر چہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس سنت قدیمہ کو اب تک زندہ رکھا تھا، لیکن بدعات و اختراعات کی آمیزش نے اصل حقیقت کو بالکل گم کر دیا تھا:

تین سوساٹھ بتوں کا مرکز

(۱) خدانے اپنے گھر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قیام کی اجازت صرف اس شرط پر دی تھی کہ کسی کو خدا کا شریک نہ بنانا: اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا۔،، لیکن اب خدا کا یہ گھر تین سوساٹھ بتوں کا مرکز بن گیا تھا اور ان کا طواف کیا جاتا تھا۔

فخر وغرور کا ترانہ گاہ

(۲) خدانے حج کا مقصد یہ قرار دیا تھا کہ دنیوی فوائد کے ساتھ خدا کا ذکر قائم کیا جائے، لیکن اب صرف آباؤاجداد کے کارنامہائے فخر وغرور کے ترانے گائے جاتے تھے۔

مخصوص امتیازاتِ قریش

(۳) حج کا ایک مقصد تمام انسانوں میں مساوات قائم کرنا تھا، اسی لیے تمام عرب بلکہ تمام دنیا کو اس کی دعوتِ عام دی گئی اور سب کو وضع ولباس میں متحد کر دیا گیا۔ لیکن قریش کے غرور وفضیلت نے اپنے لیے بعض خاص امتیازات قائم کر لیے تھے جو اصول مساوات کے بالکل منافی تھے۔ مثلاً تمام عرب عرفات کے میدان میں قیام کرتا تھا، لیکن قریش مُزدلفہ سے باہر نہیں نکلتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم متولیانِ حرم، حرم کے باہر نہیں جا سکتے۔ جس طرح آج کل کے امرائے فسق اور پُرغرور والیانِ ریاست، عام مسلمانوں کے ساتھ مسجد میں آ کر بیٹھنے اور دوش بدوش کھڑے ہونے میں اپنی توہین سمجھتے ہیں۔

برہنہ طواف

(۴) قریش کے سوا عرب کے تمام مرد وزن برہنہ طواف کرتے تھے۔ سترِ عورت کے ساتھ صرف وہی لوگ طواف کر سکتے تھے جن کو قریش کی طرف سے کپڑا ملتا تھا اور قریش نے اس کو بھی اپنے لیے اظہارِ سیادت کا ایک ذریعہ بنالیا تھا۔

عمرہ سخت گناہ متصور ہونا

(۵) عمرہ گویا حج کا ایک مقدمہ یا جزو تھا لیکن اہل عرب ایامِ حج میں عمرہ کو سخت گناہ سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ ''جب حاجیوں کی سواریوں کی پشت کے زخم اچھے ہو جائیں اور صفر کا مہینہ گزر جائے، تب عمرہ جائز ہوسکتا ہے۔

یہودانہ رہبانیت کا گہوارہ

(۶) حج کے تمام اجزا وارکان میں یہودیانہ رہبانیّت کا عالمگیر مرض جاری وساری ہو گیا تھا۔ اپنے گھر سے پاپیادہ حج کرنے کی منت ماننا، جب تک حج ادا نہ ہوجائے خاموش رہنا، قربانی کے اونٹوں پر کسی حال میں سوار نہ ہونا، ناک میں نکیل ڈال کر جانوروں کی طرح خانہ کعبہ کا طواف کرنا، زمانہ حج میں گھر کے اندر دروازے کی راہ سے نہ گھسنا بلکہ پچھواڑے کی طرف سے دیوار پھاند کے آنا دروِدیوار پر قربانی کے جانوروں کے خون کا چھاپہ لگانا، عرب کا عام شعار ہو گیا تھا۔

ظہورِ اسلام وتزکیۂ حج

دینِ ابراہیمی کی تکمیل

اسلام درحقیقت دین ابراہیمی کی حقیقت کی تکمیل تھی، اس لیے وہ ابتداء ہی سے اس حقیقت گم شدہ کی تجدید واحیاء میں مصروف ہوگیا، جس کا قالب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مبارک ہاتھوں نے تیار کیا تھا۔

ارکانِ اسلام کی ہیئت مجموعی

اسلام کا مجموعۂ عقاید وعبادات صرف توحید، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج سے مرکب

ہے۔ لیکن ان تمام ارکان میں حج ہی ایک ایسا رکن ہے جس سے اس تمام مجموعہ کی ہیئت ترکیبی مکمل ہوتی ہے اور یہ تمام ارکان اس کے اندر جمع ہو گئے ہیں۔

اسلام معلق بہ کعبہ

یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام کو صرف کعبہ ہی کے ساتھ معلق کر دیا:

> اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِىْ حَرَّمَهَا وَلَهٗ كُلُّ شَىْءٍ وَّ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ. (۹۱:۲۷)
>
> ''مجھ کو صرف یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں اس شہر (مکہ) کے خدا کی عبادت کروں جس نے اس کو عزت دی۔ سب کچھ اسی خدا کا ہے، اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اس کا فرمانبردار مسلم ہوں!،،

حج اور اسلام لازم وملزوم

اور یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے ہر موقع پر حج کے ساتھ اسلام کا ذکر بطور لازم وملزوم کے کیا:

> وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ، فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ، وَّاحِدٌ، فَلَهٗ اَسْلِمُوْا وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ. (۳۴:۲۲)
>
> ''اور ہر ایک امت کے لیے ہم نے قربانی قرار دی تھی تاکہ خدا نے ان کو جو چار پائے بخشے ہیں، ان کی قربانی کے وقت خدا کا نام لیں، پس تم سب کا خدا ایک ہی ہے، اسی کے تم سب فرمانبردار بن جاؤ اور خدا کے خاکسار بندوں کو حج کے ذریعہ دینِ حق کی بشارت دو۔،،

آزمائشِ ابراہیم

خدا کا فطری معاہدہ

اسلام خدا کا ایک فطری معاہدہ تھا، جس کو انسان کی ظالمانہ عہد شکنی نے بالکل چاک

چاک کر دیا، اس لیے خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ناخلف اولاد کو روزِ اول ہی اس کے ثمرات سے محروم کر دیا:

وَاِذِ ابْتَلٰی اِبْرَاهِیْمَ رَبُّهٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ، قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا، قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ؟ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ. (۲:۱۲۴)

''جب خدا نے چند احکام کے ذریعے ابراہیمؑ کو آزمایا اور وہ خدا کے امتحان میں پورے اترے، تو خدا نے کہا کہ اب میں تمہیں دنیا کی امامت اور خلافت عطا کرتا ہوں۔ اس پر حضرت ابراہیمؑ نے عرض کیا: اور میری اولاد کو بھی؟ ارشاد ہوا، کہ ہاں، مگر اس قول و قرار میں ظالم لوگ داخل نہیں ہو سکتے!''

آزمائش کے اجزاءِ اولین

خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جن کلمات کے ذریعہ آزمایا اور جن کی بناء پر انہیں دنیا کی امامت عطا ہوئی، وہ اسلام کے اجزاءِ اولین یعنی توحیدِ الٰہی، قربانیِ نفس و جذبات، صلوٰۃِ الٰہی کا قیام اور معرفتِ دینِ فطری کے امتحانات تھے۔ اگرچہ ان کی اولاد میں سے چند ناخلف لوگوں نے ان ارکان کو چھوڑ کر اپنے اوپر ظلم کیا اور اس موروثی عہدے سے محروم ہو گئے:

قَالَ لَایَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ (۲۔۱۲۴)

امت مسلمہ مستورہ

لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات کے اندر ایک دوسری امت بھی چھپی ہوئی تھی جس کے لیے خود انھوں نے خدا سے دعا کی تھی:

اِنَّ اِبْرَاهِیْمَ کَانَ اُمَّةً قَانِتًا (۱۶:۱۲۰)

''حضرت ابراہیمؑ گو بظاہر ایک فردِ واحد تھے، مگر ان کی فعالیتِ روحانیۂ الٰہیہ کے اندر ایک پوری قومِ قانت و مسلم پوشیدہ تھی!''

اجزائے حج کے ترکیبی مرکبات

رسولِ مزّکیٰ وموعودہ کاظہور

اب اس امت مسلمہ کے ظہور کا وقت آ گیا اور وہ رسول مزّکیٰ وموعودہ غارِحرا کے تاریک گوشوں سے نکل کر منظر عام پر نمودار ہوا، تاکہ اس نے خود اس اندھیرے میں جو روشنی دیکھی ہے، وہ روشنی تمام دنیا کو دکھلا دے:

يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَىٰ النُّوْرِ (۲:۲۵۷)

''وہ پیغمبران کو اندھیرے سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔''

قَدْ جَآءَ كُمْ مِنَ اللّٰهِ نُوْرٌ، وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ (۵:۱۵)

بیشک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نورِ ہدایت اور ایک کھلی کھلی ہدایتیں دینے والی کتاب آئی۔''

موروثی گھر کی واگزاری

وہ منظر عام پر آیا تو سب سے پہلے اپنے باپ کے موروثی گھر کو ظالموں کے ہاتھ سے واپس لینا چاہا لیکن اس کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کی طرح بتدریج چند روحانی مراحل سے گزرنا ضرور تھا۔ چنانچہ اس نے ان مرحلوں سے گزرنا شروع کیا۔

توحید کا غلغلہ

اس نے غارِحرا سے نکلنے کے ساتھ ہی توحید کا غلغلہ بلند کیا کہ خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جو عہد لیا تھا اس کی پہلی شرط یہی تھی: اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا. (۲۲:۲۶)

صفِ نماز

پھر اس نے صفِ نماز قائم کی کہ یہ گھر صرف خدا ہی کے آگے سر جھکانے والوں کے لیے بنایا گیا تھا: وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ. (۲:۱۲۵)

روزے کی تعلیم

اس نے روزے کی تعلیم دی کہ وہ شرائط حج کی تکمیل کا ایک یقینی ذریعہ ہے۔

فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ. (۲:۱۹۷)

"جس شخص نے ان مہینوں میں حج کا عزم کرلیا تو اس کو ہر قسم کی نفس پرستی، بدکاری اور جھگڑے تکرار سے اجتناب کرنا لازمی ہے۔"

روزے کی حقیقت

اور روزہ کی حقیقت یہی ہے کہ وہ انسان کو غیبت، بہتان، فسق و فجور، مخاصمت و تنازعت اور نفس پرستی سے روکتا ہے، جیسا کہ احکام صیام میں فرمایا:

ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى اللَّيْلِ، وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عَاكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ. (۲:۱۸۷)

"پھر رات تک روزہ پورا کرو اور روزہ کی حالت میں عورتوں کے نزدیک نہ جاؤ۔ اور اگر مساجد میں اعتکاف کرو تو شب کو بھی ان سے الگ رہو۔"

زکوٰۃ کی ادائیگی

اس نے زکوٰۃ بھی فرض کردی کہ وہ بھی حج کا ایک اہم مقصد تھا:

فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ. (۲۲:۲۸)

"قربانی کا گوشت خود کھاؤ اور فقیروں اور محتاجوں کو بھی کھلاؤ!"

فتح مکہ کی غرض و غایت

امت مسلمہ کا منظرِ عام پر نمایاں کرنا

اس طرح جب اس امت مسلمہ کا روحانی خاکہ تیار ہوگیا تو اس نے اپنی طرح ان کو

بھی منظرِ عام پر نمایاں کرنا چاہا۔ اس غرض سے اس نے عمرہ کی تیاری کی اور ۱۴۰۰۔۱۵۰۰ کی جمعیت کے ساتھ روانہ ہوا کہ پہلی بار تو اپنے آبائی گھر کو حسرت آلود نگاہوں سے دیکھ کر چلے آئیں۔ کیونکہ یہ کاروانِ ہدایت راستے ہی میں مقام حدیبیہ پر روک دیا گیا۔ دوسرے سال حسبِ شرائطِ صلح زیارتِ کعبہ کی اجازت ملی اور آپؐ مکہ میں قیام کر کے چلے آئے۔ اب اس مصالحت نے راستے کے تمام نشیب وفراز ہموار کر دیے تھے، صرف خانہ کعبہ میں پتھروں کا ایک ڈھیر رہ گیا تھا اسے بھی فتح مکہ نے ہموار کر دیا:

دَخَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ مَكَّةَ يَوْمَ الْفَتْحِ وَحَوْلَ الْبَيْتِ سِتُّوْنَ وَ ثَلٰثِمِائَةِ نَصَبٌ فَجَعَلَ لَطْعَنُهَا بِعُوْدٍ فِيْ يَدِهٖ وَ يَقُوْلُ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ. (صحیحین)

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فتح مکہ کے دن جب خانہ کعبہ میں داخل ہوئے تو اس کے گرد تین سو ساٹھ بت نظر آئے۔ آپؐ ان کو ایک لکڑی کے ذریعے ٹھکراتے جاتے تھے اور یہ آیت پڑھتے جاتے تھے: جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا.،، (یعنی حق اپنے مرکز پر آ گیا اور باطل نے اس کے سامنے ٹھوکر کھائی۔ باطل پامال ہونے ہی کے لائق تھا۔،،

اعادہ دعوتِ عام

اب میدان بالکل صاف تھا۔ راستے میں ایک کنکری بھی سنگِ راہ نہیں ہو سکتی تھی۔ باپ نے گھر کو جس حال میں چھوڑا تھا، بیٹے نے اسی حالت میں اس پر قبضہ کر لیا۔ تمام عرب نے فتح مکہ کو اسلام وکفر کا معیارِ صداقت قرار دیا۔ جب مکہ فتح ہوا تو لوگ جوق در جوق دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ اب وقت آ گیا تھا کہ دنیا کو اس جدید النشئت امت مسلمہ کے قالب روحانی کا منظر عام طور پر دکھا دیا جاتا۔ اس لیے دوبارہ اسی دعوت عامہ کا اعادہ کیا گیا، جس کے ذریعے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تمام عالم میں ایک غلغلہ عام ڈال دیا تھا، مگر اس قوت کا فعل میں آنا ظہورِ نبیِ اُمیؐ پر موقوف تھا:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلاً. (۳:۹۷)

''جولوگ مالی اور جسمانی حالت کے لحاظ سے حج کی استطاعت رکھتے ہیں،ان پراب حج فرض کردیا گیا۔''

تکمیل حج کا اعلانِ عام

بدعات واختراعات کا ترک

اس صدا پر تمام عرب نے لبیک کہا اور آپ ؐ کے گرد ۱۳۔۱۴ ہزار آدمی جمع ہو گئے۔ عرب نے ارکانِ حج میں بدعات واختراعات کا جو زنگ لگا دیا تھا وہ ایک ایک کر کے چھڑا دیا گیا اور آباؤ اجداد کے کارناموں کی بجائے خدا کی توحید کا غلغلہ بلند کیا گیا:

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآئَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا. (۲:۲۰۰)

''زمانہ حج میں خدا کو اسی جوش وخروش سے یاد کرو جس طرح اپنے آباؤ اجداد کے کارناموں کا اعادہ کرتے تھے بلکہ اس سے بھی زیادہ سرگرمی کے ساتھ۔''

امتیازاتِ قریش مٹادینا

قریش کے تمام امتیازات مٹا دیے گئے اور تمام عرب کے ساتھ ان کو بھی عرفات کے ایک گوشہ میں کھڑا کر دیا گیا:

ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. (۲:۱۹۹)

''اور جس جگہ سے تمام لوگ روانہ ہوں تم بھی وہیں سے روانہ ہوا کرو اور فخر وغرور کی جگہ خدا سے مغفرت مانگو، کیونکہ خدا بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔''

ممانعت برہنہ طواف

سب سے بدترین رسم برہنہ طواف کرنے کی تھی، اور مردوں سے زیادہ حیا سوز نظارہ برہنہ عورتوں کے طواف کا ہوتا تھا۔لیکن ایک سال پہلے ہی سے اس کی عام ممانعت کردی گئی:

اَنَّ اَبَاھُرِیْرَۃَ اَخْبَرَہُ اَنَّ اَبَابَکْرِ الصِّدِیْقَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ بَعَثَہُ فِیْ الْحَجَّۃِ الَّتِیْ اَمَّرَہُ رَسُوْلُ اللّٰہِ (صلعم) قَبْلَ حَجَّۃِ الْوَدَاعِ یَوْمَ النَّحْرِ فِیْ رَھْطٍ یُؤَذِّنُ فِیْ النَّاسِ، اَلاَ لَا یَحُجُّ بَعْدَ الْعَامِ مُشْرِکٌ وَلاَ لِیَطُوْفَ بِالْبَیْتِ عُرْیَانٌ. (بخاری جزو۲۔ص۱۵۳)

''حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ حجتہ الوداع سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ایک حج کا امیر بنایا اور انھوں نے مجھ کو ایک گروہ کے ساتھ روانہ کیا تا کہ یہ اعلان کر دیا جائے کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک اور کوئی برہنہ شخص حج یا طواف نہ کر سکے گا۔''

عملی تلقین نبوی ﷺ

زمانہ حج میں عمرہ کرنے والوں کو فاسق و فاجر کہا جاتا تھا لیکن آنحضرتؐ نے حجتہ الوداع میں عمرہ ہی کا احرام باندھا اور صحابہؓ کو بھی عمرہ کرنے کا حکم دیا۔ پا پیادہ اور خاموش حج کرنے کی ممانعت کی گئی۔ قربانی کے جانوروں پر سوار ہونے کا حکم دیا گیا۔ ناک میں رسی ڈال کر طواف کرنے سے روکا گیا۔ گھر میں دروازے سے داخل ہونے کا حکم ہوا:

وَلَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُھُوْرِھَا وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰی وَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِھَا، وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ. (۱۸۹:۲)

''یہ کوئی نیکی کا کام نہیں ہے کہ گھروں میں پچھواڑے سے آؤ، نیکی تو صرف اس کی ہے جس نے پرہیزگاری اختیار کی۔ پس گھروں میں دروازے ہی کی راہ سے آؤ اور خدا سے ڈرو، یقین ہے کہ تم کامیاب ہو گے۔''

حقیقت قربانی کی وضاحت

قربانی کی حقیقت واضح کی گئی اور بتایا گیا کہ وہ صرف ایثارِ نفس و فدویّت جان و روح کے اظہار کا ایک طریقہ ہے۔ اس کا گوشت یا خون خدا تک نہیں پہنچتا کہ اس کے

چھاپہ سے دیواروں کو رنگین کیا جائے۔ خدا تو صرف خالص نیتوں اور پاک وصاف دلوں کو دیکھتا ہے:

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ. (۲۲:۳۷)

''خدا تک قربانی کے جانوروں کا گوشت وخون نہیں پہنچتا، اس تک تو صرف تمھاری پرہیزگاری پہنچتی ہے۔''

یہ چھلکے اتر گئے تو خالص مغز ہی مغز باقی رہ گیا۔ اب وادیٔ مکہ میں خلوص کے دوقدیم وجدید منظر نمایاں ہو گئے، ایک طرف آبِ زمزم کی شفاف سطح لہریں لے رہی تھی۔ دوسری طرف ایک جدید النشأت قوم کا دریائے وحدت موجیں مار رہا تھا!

اعلانِ عام اور حجتہ الوداع

اسلام کا مقصد اعظم

لیکن دنیا اب تک اس اجتماع عظیمہ کی حقیقت سے بے خبر تھی۔ اسلام کی ۲۳ سالہ زندگی کا مدوجزر تمام عرب دیکھ چکا تھا، مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ اسلام کی تاریخی زندگی کن نتائج پر مشتمل تھی اور مسلمانوں کی جدوجہد اور فدویت، ایثار نفس وروح کا مقصد اعظم کیا تھا؟ اب اس کی توضیح کا وقت آ گیا تھا۔

حضرت ابراہیمؑ کی دعا

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس گھر کا سنگِ بنیاد اس دعا کو پڑھ کر رکھا تھا:

اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ. (۲:۱۲۶)

''جب ابراہیمؑ نے کہا کہ خداوندا، اس شہر کو امن کا شہر بنا اور اس کے باشندے اگر خدا اور روزِ قیامت پر ایمان لائیں تو ان کو ہر قسم کے ثمرات و نعائم عطا فرما!''

دنیا کی حالت بوقتِ دعا

جس وقت انہوں نے یہ دعا کی تھی، تمام دنیا فتنہ وفساد کا گہوارہ بن رہی تھی۔ دنیا کا امن وامان اٹھ گیا تھا۔ اطمینان وسکون کی نیند آنکھوں سے اڑ گئی تھی۔ دنیا کی عزت وآبرو معرض خطر میں تھی، جان و مال کا تحفظ ناممکن ہو گیا تھا، کمزور اور ضعیف لوگوں کے حقوق پامال کر دیے گئے تھے، عدالت کا گھر ویران، حریّت انسانیہ مفقود اور نیکی کی مظلومیت انتہائی حد تک پہنچ چکی تھی۔ کرۂ ارضی کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جو ظلم وکفر کی تاریکی سے ظلمت کدہ نہ بن چکا ہو۔

دنیا سے کنارہ کشی

اس لیے انہوں نے آباد دنیا کے ناپاک حصوں سے کنارہ کش ہو کر ایک وادئ غیر ذی زرع میں سکونت اختیار کی۔ وہاں ایک دارالامن بنایا اور تمام دنیا کو صلح وسلام کی دعوت عام دی۔

گم شدہ حق کی واپسی

اب ان کی صالح اولاد سے یہ دارالامن بھی چھین لیا گیا تھا۔ اس لیے اس کی واپسی کے لیے پورے دس سال تک اس کے فرزند نے بھی باپ کی طرح میدان میں ڈیرہ ڈالا۔ فتح مکہ نے جب اس کا مامن وملجا واپس دلا دیا تو وہ اس میں داخل ہوا کہ باپ کی طرح تمام دنیا کو گم شدہ حق کی واپسی کی بشارت دے۔ چنانچہ وہ اونٹ پر سوار ہو کر نکلا اور تمام دنیا کو مژدۂ امن وعدالت سنایا:

خطبہ حجۃ الوداع

اِنَّ دِمَاءَ کُمْ وَ اَمْوَالَکُمْ عَلَیْکُمْ حَرَامٌ کَحُرْمَةِ یَوْمِکُمْ هٰذَا فِیْ شَهْرِ کُمْ هٰذَا فِیْ بَلَدِکُمْ هٰذَا. اَلَا اِنَّ کُلَ شَیْءٍ مِنْ اَمْرِ الْجَاهِلِیَّةِ تَحْتَ قَدَمَیْ مَوْضُوْعٌ وَ دِمَاءُ الْجَاهِلِیَّةِ مَوْضُوْعَةٌ وَ اَوَّلُ دَمٍ اَضَعُهُ دِمَاءُ نَادَمُ ابْنُ رَبِیْعَةَ

وَرِبٰوا الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوْعٌ وَّ اَوَّلُ رِبًا اَضَعُ رِبَانَا رِبَا عَبَّاسِ ابْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ. اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ، اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ، اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ (ابوداؤد جلد ا۔ ص ۲٦ کتاب الحج)۔

''جس طرح تم آج کے دن کی، اس مہینہ کی، اس شہر مقدس میں حرمت کرتے ہو، اسی طرح تمہارا خون اور تمہارا مال بھی تم پر حرام ہے۔ اچھی طرح سن لو کہ جاہلیت کی تمام بری رسموں کو آج میں اپنے دونوں قدموں سے کچل ڈالتا ہوں، بالخصوص زمانۂ جاہلیت کے انتقام اور خوں بہا لینے کی رسم تو بالکل مٹا دی جاتی ہے۔ میں سب سے پہلے اپنے بھائی ابن ربیعہ کے خون کے انتقام سے دست بردار ہوتا ہوں۔ جاہلیت کی سودخواری کا طریقہ بھی مٹا دیا جاتا ہے اور سب سے پہلے خود میں اپنے چچا عباس ابن عبدالمطلب کے سود کو چھوڑتا ہوں۔ خدایا تو گواہ رہیو! خدایا تو گواہ رہیو! خدایا تو گواہ رہیو کہ میں نے تیرا پیغام تیرے بندوں تک پہنچا دیا!،،

کامیابی کی آخری بشارت

اب حق پھر پھرا کے پھر اپنے اصلی مرکز پر آ گیا اور باپ نے دنیا کی ہدایت وارشاد کے لیے جس نقطہ سے پہلا قدم اٹھایا تھا، بیٹے کے روحانی سفر کی وہ آخری منزل ہوئی اور اسی نقطے پر پہنچ کر اسلام کی تکمیل ہوگئی۔ اس لیے کہ اس نے تمام دنیا کو مژدۂ امن سنایا تھا، آسمانی فرشتے نے بھی اس کو کامیابی مقصد کی سب سے آخری بشارت دے دی:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا. (۵:۳)

''آج کے دن میں نے تمہارے دین کو بالکل مکمل کر دیا، اور تم پر اپنے تمام احسانات پورے کر دیے، اور میں نے تمہارے لیے اسلام کو ایک برگزیدہ دین منتخب کیا!،،

حج مختلف یادگاروں کا مجموعہ ہے

یادگارِ ابراہیم

عباداتِ اسلامیہ میں حج مختلف یادگاروں کا مجموعہ ہے۔ وہ جس گھر میں ادا کیا جاتا ہے، خدا کے سب سے برگزیدہ بندے کے ہاتھ کی قائم ہوئی یادگار ہے:

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرَاهِيْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ، رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا، اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ. (۱۲۷:۲)

''حضرت ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ خانہ کعبہ کی دیواریں چن رہے تھے تو اس وقت یہ دعا ان کی زبانوں پر تھی کہ خدایا! ہمارے اس عمل کو قبول کر، تو ہی سننے والا اور جاننے والا ہے!''

بیت اللہ

بلکہ دنیا کی مذہبی یادگاروں میں سب سے قدیم یادگار وہی ہے:

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّةَ مُبَارَکًا وَّهُدًی لِّلْعَالَمِيْنَ. (۹۶:۳)

''پہلا گھر جو انسان کی پرستش گاہ بنایا گیا، وہی گھر ہے جو مکہ میں تمام دنیا کی برکت و ہدایت کے لیے تعمیر کیا گیا۔''

مقامِ ابراہیمؑ

ان بندوں نے خدا کی وحدانیت کی ایک زندہ رہنے والی یادگار قائم کی تھی۔ خدا نے بھی اس میں ان کی یادگار قائم کر دی:

فِيْهِ اٰيَاتٌ م بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ اِبْرَاهِيْمَ. (۹۷:۳)

''اس گھر میں مقامِ ابراہیم ایک نمایاں یادگارِ مقدس ہے۔''

صفا و مروہ

صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنا حضرت ہاجرہ کی اس سراسیمگی کا منظر تازہ کرتا ہے جب وہ پانی کی جستجو اور بچے کی محبت میں پریشاں حال تھیں۔

چاہِ زمزم

چاہِ زمزم قدرت الٰہی کی ایک کرشمہ سازی کو یاد دلاتا ہے جس نے وادی غیر ذی زرع (بنجر اور خشک سرزمین) میں خدا کی رحمت کے دبے ہوئے چشمے کا منہ کھول دیا تھا۔

قربانی

قربانی حقیقتِ اسلامیہ کی جاں فروشی اور فدویّت کے سرِ روحانی کو محسوس و ممثل دکھاتی ہے، جس نے حضرت خلیل اور ذبیح علیہما السلام کے اندر سے ظہور کیا تھا۔

رمی جمار

رمی جمار، ان بہیمی و ابلیسی قوتوں سے دنیا کو روکتا ہے جو اس پاک مقصد کی تکمیل میں سنگِ راہ ہو رہے تھے۔

اعمال و احکام اور حدود و شروطِ حج

احرام اور حرمتِ شکار

حج اور عمرہ کے لیے احرام باندھنے کے بعد اس وقت تک شکار جائز نہیں جب تک حج یا عمرہ ادا ہو جائے اور احرام کھول دیا جائے:

غَیْرَ مُحِلِّی الصَّیْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ. (۵:۱)

''جب احرام کی حالت میں ہو شکار کرنا حلال نہ سمجھو۔''

یہ جو تمہیں احرام کی حالت میں شکار سے روکا گیا ہے، اسے ہلکی بات خیال نہ کرو، اس میں درحقیقت اتباع اور پیروی کی آزمائش ہے، اور جو شخص جان بوجھ کر شکار کرے گا تو اسے بدلہ یا کفارہ دینا پڑے گا:

يَـاَيُّهَـا الَّـذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوْا الصَّيْدَ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ، وَمَنْ قَتَلَهٗ مِـنْـكُـمْ مُّتَـعَـمِّـدًا فَـجَـزَآءٌ مِّثْلُ مَاقَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَاعَـدْلٍ مِّـنْـكُمْ هَدْيًا بَـالِـغَ الْـكَـعْبَةِ اَوْ كَـفَّـارَةٌ، طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ. (۵:۹۵)

''مسلمانو! جب تم احرام کی حالت میں ہوتو شکار کے جانور ہلاک نہ کرو اور جوکوئی تم میں سے جان بوجھ کر مار ڈالے تو چاہیے کہ اس کا بدلہ دے (اور بدلہ یہ ہے کہ) جیسے جانور کو مارا ہے اس کی مانند مویشیوں میں سے ایک جانور کعبہ پہنچا کر قربان کیا جائے جسے تم میں سے دو منصف ٹھہرائیں یا کفارہ دے (اور کفارہ یہ ہے کہ) مسکینوں کو (اس کی قیمت کے لحاظ سے) کھانا کھلائے یا پھر مسکینوں کی گنتی کے برابر روزے رکھے تا کہ اپنے کیے کی جزاء (کا مزہ) چکھ لے۔''

البتہ حالتِ احرام میں دریا اور سمندر کا شکار کھایا جا سکتا ہے۔ مثلاً وہ مچھلی جو پانی سے الگ ہو کر مر گئی ہے، احرام کی حالت میں بھی جائز وحلال ہے:

اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ. (۵:۹۶)

''سمندر اور دریا کا شکار یا کھانے کی چیزیں (جو بغیر شکار ہاتھ آ جائیں) حلال ہیں۔''

ممانعتِ جنگ

احرام کی حالت میں بیوی سے خلوت، گناہ کی بات اور لڑائی جھگڑے کی ممانعت ہے۔

فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ. (۲:۱۹۷)

''(حج کے مہینے عام طور پر معلوم ہیں) پس جس کسی نے ان مہینوں میں حج کرنا اپنے اوپر لازم کر لیا تو (وہ حج کی حالت میں ہو گیا اور) حج کی حالت میں نہ تو عورتوں کی طرف رغبت کرنی ہے اور نہ لڑائی جھگڑا۔''

لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْیَ وَلَا الْقَلَآئِدَ. (۵:۲)

''خدا کے شعائر (خدا پرستی کی مقررہ نشانیوں اور آداب و رسوم کی) بے حرمتی نہ کرو اور نہ ان مہینوں کی بے حرمتی کرو جو حرمت کے مہینے ہیں اور نہ حج کی قربانی کی، نہ ان جانوروں کی جن کی گردنوں میں (بطور علامت کے) پٹے ڈال دیتے ہیں اور کعبہ پر چڑھانے کے لیے دور دور سے لائے جاتے ہیں۔''

خدا پرستی کی مقدس نشانیاں جو مقرر کر دی گئی ہیں اور جو آداب و رسوم مقرر ہو چکے ہیں، ان کی بے حرمتی نہیں کرنی چاہیے، اور نہ ہی ان مہینوں کی بے حرمتی کرنی چاہیے جو حرمت کے مہینے کہلاتے ہیں۔ یعنی ذی قعدہ، ذی الحج، محرم اور رجب۔ ان چار مہینوں میں حاجیوں کی آمد و رفت رہتی ہے، اس بناء پر ان میں جنگ کی ممانعت ہے تا کہ حاجیوں کا جان و مال محفوظ رہے۔

اجازتِ جنگ

لیکن اگر دشمنوں کی طرف سے اقدامِ جنگ ہوگا تو پھر مسلمانوں کو بھی مدافعت کرنا ہوگی۔ جیسا کہ سورہ بقرہ میں ہے:

فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَااعْتَدٰی عَلَيْكُمْ. (۱۹۴:۲)

''پس جو کوئی تم پر زیادتی کرے تو چاہیے کہ جس طرح کا معاملہ اس نے تمہارے ساتھ کیا ہے، ویسا ہی معاملہ تم بھی اس کے ساتھ کرو۔''

اہل مکہ نے ظلم و تعدی سے حج کا دروازہ مسلمانوں پر بند کر دیا تھا اور اس طرح پر جو مقام مقدس ان کی ہدایت کا مرکز قرار پایا تھا، وہ ان کی دسترس سے باہر ہو گیا تھا اور جنگ کے بغیر کوئی چارہ کار نہ رہا، اس لیے حکم ہوا:

وَقَاتِلُوْافِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا، (۱۹۰:۲)

''اور دیکھو، جو لوگ تم سے جنگ کر رہے ہیں، چاہیے کہ اللہ کی راہ میں تم بھی

ان سے لڑو (پیٹھ نہ دکھاؤ) البتہ کسی قسم کی ان پر زیادتی نہیں کرنا چاہیے۔،،

البتہ نہ تو قربانی اور نیاز کے جانوروں کو لوٹنا چاہیے جو دور دور سے مکہ میں لائے جاتے ہیں نہ حاجیوں اور تاجروں کو نقصان پہنچانا چاہیے جو خدا کی عبادت کی خاطر یا کاروبارِ تجارت کی غرض سے قصد کرتے ہیں۔ کسی مقدس مقام کی طرف جانے والوں کو نقصان پہنچانا درحقیقت اس مقام کی توہین کے مترادف ہے:

وَلَآ آمِّيۡنَ الۡبَيۡتَ الۡحَرَامَ يَبۡتَغُوۡنَ فَضۡلاً مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَ رِضۡوَانًا. (۲:۵)

''نیز ان لوگوں کی بھی بے حرمتی نہ کرو (یعنی ان کی راہ میں رکاوٹ نہ ڈالو اور انہیں کسی طرح کا نقصان نہ پہنچاؤ) جو بیت الحرام یعنی کعبہ کا قصد کر کے آئے ہیں اور اپنے پروردگار کا فضل اور اس کی خوشنودی کے طالب ہیں۔،،

مسلمانوں کا عام دستور

مشرکین مکہ نے مسجد حرام سے مسلمانوں کو روکا تھا تو اب مسلمانوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ جوش انتقام میں تم بھی ایسا نہ کرو کہ جو لوگ حج و زیارت کے لیے جا رہے ہوں، انھیں روک لو یا ان پر حملہ کر دو:

وَلَا يَجۡرِمَنَّكُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ اَنۡ صَدُّوۡكُمۡ عَنِ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اَنۡ تَعۡتَدُوۡا. (۲:۵)

''اور دیکھو، ایسا نہ ہو کہ ایک گروہ کی دشمنی تمہیں اس بات پر ابھار دے کہ زیادتی کرنے لگو، کیونکہ انہوں نے مسجدِ حرام سے تمہیں روک دیا تھا۔،،

مسلمانوں کا دستور العمل یہ ہونا چاہیے کہ نیک کام میں تعاون اور برائی سے احتراز کریں۔ جو لوگ دوسروں پر ظلم و تعدی کریں تو یہ برائی ہے، اس میں شامل نہ ہوں۔ لیکن جو لوگ حج و زیارت کے لیے جا رہے ہیں تو وہ یقیناً بھلائی کی بات ہے، اس میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ کی جائے:

وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ. (۵:۲)

''پرہیز گاری کی بات میں ایک دوسرے کی مدد کرو، گناہ اور ظلم کی بات میں تعاون نہ کرو۔''

اس آیت میں جو قاعدہ بتایا گیا ہے وہ مسلمانوں کے تمام کاموں کے لیے ایک دستور العمل ہے۔ نیز اس سے معلوم ہو گیا کہ بت پرست بھی اگر خدا کی تعظیم وعبادت کی کوئی بات کریں تو اس کی بھی بے حرمتی نہیں کرنی چاہیے۔

کاروبارِ تجارت

حج ایک عبادت ہے، لیکن اس کا عبادت ہونا، دنیوی کاروبار سے فائدہ اٹھانے میں مانع نہیں۔ مال و دولت اللہ کا فضل ہے اور اس کی تلاش وجستجو حج کی بجا آوری میں رکاوٹ پیدا نہیں کرتی۔ البتہ ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ کاروبار دنیوی کا اس قدر انہاک ہو جائے کہ حج کے اوقات واعمال سے ہی لاپرواہ ہو جائے:

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ، أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلاً مِّنْ رَّبِّكُمْ. (۱۹۸:۲)

''(اور دیکھو) اس بات میں تمہارے لیے کوئی گناہ کی بات نہیں اگر (اعمال حج کے ساتھ) تم اپنے پروردگار کے فضل کی تلاش میں رہو (یعنی کاروبار تجارت کا بھی کوئی مشغلہ رکھو)۔''

دین و دنیا کے معاملہ میں لوگوں کی عالمگیر گمراہی یہی رہی ہے کہ یا تو افراط میں پڑ گئے یا تفریط میں اور راہِ اعتدال گم ہو کر رہ گئی۔ دنیا کا حد سے زیادہ انہاک بھی نہ ہو کہ آخرت سے یک قلم بے پرواہ ہو جاؤ اور نہ ہی آخرت کے استغراق میں اس قدر فنا ہو جاؤ کہ ترکِ دنیا اور رہبانیت کا دم بھرنے لگو۔

لیکن دین حق کی راہ انسان کے ہر عمل حیات کی طرح اعتدال اور توسط کی راہ ہے اور صحیح زندگی اسی کی زندگی ہے جو کہتا ہے:

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً. (۲۰۱:۲)

''پروردگار! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے!،،

ازالہ توہم پرستی

چاند کے طلوع اور اس کے گھٹنے اور بڑھنے سے مہینوں کا حساب رکھا جاتا ہے اور موسم حج کا تعین بھی اسی سے محسوب ہوتا ہے:

يَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَهِلَّةِ، قُلْ هِیَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ. (۲:۱۸۹)

''اے پیغمبر! لوگ تم سے (مہینوں کی) چاند راتوں کی نسبت دریافت کرتے ہیں۔ ان سے کہہ دو یہ انسان کے لیے وقت کا حساب ہے اور اس سے حج کے مہینہ کا تعین بھی ہوتا ہے۔،،

لوگوں میں بعض بے بنیاد توہم پرستیاں پھیلی ہوئی ہیں، ان میں سے بعض کواکب پرستی کی پیداوار ہیں اور بعض ستارہ پرستی اور نجوم کے عقاید کے برگ و بار اور اس کی بناء پر لوگوں نے طرح طرح کی رسمیں اختیار کر لی ہیں، جن کی کوئی اصلیت نہیں۔ جیسا کہ عربوں کی جاہلیت میں رسم تھی کہ جب حج کے مہینہ کا چاند دیکھ لیتے تو احرام باندھ لیتے اور گھروں میں نہ آتے۔ اگر گھروں میں آنے کی ضرورت ہوتی تو گھروں کے دروازوں سے نہ آتے، پچھواڑی پھاند کر داخل ہوتے:

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا. (۲:۱۸۹)

''یہ کوئی نیکی کی بات نہیں کہ تم اپنے گھروں میں (دروازہ چھوڑ کر) پچھواڑے سے داخل ہوؤ۔،،

مقدس زیارت گاہوں اور تیرتھوں پر جانے کے لیے لوگوں نے طرح طرح کی پابندیاں عائد کر لی ہیں۔ اجر وثواب حاصل کرنے کی غرض سے اپنے آپ کو تکلیفوں اور مشقتوں میں ڈالتے ہیں۔ لیکن یہ سب گمراہی کی باتیں ہیں۔ نیکی کی اصلی راہ یہی ہے کہ اپنے اندر تقویٰ کی روح پیدا کی جائے۔

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللّٰهَ

لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ. (۱۸۹:۲)

''نیکی تو دراصل اسی شخص کے لیے ہے جو اپنے اندر تقویٰ پیدا کرے، پس (ان وہم پرستیوں میں مبتلا نہ ہو) گھروں میں آؤ تو دروازہ ہی کی راہ آؤ، (پچھواڑی سے راہ نکالنے کی مصیبت میں کیوں پڑو) اور اللہ کی نافرمانی سے بچو، تاکہ فلاح پاؤ۔''

میدانِ عرفات کی شرط

اعمالِ حج میں سے ایک میدانِ عرفات میں جانا، مقیم ہونا اور پھر اتمامِ حج کے بعد وہاں سے لوٹ کر آنا، بلا امتیاز ضروری ہے۔ لیکن باشندگانِ مکہ معظّمہ نے یہ طریقہ اختیار کر رکھا تھا کہ حد حرام تک جا کر لوٹ آتے اور خیال کرتے کہ ہم تو اسی مقام کے باشندے ہیں، ہمارے لیے حدودِ حرم سے باہر جانا کوئی ضروری نہیں۔ اصل وجہ یہ تھی کہ ان میں باشندگان مکہ ہونے کا غرورِ باطل سمایا ہوا تھا اور اپنے آپ کو مقدس جانتے تھے۔ نیز دنیوی کاروبار کے انہماک کی وجہ سے اعمال حج میں مشغولیت شاق گزرتی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ حاجی لوگ حج میں مشغول رہیں اور وہ تجارت کا فائدہ اٹھائیں!

ثُمَّ اَفِیْضُوْا مِنْ حَیْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوْا اللّٰهَ.

(۱۹۹:۲)

''پھر (یہ بات بھی ضروری ہے کہ) جس جگہ (تک جا کر) دوسرے لوگ انبوہ در انبوہ لوٹتے ہیں، تم (اہل مکہ) بھی وہیں سے لوٹو اور اللہ سے اپنے گناہوں کی بخشش طلب کرو!''

یعنی ایسا نہ کرو جیسا کہ جاہلیت کے ایام میں کیا کرتے تھے کہ صرف حدودِ حرم تک جا کر لوٹ آیا کرتے تھے، باہر کے حاجیوں کی طرح عرفات تک نہ جایا کرتے تھے۔

مصالحِ قیامِ کعبہ

(۱) اللہ تعالیٰ نے خانہ کعبہ کو لوگوں کے لیے قیامِ امن اور اجتماع و گروہ آوری کا ذریعہ

بنایا ہے۔ خدا کے علم میں بے شمار حکمتیں اور مصلحتیں ہیں، جن کا حصول قیام کعبہ پر منحصر ہے۔ اس لیے دوران حج میں کعبہ اور اس کے شعائر کی حرمت قائم رکھی جائے اور اس کے اعمال صحیح طور پر قائم رکھے جائیں تا کہ حج کی بجا آوری میں کسی قسم کا فتور نہ آنے پائے:

جَعَلَ اللّٰہُ الْکَعْبَۃَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ قِیٰمًا لِّلنَّاسِ وَ الشَّھْرَ الْحَرَامَ وَالْھَدْیَ وَالْقَلَآئِدَ. (۵:۹۷)

''اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو حرمت کا گھر بنایا ہے لوگوں کے لیے (امن و جمعیت کے) قیام کا ذریعہ ٹھہرایا ہے۔ نیز حرمت کے مہینوں کو اور حج کی قربانی کو اور قربانی کے جانوروں کو بھی جن کی گردنوں میں (علامت کے لیے) پٹے ڈال دیے جاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ کعبہ کی اور کعبہ کے تمام رسوم و آداب کی حرمت قائم رکھنے کا حکم دیا گیا ہے:

ذٰلِکَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَ اَنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ. (۵:۹۷)

''یہ اس لیے کیا گیا، تا کہ تم جان لو، آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، اللہ سب کا حال جانتا ہے اور بے شک اللہ ہر بات کا علم رکھنے والا ہے۔،،

عالمگیر سچائی

(۲) معبدِ کعبہ کی تعمیر اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا ذکر قرآن میں اس غرض سے کیا گیا ہے کہ اقوامِ عالم کی ہدایت کے لیے پیروانِ دعوت قرآنی کو چن لیا گیا ہے۔ لہٰذا اس لیے ضروری تھا کہ پہلے دعوتِ قرآن کے ظہور کی معنوی تاریخ بیان کر دی جاتی۔ حضرت ابراہیمؑ نے دین کی جو راہ اختیار کی تھی، وہ صرف خدا پر ایمان لانے اور اس کے قانون سعادت کی فرمانبرداری کرنے کی فطری اور عالمگیر سچائی تھی۔ قرآن بھی یہی دعوت دیتا ہے۔ یہی دین الٰہی ہے اور اسی لیے دین الٰہی کو ''الاسلام،، سے تعبیر کیا گیا۔ جس کے معنی اطاعت و گردن نہادن کے ہیں۔ یعنی ہر طرح کی نسبتوں سے کنارہ کش ہو کر صرف

اطاعتِ حق اور خدائے واحد کی اطاعت کی دعوت دینا۔کون ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اِس طریقہ سے روگردانی اختیار کر کے مسلمان رہ سکتا ہے؟

نیک ترین امت اور مرکز ہدایت

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اقوامِ عالم کی امامت اور پیشوائیت کے لیے چن لیا گیا تھا۔ انہوں نے مکہ میں عبادت گاہ تعمیر کی اور امت مسلمہ کے ظہور کے لیے الہامی دعا مانگی۔مشیت الٰہی میں اس امت کے ظہور کا ایک خاص وقت معین تھا۔ جب وہ وقت آ گیا تو پیغمبرِ اسلام کا ظہور ہوا اور ان کی تعلیم وتزکیہ سے موعودہ امت پیدا ہوگئی۔

اس امت کو نیک ترین امت ہونے کا نصب العین عطا کیا گیا اور اقوامِ عالم کی تعلیم و ہدایت کی دائمی تفویض ان کے ہاتھ میں دے دی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی روحانی ہدایت کے ایک دائمی مرکز وسرچشمہ کی بھی اشد ضرورت تھی۔قدرتی طور پر ایسا مرکز سوائے کعبہ کے اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔اس لیے تحویل قبلہ نے اس کی مرکزیت کا اعلان کردیا:

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ. (۲:۱۴۴)

''چاہیے کہ تم اپنا رخ مسجد حرام (یعنی خانہ کعبہ) کی طرف پھیرلو۔''

قبلہ کے تقرر میں بھی یہی حقیقت پوشیدہ تھی۔ جب تک بنی اسرائیل کا دورِ ہدایت قائم رہا، مرکز ہدایت بیت المقدس تھا، عبادت کے وقت بھی اسی کی طرف رخ رہتا تھا، لیکن جب دعوت حق کا مرکز مکہ کا معبد قرار پا گیا تو ضروری ہوا کہ وہی قبلہ بھی قرار پا جائے اور اقوامِ عالم کے رخ بھی اسی طرف پھر جائیں:

وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ. (۲:۱۴۴)

''جہاں کہیں بھی تم اور تمہارے ساتھی ہوں، ضروری ہے کہ (نماز میں) اسی طرف کو پھر جایا کرو۔ (یعنی خانہ کعبہ کی طرف)۔''

بنیادی اغراض ومقاصدِ کعبہ

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عبادت گاہ مکہ کی بنیاد رکھی تھی۔تو ان کے پیش

نظر اس کے کیا کیا اغراض و مقاصد تھے اور پھر وحی الٰہی نے کس راستہ پر گامزن ہونے کی تلقین کی:

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرَاهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّ طَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ، (۲۶:۲۲)

''اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے ابراہیمؑ کے لیے خانہ کعبہ کی جگہ مقرر کردی (اور حکم دیا) کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کر اور میرا یہ گھر ان لوگوں کے لیے پاک رکھ جو طواف کرنے والے، عبادت میں سرگرم رہنے والے اور رکوع و سجود میں جھکنے والے ہوں۔''

پھر جب فرضیتِ حج کا اعلان عام کیا گیا تو اس کے بنیادی اعمال و مقاصد کیا کیا تھے اور پھر وحی الٰہی نے کس طرح ان کی راہنمائی فرمائی تھی:

وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّ عَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ. (۲۲:۲۷)

''اور (حکم دیا تھا کہ) کہ لوگوں میں حج کا اعلان پکار دے۔ لوگ تیرے پاس دنیا کی تمام دور دراز راہوں سے آیا کریں گے، پاپیادہ اور ہر طرح کی سواریوں پر، جو (مشقتِ سفر سے) تھکی ماندی ہوں گی۔''

خلاصہ مطلب

ان سب باتوں کا خلاصۂ مطلب یہ ہے:

(۱) توحید الٰہی کا عقیدہ لوگوں میں پیدا کیا جائے۔

(۲) عبادت گزارانِ حق کے لیے معبد کی تطہیر کی جائے۔

(۳) اجتماع حج کا اہتمام کیا جائے تا کہ اس کے گونا گوں منافع و فوائد سے لوگ مستفید و شاد کام ہوں اور مقررہ ایام میں ذکر الٰہی کا ولولہ بلند ہوتا رہے۔

(۴) جو لوگ اس موقع پر جمع ہوں وہ خدا کے نام پر جانوروں کی قربانیاں کریں اور

محتاجوں کے لیے غذا کا سروسامان بہم پہنچائیں۔

کعبۃ اللہ دنیا بھر کے مسلمانوں کی مشترکہ عبادت گاہ ہے

یہ عبادت گاہ صرف قریش مکہ کے لیے نہ بنائی گئی تھی اور نہ ہی ان کا یہ حق تھا کہ اس کے مالک بن بیٹھیں، جسے چاہیں آنے دیں، جسے چاہیں روک دیں۔ بلکہ بلا امتیاز یہ سب کے لیے ہی، خواہ وہ مکہ کے رہنے والے ہوں خواہ دوسرے ملکوں کے باشندے۔

یہ اسی بات کا نتیجہ ہے کہ لوگ دور دور سے آنے لگے، اپنے ساتھ قربانی کے جانور لانے لگے، خصوصاً قربانی کے اونٹ، جو صحرا، وجبال طے کر کے حرم کعبہ میں پہنچائے جاتے ہیں، اور لوگ انھیں اس معبد کی نشانیوں میں سے ایک بڑی نشانی متصور کرتے ہیں۔ اب اگر قریش مکہ کا یہ اختیار تسلیم کرلیا جاتا کہ جسے چاہیں آنے دیں اور جسے چاہیں روک دیں تو پھر نہ کعبہ، کعبہ رہا اور نہ حج، حج۔

حقیقتِ قربانی

قربانی کی حقیقت یہ ہے کہ اس کا گوشت خود بھی کھاؤ اور محتاجوں کو بھی کھلاؤ:

فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوْا الْقَانِعَ الْمُعْتَرَّ. (۳۶:۲۲)

''ان کے گوشت میں سے خود بھی کھاؤ اور فقیروں اور زائروں کو بھی کھلاؤ۔''

قربانی سے مقصود جانور ذبح کر کے خون بہانا نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں۔ حقیقت میں اس کا مقصد لوگوں کے لیے سامان غذا مہیا کرنا ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن میں اس بات کو صاف صاف بیان فرمادیا گیا ہے:

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ.

(۳۷:۲۲)

''یادرکھو، اللہ تک ان قربانیوں کا نہ تو گوشت پہنچتا ہے نہ خون۔ اس کے حضور جو کچھ پہنچ سکتا ہے وہ صرف تمہارا تقویٰ ہے۔''

یعنی محض تمہارے دل کی نیکی ہے جو مقبولِ بارگاہ الٰہی ہے۔ اور یہ جو بت پرست

اقوام میں قربانی کی رسم اس طرح چلی آتی ہے کہ خیال کیا جاتا ہے کہ انسانوں کی طرح دیوتاؤں کو بھی چڑھاووں کی ضرورت ہے اور جانوروں کا خون بہانا ان کے غضب وقہر کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ نہ تو چڑھاوا ہی خدا تک پہنچ سکتا ہے اور نہ ہی وہ خون بہانے کا شائق ہے، وہ تو طہارتِ قلبی کو پسند فرماتا ہے۔ فقط

حواشی

۱ سب سے پہلی مرتبہ یہ مقالہ ۲۴ جون ۱۹۲۷ء کو شائع ہوا۔

۲ ۱۲ اکتوبر ۱۹۱۴ء کو سب سے پہلی مرتبہ یہ تحریر شائع ہوئی۔ اس سے مراد کیم ذی الحج ۱۳۳۲ھ ہے۔

ہماری دیگر کتب

ام الکتاب	مولانا ابوالکلام آزاد	150روپے
غبار خاطر	مولانا ابوالکلام آزاد	200روپے
تذکرہ	مولانا ابوالکلام آزاد	200روپے
خطبات آزاد	مولانا ابوالکلام آزاد	200روپے
آزادی ہند	مولانا ابوالکلام آزاد	250روپے
قرآن کا قانون عروج وزوال	مولانا ابوالکلام آزاد	90روپے
قول فیصل	مولانا ابوالکلام آزاد	90روپے
مسلمان عورت	مولانا ابوالکلام آزاد	90روپے
مسئلہ خلافت	مولانا ابوالکلام آزاد	100روپے
حقیقت الصلواۃ	مولانا ابوالکلام آزاد	60روپے
آخری لمحات	مولانا ابوالکلام آزاد	60روپے
صدائے حق	مولانا ابوالکلام آزاد	60روپے
افسانہ ہجر ووصال	مولانا ابوالکلام آزاد	زیر طبع
مقام دعوت	مولانا ابوالکلام آزاد	زیر طبع